فہرست الفاظ

مولانا محمد عبدالرشید نعمانی

دارالاشاعت
اردو بازار ایم اے جناح روڈ کراچی پاکستان فون: 32631861

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ

مکمل

لغات القرآن

مع فہرستِ الفاظ

جلد سوئم ۔ د تا ش

تالیف
مولانا محمد عبدالرشید نعمانی

دارالاشاعت
اردو بازار ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی
طباعت : اپریل ۲۰۰۷ء علمی گرافکس

قارئین سے گزارش

اپنی حتی الوسع کوشش کی جاتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس بات کی نگرانی کے لئے ادارہ میں مستقل ایک عالم موجود رہتے ہیں۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو ازراہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم مقابل اشرف المدارس گلشن اقبال بلاک ۲ کراچی
بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد
مکتبۃ المعارف محلہ جنگی۔ پشاور
ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انار کلی لاہور
بیت العلوم 20 نابھ روڈ لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
مکتبہ اسلامیہ گامی اڈا۔ ایبٹ آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

انگلینڈ میں ملنے کے پتے

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

امریکہ میں ملنے کے پتے

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

فہرست

باب الدال المہملۃ

فصل الالف

دَأْب: حال، عادت، رسم، دستور، اس عادتِ مستمرہ کا نام کہ جو ہمیشہ ایک حالت پر رہے دأب ہے یہ اصل میں دأب یدأب کا مصدر ہے جس کے معنی لگاتار کسی کام میں لگنے اور مشقت برداشت کرنے کے ہیں اور اسی سبب سے اس کا استعمال عادت اور طریقہ کے معنی میں ہوتا ہے۔ ۳/۱۱ ۸/۵۲ ۴۰/۳۱

دَأَبًا: یہ بھی دَأَبَ یَدْأَبُ کا مصدر ہے اور اس کے بھی وہی معنی ہیں ۱۲/۴۷

دَابِر: جڑ، بیخ، بنیاد، پچھاڑی، پیچھا دُبُوْرٌ سے جس کے معنی پشت پھیرنے کے ہیں، اسمِ فاعل کا صیغہ واحد مذکر، ہر ایک چیز کے آخر اور تابع کے معنی میں مستعمل ہے، راغب نے لکھا ہے کہ متأخر اور تابع کو "دابر" کہا جاتا ہے خواہ باعتبار مکان ہو یا باعتبار زمان یا باعتبار مرتبہ ۶/۴۵ ۷/۷۲ ۸/۷ ۱۵/۶۶ ۱۴/۵

دَآبَّۃٍ: جانور، چلنے والا، پاؤں دھرنے والا، رینگنے والا دابّ اور دوابّ سے جس کے معنی رینگنے اور پاؤں چلنے کے ہیں، اسمِ فاعل کا صیغہ مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے مستعمل ہے، اس میں تا وحدت کی ہے دوابّ جمع، اگرچہ عرف میں یہ لفظ گھوڑے کے لئے مخصوص ہے مگر سب جانوروں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور قرآنِ مجید میں جو "دابّۃ" کا لفظ آیا ہے تو اس میں ہر ایک حیوان داخل ہے آیۃ شریفہ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ (اور جس وقت ان پر بات آن پڑیگی تو ہم ان کیلئے زمین سے ایک جانور نکالیں گے، وہ ان سے باتیں کریگا کیونکہ لوگ ہماری نشانیوں پر یقین نہیں کرتے تھے) میں "دابّۃ" سے ایک خاص جانور مراد ہے، قیامت سے پہلے کوہِ صفا جو مکہ میں واقع ہے دفعتاً شق ہوگا اور اس سے ایک جانور نکلیگا جو لوگوں سے باتیں کرے گا کہ اب قیامت نزدیک ہے اور نشان لگاکر سچے ایماندار ول

اور چھپے منکروں کو ایک دوسرے سے ممتاز کردے گا یہ مضمون احادیث صحیحہ میں وارد ہے پ ۲/۴ پ ۷/۱۰ پ ۱۲/۱و۵ پ ۱۴/۱۲ پ ۱۸/۱۲ پ ۲۰/۲ پ ۲۱/۲و۱۰ پ ۲۲/۹و۱۷ پ ۲۵/۴و۱۰۔

دَاحِضَةٌ : باطل کرنے والی، ڈگمگانے والی، دَحْضٌ سے جس کے معنی پھسلنے، ٹھوکر کھانے اور ڈگمگانے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، پ ۲۵/۴۔

دَاخِرُوْنَ : ذلیل ہونیوالے، عاجزی کرنیوالے دُخُوْرٌ سے جس کے معنی ذلیل و خوار ہونے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ رفع دَاخِرٌ واحد پ ۱۴/۱۲ پ ۲۴/۵۔

دَاخِرِیْنَ : ذلیل خوار، دَاخِرٌ کی جمع بحالتِ نصب و جر، پ ۲۰/۱۱ پ ۲۴/۴۔

دَاخِلُوْنَ : داخل ہونے والے، دُخُوْلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت رفع دَاخِلٌ واحد (ملاحظہ ہو دُخُوْلٌ) پ ۶/۸۔

دَاخِلِیْنَ : داخل ہونیوالے، دُخُوْلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب و جر، پ ۲۵/۲۰۔

دَارٌ : گھر، دیار جمع، یہ لفظ مؤنث ہے اور کبھی مذکر ہو کر بھی استعمال ہوتا ہے گھر، شہر، دنیا، سب کے لئے دار کا استعمال ہوتا ہے پ ۱/۱۱ پ ۷/۱۰ پ ۸/۲و۳ پ ۹/۷و۱۱ پ ۱۱/۸ پ ۱۳/۶و۹و۱۲و۱۷ پ ۱۴/۱۰ پ ۲۰/۷و۱۱و۱۳ پ ۲۱/۳و۲۰ پ ۲۳/۱۶ پ ۲۳/۱۳ پ ۲۴/۵ پ ۲۵/۱و۱۱و۱۸ (؟) پ ۲۵/۴۔

دَارِكُمْ : تمہارا گھر، دَارِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، پ ۱۲/۶۔

دَارِهٖ : اس کا گھر، دَارِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ پ ۲۰/۱۱۔

دَارِهِمْ : ان کا گھر، دَارِ مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ پ ۸/۱۲ پ ۹/۱ پ ۱۳/۳ پ ۲۶/۱۶۔

دَاعِ : بلانے والا، پکارنے والا، دعا کرنے والا، دُعَاءٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر بحالتِ رفع و جر، (ملاحظہ ہو دُعَاءٌ) پ ۲/۷ پ ۲۷/۸۔

دَاعِيَ : بلانیوالا، پکارنے والا، دُعَاءٌ سے، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر بحالتِ نصب پ ۱۶/۱۵ پ ۲۶/۴۔

دَاعِيًا ، پ ۲۲/۳۔

دَافِعٍ : دفع کرنیوالا، ٹالنے والا، ہٹانے والا، دَفْعٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو دَفْعٌ) پ ۲۷/۲ پ ۲۹/۷۔

دَافِقٍ : اچھلنے والا، دَفْقٌ سے جس کے معنی اچھل کر بہنے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۳۰/۱۱۔

دَامَتْ : وہ ٹھہری رہی (نَصَرَ، ضَرَبَ) دَوَامٌ سے جس کے معنی ٹھہرے رہنے اور ایک حالت پر برقرار رہنے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب یا دامت

(جب تک رہے) افعالِ ناقصہ میں سے ہے، ۱۲/۹۔

دَامُوْا: وہ ٹھہرے رہے دَوَامٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب مَادَامُوْا (جب تک وہ رہیں) افعالِ ناقصہ میں سے ہے، ۵/۷۔

دَانٍ: جھکنے والا، نزدیک، دُنُوٌّ سے جس کے معنی قریب ہونے کے ہیں خواہ قربِ ذاتی ہو یا قربِ حکمی، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، ۲۷/۱۲۔

دَانِیَۃٌ: نزدیک، جھکنے والی، لٹکنے والی، دُنُوٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث ۸/۷، ۲۹/۱۹، ۵۔

دَاوٗد: داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام مشہور اور جلیل القدر رسول ہیں جن پر زبور نازل ہوئی تھی، داؤد عجمی نام ہے اور علمیت و عجمہ کی بنا پر غیر منصرف ہے آپ ذریتِ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہیں اور آپ کا شمار انبیاءِ بنی اسرائیل میں ہے حق تعالیٰ نے آپ کو دونوں نعمتوں سے سرفراز فرمایا تھا کہ نبی و رسول بھی تھے اور بادشاہ صاحبِ تاج و سریر بھی اسی لئے قرآنِ مجید میں آپ کو خلیفہ کہا گیا ہے اور یہ وہ لقب ہے کہ تمام انبیاء و مرسلین میں بجز آپ کے اور حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اور کسی کو قرآن نے اس لقب سے یاد نہیں کیا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا داؤد علیہ السلام پر قراءت اس قدر آسان کر دی گئی تھی کہ آپ اپنی سواریوں کو زین کسنے کا حکم دیتے اور سواریوں کے کَسے جانے سے پہلے پڑھ کر فارغ ہو چکتے تھے اور اپنے ہاتھ کے کسب سے کھاتے تھے[۱] قراءت سے مراد اس حدیث میں زبور کی تلاوت ہے، اتنی جلدی زبور کا تمام کرنا حضرت داؤد علیہ السلام کا معجزہ تھا اور باوجودیکہ بادشاہ تھے مگر اپنے کسب و محنت سے کھاتے تھے نیز صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہایت پیارا روزہ اللہ کے نزدیک داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن نہ رکھتے تھے اور نہایت پیاری نماز اللہ کے نزدیک حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز ہے کہ آدھی رات تک تو وہ سوتے تھے اور تہائی رات تہجد کی نماز پڑھتے تھے اور جب چھٹا حصہ رات کا باقی رہتا تھا تو پھر سو رہتے تھے[۲] اور صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوموسیٰ تجھ کو داؤد علیہ السلام کی

---

[۱] صحیح البخاری کتاب الانبیاء، باب قول اللہ و اٰتینا داؤد زبورًا۔ [۲] صحیح بخاری کتاب الانبیاء، باب احب الصلوٰۃ الی اللہ صلوٰۃ داؤد۔

بانسریوں میں سے ایک بانسری دی گئی ہے[1] حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نہایت خوش آواز تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات سفر میں ان کو قرآن پڑھتے سنا، دوسرے روز یہ حدیث بیان فرمائی یعنی تیری آواز ایسی دلکش ہے گویا تیرا گلا بانسری ہے اور تیری آواز میں لحنِ داؤدی کا اثر ہے۔

واضح رہے کہ توراۃ اور اسرائیلی روایات میں حضرت داؤد علیہ السلام اور اوریا کی بیوی کا جو افسانہ مذکور ہے اور جس کو غلطی سے بعض غیر محتاط مفسرین نے بھی سورۂ ص کی تفسیر میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر میں نقل کر ڈالا ہے محض کذب وافتراء ہے علامہ داؤدی نے صاف طور پر تصریح کی ہے:-

لیس فی قصۃ داؤد و اوریا خبر یثبت[2] داؤد اور اوریا کے قصہ میں کوئی روایت ثابت نہیں۔

اور قاضی عیاض فرماتے ہیں:-

اما قصۃ داؤد علیہ السلام فلا یجب ان یلتفت الی ما سطرہ الاخباریون عن اھل الکتاب الذین بدلوا وغیروا و نقلہ بعض المفسرین ولم ینص اللہ علیٰ شیئ من ذٰلک ولا ورد فی حدیث صحیح[3]

لیکن داؤد علیہ السلام کا قصہ سو ضروری نہیں کہ جو کچھ اخباریوں نے اہلِ کتاب سے جنہوں نے تبدیل اور تحریف کر ڈالی ہے نحریر کیا ہے اور بعض مفسرین نے اس کو نقل کر ڈالا ہے، اس کی طرف التفات کیا جائے حالانکہ نہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں کچھ بتایا ہے اور نہ حدیثِ صحیح میں کچھ آیا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی پیغمبرانہ سیرت اور فضائل و خصائص کا مفصل تذکرہ قرآنِ مجید میں جا بجا اپنے موقع پر تفصیل سے مذکور ہے۔

ب۲/۱۷ ب۶/۱۵، ۱۳ ب۷/۱۶ ب۱۵/۹ ب۱۷/۶ ب۱۹/۱۷ ب۲۲/۸ ب۲۳/۱۱، ۱۲۔

دَآئِبَيْنِ: پھرنے والے ایک دستور پر چلنے والے دَأَبَ اور دَاْبٌ سے اسمِ فاعل کا صیغہ تثنیہ مذکر، (ملاحظہ ہو دَأْبٌ) ب۱۳/۱۷۔

دَآئِرَةٌ: گردش، مصیبت، دَوْرٌ سے جس کے معنی پھرنے کے ہیں اسمِ فاعل کا صیغہ واحد مؤنث۔ "دائرہ" خطِ محیط کو کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے اس کا استعمال گردش، مصیبت اور چکر کے متعلق ہوتا ہے، ب۶/۱۲ ب۱۱/۱ ب۲۶/۹۔

دَآئِمٌ: ہمیشہ، جاوید، دَوَامٌ سے اسمِ فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو دَامَتْ) ب۱۳/۱۱۔

دَآئِمُوْنَ: قائم، ہمیشہ رہنے والے، دَائِمٌ کی جمع

[1] مشکوۃ باب جامع المناقب۔ [2،3] الشفاء فی تعریف حقوق المصطفٰی، ص ۲۸۸ (طبع صدیقی بریلی ۱۲۸۶ھ)

دَائم سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر سالم، ۲۹/۲۔

فصل الباء الموحدۃ

دُبُرٌ: پشت، پیٹھ، پیچھا، پاخانہ کا مقام اَدْبَارٌ جمع، ۱۲/۱۳، ۲۷/۲۷۔

دُبُرَہٗ: اس کی پیٹھ، اس کی پشت، دُبُرٌ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۸/۱۶۔

فصل الحاء المہملۃ

دُحُوْرًا: بھگانا، ہانکنا، دھتکارنا، دور کرنا دَحَرَ یَدْحَرُ کا مصدر ہے، ۳۷/۵۔

دَحٰھَا: اس کو ہموار کیا، اس کو بچھایا (نَصَرَ) دَحٰی دَحْوٌ سے جس کے معنی بچھانے اور ہموار کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ھا ضمیر واحد مؤنث غائب، ۳۰/۷۹۔

فصل الخاء المعجمۃ

دُخَانٌ: دھواں، اَدْخِنَۃٌ جمع، آیہ شریفہ فَارْتَقِبْ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ (سو تو راہ دیکھ اس دن کی کہ آسمان کھلم کھلا دھواں لائیگا) میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ دھواں عہد نبوی میں ظاہر ہوچکا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ سے مروی ہے کہ ابھی وہ دھواں ظاہر نہیں ہوا بلکہ قیامت کے قریب ظاہر ہوگا[۱] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے قول اول کو اختیار فرمایا ہے چنانچہ فتح الرحمٰن میں رقمطراز ہیں:

"مترجم گوید ایں وعدہ متحقق شد خدائے تعالیٰ در قریش قحط انداخت تا آنکہ شدت جوع یا از کثرت دخرہ بود دود محسوس شد ایشاں بخدائے تعالیٰ رجوع کردند خدائے تعالیٰ قحط را دور فرمود باز بکفر اصرار کردند خدا انتقام کشید کہ ہفتاد کس را از زبدائے ایشاں کشت وہفتاد کس را اسیر ساخت واللہ اعلم[۲]

اوران کے صاحبزادے شاہ عبد القادر صاحب نے دوسرے قول کو لیا ہے چنانچہ موضح القرآن میں فرماتے ہیں:

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دھوئیں کا مذکور ہے کہ اس وقت سمجھنا کام نہیں آتا، قیامت میں دھواں گھیر لیگا، نیک آدمی کو زکام سا ہوگا اور بد کو سر میں چڑھے گا، بیہوش ہوکر گر پڑے گا۔" ۲۴/۱۶، ۲۵/۱۴۔

دَخَلَ: وہ اندر آیا، وہ داخل ہوا دُخُوْلٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اُدْخُلْ) ۳/۱۲، ۳/۱۵۔

---

[۱] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۸ ص ۴۴ تفسیر حٰم الدخان۔

[۲] فتح الرحمٰن، ص ۲۵۹ (طبع فاروقی دہلی)

پ ۱۵/۱۷ پ ۲۰/۵ پ ۲۹/۱۰ ۔

دَخَلًا : بہانہ، دغا، فساد، دراندازی، دَخَلَ یَدْخَلُ کا مصدر ہے، اصل میں اس ملاوٹ کو جو فساد کے لئے ہو دَخَلْ کہتے ہیں اسی لئے قتادہ نے اس کی تفسیر خیانت سے کی ہے جیسا کہ ابن ابی حاتم نے ان سے روایت کیا ہے[۱] اور امام بخاری فرماتے ہیں کل شیٔ لم یصح فھو داخل[۲] (جو چیز درست نہ ہو وہ داخل ہے) پ ۱۴/۱۹ ۔

دَخَلَتْ : وہ داخل ہوئی، دُخُوْلٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ ۳/۱۱ ۔

دَخَلْتَ : تو داخل ہوا، دُخُوْلٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، پ ۱۵/۱۷ ۔

دُخِلَتْ : وہ داخل کی گئی، وہ آگھسی، دُخُوْلٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب پ ۲۱/۱۸ ۔

دَخَلْتُمْ : تم داخل ہوئے، تم نے صحبت کی، دُخُوْلٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، دُخُوْلٌ کبھی جماع کا کنایہ بھی ہوتا ہے۔ پ ۴/۵ پ ۱۴/۱۴ ۔

دَخَلْتُمُوْهُ : تم اس میں گھس پڑے تم اس میں داخل ہو گئے، اس میں واو اشباع کا ہے اور ہ ضمیر واحد مذکر غائب ہے۔ پ ۶/۸ ۔

دَخَلُوْا : وہ داخل ہوئے، وہ چلے آئے دُخُوْلٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ پ ۶/۱۲ پ ۱۳/۱ پ ۱۳/۲ پ ۱۳/۳ پ ۱۳/۴ پ ۱۴/۵ پ ۱۹/۱۸ پ ۲۳/۱۱ پ ۲۶/۱۹ ۔

دَخَلُوْهُ : وہ اس میں داخل ہوئے وہ اس میں گھسے، اس میں ہ ضمیر واحد مذکر غائب ہے۔ پ ۱۵/۱ ۔

دَخَلَهٗ : وہ اس میں داخل ہوا، وہ اس کے اندر آیا، دَخَلَ دُخُوْلٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ ۴ ۔

فصل الراء المهملة

دِرَاسَتِهِمْ : ان کا پڑھنا پڑھانا، ان کی تلاوت دِرَاسَۃٌ دَرَسَ یَدْرُسُ کا مصدر ہے جس کے معنی پڑھنے پڑھانے کے ہیں مضاف ہے ھِمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، پ ۸ ۔

دَرَاهِمَ : پاولیاں، دِرْهَمٌ کی جمع، شاہ عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں درہم قریب ہے پاولی کے، پ ۱۲/۱۲ ۔

دَرَجٰتٌ : درجے، دَرَجَۃٌ کی جمع، پ ۳ پ ۴ پ ۵ پ ۷/۱۶ پ ۸/۳ پ ۱۰/۱۵ پ ۱۳/۳ پ ۱۵/۲ پ ۱۶/۱۲ پ ۱۸/۱۲ پ ۲۴/۷ پ ۲۵/۲ پ ۲۶/۲ پ ۲۸/۲ ۔

دَرَجَۃٌ : درجہ، مرتبہ، بلندی کے اعتبار سے جو مرتبہ ہوتا ہے اس کو درجہ بولتے ہیں پ ۲/۱۲ پ ۵/۲ پ ۱۰/۶ پ ۲۷/۱۷ ۔

دَرَسْتَ : تو نے پڑھا، دَرْسٌ اور دِرَاسَۃٌ

[۱] فتح الباری، ج ۸، ص ۲۹۲ [۲] صحیح بخاری تفسیر سورۂ نحل

سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، پ ۱۹/۶۔

دَرَسُوْا: انہوں نے پڑھا، دَرْسٌ اور دِرَاسَۃٌ سے، ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۹/۱۱۔

دَرْكِ: طبقہ، درجہ، اصل میں "درک" مثل درجہ کے ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اونچے طبقہ کے لئے دَرَجَۃٌ اور نیچے طبقہ کے لئے دَرْكٌ بولا جاتا ہے نیز سمندر کے انتہائی قعر کو بھی دَرْكٌ کہتے ہیں دَرَکَات جمع، پ ۵/۱۸۔

دَرَكًا: پالینا، پکڑنا، دَرَكٌ کا استعمال دو معنی میں ہوتا ہے ایک تو اس رسّی کیلئے جس کے ساتھ دوسری رسی اس غرض سے ملادی جاتی ہے کہ وہ پانی تک پہنچ جائے، دوسرے نسان کو جو کچھ خرابی کا نتیجہ پہنچے اس کو دَرَكٌ کہتے ہیں، یہاں دوسرے معنی مراد ہیں، پ ۱۶/۱۴۔

دُرِّيٌّ: درخشندہ، چمکتا ہوا، اس میں ی نسبت کی ہے دُرٌّ کی طرف منسوب ہے جس کے معنی موتی کے ہیں یعنی موتی کی طرح چمکدار، پ ۱۸/۱۱۔

فصل السین المہملۃ

دُسُرٍ: کیلیں، میخیں، دِسَارٌ کی جمع، پ ۲۷/۸۔

دَسّٰهَا: اس کو خاک میں ملایا، اس کو گاڑ دیا۔ دَسّٰى تَدْسِيَۃً سے جس کے معنی چھپانے اور گمنام کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ھا ضمیر واحد مؤنث غائب، پ ۳۰/۱۶۔

فصل العین المہملۃ

دَعْ: تو چھوڑ دے، وَدْعٌ سے جس کے معنی چھوڑنے کے ہیں امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، پ ۲۲/۲۔

دَعًّا: دھکیلنا، دھکے دینا، دَعَّ يَدُعُّ کا مصدر ہے، پ ۲۷/۳۔

دُعَآءِ: پکار، دعا، بلانا، پکارنا، مانگنا، سوال کرنا دَعَا يَدْعُوْا کا مصدر ہے دعا اور ندا ہم معنی ہیں مگر ندا کبھی بغیر نام لئے بھی یا اور ایا کے ساتھ ہوتی ہے اور دعا میں نام لیا جاتا ہے جیسے یا فلاں اور کبھی دعا کا استعمال ندا کی جگہ اور ندا کا استعمال دعا کی جگہ بھی ہوتا ہے ارشاد ہے كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً (جیسے مثال ایک شخص کی کہ چلاتا ہے ایک چیز کو جو سنتی نہیں مگر پکارنا اور چلانا) اور کبھی دعا کا استعمال تسمیہ یعنی نام رکھنے اور نام لینے کے معنی میں بھی ہوتا ہے جیسے لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (مت ٹھہراؤ رسول کا نام لینا آپس میں جس طرح کہ ایک دوسرے کا نام لیتے ہو) لوگ یا محمد یا محمد کہتے تھے، اس آیت میں آپ کی تعظیم

کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اَدْعِيَة جمع، ٥/٧ ٣/١٢ ١٣/١٨ ١٧/٤ ١٥/٥ ٢٠/٣ ٢١/٨ ٢٣/٤ ٢٥/٣ ۔

دَعَا : اس نے پکارا، اس نے دعا کی، اس نے مانگا، اس نے بلایا، دُعَآءٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ٣/١٨ ١٣/١٥ ١٩/١٤ ١٥/١٤ ٢٧/٨ ۔

دَعَاكُمْ : اس نے تم کو پکارا، اس نے تم کو بلایا۔ اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے، ٩/١٤ ٢١/٦ ۔

دَعَانِ : اس نے مجھ کو پکارا، اس نے مجھ سے دعا کی، اس میں نونِ وقایہ ہے اور ی ضمیر واحد متکلم محذوف ہے، ٢/٧ ۔

دَعَانَا : اس نے ہم کو پکارا، اس نے ہم سے دعا کی، اس میں نا ضمیر جمع متکلم ہے، ١١/٧ ٢٣/٢ ۔

دَعَاهُ : اس نے اس کو پکارا، اس نے اس سے دعا کی، اس میں ہ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، ٢٠/١ ۔

دُعَآءَكَ : تجھ سے دعا کرنا، تجھ کو پکارنا، تیری دعا، تیری پکار، دُعَآءِ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، ١٦/١٤ ۔

دُعَآؤُكُمْ، دُعَآءَكُمْ : تمہاری التجاء، تمہاری پکار، تمہارا پکارنا، دُعَآءُ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، ١٩/١٤ ٢٢/١٤ ۔

دُعَآءَهُ : اس کا دعا کرنا، اس کا مانگنا، دُعَآءِ مضاف ہ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ١٥/٢ ۔

دُعَآءَهُمْ : ان کا دعا کرنا، ان کی پکار، دُعَآءِ مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ٢٦/١ ۔

دُعَآءِيْ : میری پکار، میرا بلانا، دُعَآءِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم، مضاف الیہ، ٢٩/٩ ۔

دَعَوْا : انہوں نے پکارا، انہوں نے دعویٰ کیا، دُعَآءٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، دَعَوْا اصل میں دَعَوُوْا تھا، واؤ متحرک ماقبل اس کا مفتوح اس لئے واؤ کو الف سے بدلا، اب الف اور واؤ دو ساکن جمع ہوئے اس لئے الف حذف ہو گیا اور دَعَوْا رہ گیا، ١٥/١٩ ١٦/٩ ١٨/١٧ ٢٠/١٠ ٢١/٧ ۔

دَعَوَا : ان دونوں نے پکارا، ان دونوں نے دعا کی، دُعَآءٌ سے ماضی کا صیغہ تثنیہ مذکر غائب، ٩/١٤ ۔

دَعَوْا : انہوں نے پکارا، انہوں نے دعا کی، دُعَآءٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ١١/٨ ٢١/١٣ و ٣ ۔

دُعُوْا : انہیں بلایا گیا، انہیں پکارا گیا، وہ بلائے گئے، وہ پکارے گئے، دُعَآءٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب، ٣/١٢ ١٨/١٣ و ١٢ ۔

دَعَوْتُ : میں نے بلایا، میں نے دعوت دی، دُعَآءٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم، ٢٩/٩ ۔

دَعْوَتَكَ : تیری پکار یا بلاوا، تیرا پکارنا، دَعْوَةً مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ (ملاحظہ ہو دَعْوَةٌ) ٣/٩

دَعَوْتُکُمْ: میں نے تم کو بلایا، میں نے تم کو پکارا، دَعَوْتُ صیغہ ماضی، اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے، ۱۴/۳۱ ـ

دَعْوَتُکُمَا: تم دونوں کی دعا، دَعْوَۃٌ مضاف کُمَا ضمیر تثنیہ مذکر حاضر مضاف الیہ، ۱۱/۱۴ ـ

دَعَوْتُمُوْھُمْ: تم نے ان کو پکارا، تم نے ان کو دعوت دی دَعَوْتُمْ، دُعَاءٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، واؤ اشباع کا اور ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۹/۱۴ ـ

دَعَوْتُھُمْ: میں نے ان کو بلایا، میں نے ان کو پکارا، دَعَوْتُ صیغہ ماضی ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، ۲۹/۹ ـ

دَعْوَۃٌ: دعا، پکار، پکارنا، بلاوا، دَعَا یَدْعُوْ کا مصدر ہے جس طرح قَعْدَۃٌ جَلْسَۃٌ بیٹھک کے لئے آتے ہیں اسی طرح یہ بھی اصل میں حالتِ دعا کو بتاتا ہے ۲/۱۲ ۸/۱۳ ۲/۶ ۱/۲۴ ـ

دَعَوْھُمْ: انہوں نے ان کو بلایا، انہوں نے ان کو پکارا، دَعَوْا دُعَاءٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب۔

دَعْوٰھُمْ: ان کی دعا، ان کا پکارنا، دَعْوٰی دَعَا یَدْعُوْ کا مصدر اور مضاف ہے ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۸/۲ ۱/۶ ۲/۸ ـ

دُعِیَ: وہ پکارا گیا، دُعَاءٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب، ۲۴/۸ ـ

دُعِیْتُمْ: تم بلائے گئے، تم پکارے گئے دُعَاءٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۲۱/۵ ـ

فصل الفاء

دِفْءٌ: جاڑے کی پوشاک، گرمی کا اسباب، لحاف اور دُلائی، اَدْفَاءٌ جمع ۵/۱۴ ـ

دَفْعٌ: دور کرنا، دفع کرنا، ہٹانا دَفَعَ یَدْفَعُ کا مصدر ہے جب اس کا تعدیہ بذریعہ اِلٰی ہوتا ہے تو اس کے معنی دینے اور حوالہ کرنے کے آتے ہیں جیسے فَادْفَعُوْٓا اِلَیْھِمْ اَمْوَالَھُمْ (پس ان کو ان کے مال حوالہ کرو) اور جب عَنْ کے ذریعہ ہوتا ہے تو اس کے معنی دفع کرنے، ہٹانے اور حمایت کرنے کے آتے ہیں جیسے وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ (اور اگر دفع نہ کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو ایک سے) ۲/۱۷ ۱۷/۱۳ ـ

دَفَعْتُمْ: تم نے حوالہ کیا، تم نے دے دیا، دَفْعٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، یہاں اس کا تعدیہ اِلٰی کے ذریعہ ہوا ہے، ۴/۱۲ ـ

فصل الکاف

دَکًّا: ریزہ ریزہ کرنا، ڈھا کر برابر کرنا، کوٹ کر ہموار کرنا

دَکَّ یَدُکُّ کا مصدر ہے اصل میں دَکٌّ نرم اور ہموار زمین کو کہتے ہیں اور چونکہ نرم اور ہموار زمین ریزہ ریزہ ہوتی ہے اس لئے اسی مناسبت سے اس کے مصدر کے معنی مقرر ہوئے، ۳۰/۱۴ ۔

دَکَّآءَ: ہموار، برابر دَکَّاوَاتٌ جمع، ۱۶/۲ ۔

دُکَّتْ: وہ توڑ دی گئی، وہ ریزہ ریزہ کی گئی دَکٌّ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۳۰/۱۱ ۔

دُکَّتَا: وہ دونوں توڑی گئیں، وہ دونوں ریزہ ریزہ کی گئیں دَکٌّ سے ماضی مجہول کا صیغہ تثنیہ مؤنث غائب ۲۹/۵ ۔

دَکًّا: توڑنا، ریزہ ریزہ کرنا، ڈھا کر ہموار کرنا، دَکَّ یَدُکُّ کا مصدر ہے، ۲۹/۵ ۔

فصل اللام

دُلُوْكِ: سورج کا ڈھلنا، سورج کا غروب ہونا، امام بغوی لکھتے ہیں:-

"دلوک کے بارے میں اختلاف ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا "دلوک" کے معنی غروب کے ہیں، ابراہیم نخعی، مقاتل بن حیان، ضحاک اور سدی کا بھی یہی قول ہے اور عبداللہ بن عباس، ابن عمر اور جابر رضی اللہ عنہم زوالِ آفتاب کے معنی بتاتے ہیں اور یہی عطاء، قتادہ، مجاہد اور اکثر تابعین کا قول ہے اور لفظ کے معنی دونوں کو جامع ہیں کیونکہ اصل میں دلوک مائل ہونے یعنی جھکنے کو کہتے ہیں اور آفتاب زوال کے وقت بھی جھکتا ہے اور غروب کے وقت بھی اور زوال پر اس کو محمول کرنا دونوں قولوں میں زیادہ اولیٰ ہے کیونکہ اس کے قائلین زیادہ ہیں نیز جب ہم اس کو زوال پر محمول کریں گے تو آیت نماز کے تمام اوقات کی جامع ہو گی، پس "دُلُوْكِ الشَّمْسِ" ظہر اور عصر کو شامل ہے اور "اِلٰی غَسَقِ الَّيْلِ" مغرب عشاء کو متناول ہے اور "قُرْاٰنَ الْفَجْرِ" نماز صبح ہے[1] ۱۵/۹ ۔

دَلْوَهٗ: اس کا ڈول، دَلْوٌ بمعنی ڈول مضاف ہے، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۲/۱۲ ۔

دَلَّهُمْ: اس نے ان کو جتایا، اس نے ان کو خبردار کیا (نصر)، دَلَّ دَلَالَۃٌ سے جس کے معنی راہ بتلانے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، ۲۲/۸ ۔

دَلِيْلًا: نشانی، رہنما، راہ بتلانے والا دَلَالَۃٌ سے، بروزن فَعِیْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ بمعنی فاعل ہے اَدِلَّۃٌ جمع ۱۹/۳ ۔

دَلّٰهُمَا: ان دونوں کو ڈھلا لیا، ان دونوں کو نیچے ڈال دیا، ان دونوں کو کھینچ لیا، دَلّٰی تَدْلِیَۃً سے جس کے

[1] معالم التنزیل، ج۴، ص ۱۴۱ (طبع مصر بر حاشیہ خازن)

معنی کسی کو حیلہ سے کام میں لگا دینے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، تَدْلِیَۃٌ ادلاء الدلو سے لیا گیا ہے جس کے معنی ڈول ڈالنے کے ہیں اور اسی مناسبت سے نیچے ڈال دینے اور کھینچ لینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، ۸/۹ ۔

فصل المیم

دَمٌ: لہو، خون، اصل میں دَمْیٌ تھا اور بعض دَمْوٌ بتاتے ہیں، لام کلمہ محذوف ہے اور کبھی اس کو میم سے بدل کر میم کا میم میں ادغام کر دیتے ہیں جیسے دَمٌّ ۲/۵ ۱/۵ ۹/۶ ۱۲/۱۲ ۱۴/۱۵، ۲۱ ۔

دَمًا: ۸/۹ ۔

دِمَآءَ: لہو، خون، دَمٌ کی جمع ۱/۴ ۔

دِمَآءَکُمْ: تمہارے لہو، تمہارے خون دِمَآءَ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، ۱/۴ ۔

دِمَآؤُھَا: اس کے خون، ان کے لہو، دِمَآءُ مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ ھَا کی ضمیر جمع کے لیے استعمال ہوتی ہے، ۱۴/۱۲ ۔

دُمْتُ: میں ٹھہرا رہا، دَوَام سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم، مَادُمْتُ (جب تک میں رہا) افعال ناقصہ میں سے ہے (ملاحظہ ہو دَامَتْ) ۶/۵ ۱۶/۵ ۔

دُمْتَ: تو ٹھہرا رہا، دَوَام سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر مَادُمْتَ (جب تک تو رہا) افعال ناقصہ میں سے ہے، ۳/۱۶ ۔

دُمْتُمْ: تم ٹھہرے رہے، دَوَام سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، مَادُمْتُمْ (جب تک تم رہے) افعال ناقصہ میں سے ہے۔ ۵/۲ ۔

دَمْدَمَ: اس نے الٹ مارا، اس نے تباہی لا ڈالی، اس نے ہلاکت ڈال دی، اس نے غصہ کیا دَمْدَمَۃٌ سے جس کے معنی ہلاک کرنے اور غصہ ہونے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ۳۰/۱۶ ۔

دَمَّرَ: اس نے اکھیڑ مارا، اس نے ہلاکت ڈال دی تَدْمِیْرٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَدْمِیْرًا) ۲۶/۵ ۔

دَمَّرْنَا: ہم نے خراب کر دیا، ہم نے ہلاک کر دیا، ہم نے اکھیڑ مارا، تَدْمِیْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ۹/۶ ۱۹/۱۳ ۲۳/۸ ۔

دَمَّرْنَاھَا: ہم نے اس کو اکھیڑ مارا، ہم نے اس کو تباہ کر کے چھوڑ دیا، اس میں ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، ۱۵/۴ ۔

دَمَّرْنٰھُمْ: ہم نے ان کو اکھیڑ مارا، ہم نے انکو ہلاک کر دیا اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۱۹/۱۹،۲ ۔

دَمْعٌ : اشک، آنسو، دُمُوْعٌ اور اَدْمُعٌ جمع، ۷ ، ۱۰/۲ ۔

فصل النون

دَنَا : وہ نزدیک ہوا، وہ قریب ہوا (نصر) دُنُوٌّ سے ، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو دَانٍ) ۲۷/۵ ۔

دُنْيَا : عالم، دنیا، بہت نزدیک، بہت ذلیل، دَانِيَۃٌ اور دَنِيَّۃٌ کا اسم تفضیل ہے، اول صورت میں اس کے معنی بہت قریب اور بہت نزدیک کے اور دوسری صورت میں بہت ذلیل اور بہت حقیر کے ہیں، اس کی جمع دُنًی ہے جیسے کُبْرٰی کی جمع کُبَرٌ اور صُغْرٰی کی جمع صُغَرٌ۔ جب دنیا کا استعمال آخرۃ کے مقابلہ میں ہوتا ہے تو اس کے معنی اول اور پہلے کے آتے ہیں اور جب قُصْوٰی کے مقابل ہوتا ہے تو زیادہ قریب کے آتے ہیں ۱/۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۲/۹، ۱۰، ۱۱ ۳/۱۰، ۱۱، ۱۳ و ۱۴ ، ۴/۳، ۶ و ۷، ۱۰ ، ۵/۷، ۸، ۱۰ و ۱۲ ، ۶/۹ و ۱۰ ، ۷/۹، ۱۰، ۱۲ ، ۸/۳، ۱۱، ۱۲ ، ۹ ، ۱۰/۵ و ۱۲، ۱۳ و ۱۵، ۱۶ و ۱۷ ، ۱۱/۲، ۳، ۱۲، ۱۴ و ۱۵ ، ۱۲/۳ و ۵ ، ۱۳/۵، ۹، ۱۱، ۱۳ و ۱۶ ، ۱۴/۱۰، ۱۲، ۲۰، ۲۲ ، ۱۵/۱۶، ۱۸ ، ۱۶/۳، ۴، ۱۴ ، ۱۷/۸ و ۹ ، ۱۸/۳، ۸، ۹ و ۱۰ ، ۲۰/۷، ۹، ۱۰، ۱۱ و ۱۵ ، ۲۱/۳، ۶، ۱۱، ۱۳ و ۲۰ ، ۲۲/۴ و ۱۳ ، ۲۳/۵، ۶، ۱۴ ، ۲۴/۱۰، ۱۱، ۱۶، ۱۸ ، ۲۵/۴، ۵، ۹، ۱۹، ۲۰ ، ۲۶/۲، ۸ ، ۲۷/۶، ۱۹ ، ۲۸/۴ ، ۲۹/۱ ، ۳۰/۳، ۱۲ ۔

فصل الواو

دَوَآبُّ : چلنے والے، جانور، چارپائے، کیڑے، دَآبَّۃٌ کی جمع (ملاحظہ ہو دَآبَّۃٌ) ۹/۱۷ ، ۱۰/۳ ، ۱۴/۹ ، ۲۳/۲ ۔

دَوَآئِرُ : گردشیں، مصائب، دَآئِرَۃٌ کی جمع (ملاحظہ ہو دَآئِرَۃٌ) ۱۱/۳ ۔

دُوْلَۃً : دست گرداں، جو چیز گردش کرتی ہے، کبھی اس کے پاس اور کبھی اس کے پاس، اس کا نام "دولت" ہے، ۲۸/۴ ۔

دُوْنَ : ورے، سوائے، غیر، جو کسی سے نیچے ہو دُوْنَ کہلاتا ہے، بعض کا قول ہے کہ یہ دُنُوٌّ کا مقلوب ہے جس کے معنی نزدیک کے ہیں، امام سیوطی لکھتے ہیں :۔

" دُوْنَ ظرف ہو کر استعمال ہوتا ہے فوق کی نقیض ہے اور مذہب مشہور پر معرب نہیں ہوتا اور بعض کہتے ہیں کہ معرب ہوتا ہے چنانچہ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ دونوں طرح پڑھا گیا ہے، پیش کے ساتھ بھی اور زبر کے ساتھ بھی اور اسم بھی واقع ہوتا ہے بمعنی غیر کے جیسے اِتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖ اٰلِھَۃً (اور لوگوں نے پکڑے ہیں اس کے سوائے معبود) کہ دُوْن بمعنی غیر یعنی اس کے سوا کے ہے، زمخشری نے کہا ہے کہ غیرہ کے معنی کسی چیز کے ورے کے ہیں اور حالت کا فرق بتانے کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے زید دون عمرو (زید عمرو سے نیچے ہے) یعنی شرافت اور علم میں اس سے

یہ نیچے ہے اور اس کے معنی ہیں وسعت سے کام لے کر اس کا استعمال حد سے بڑھنے کے لئے بھی کیا جاتا ہے جیسے اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (رفیق مسلمانوں کو چھوڑ کر یعنی مسلمانوں کی رفاقت سے کافروں کی رفاقت کی طرف تجاوز نہ کرو)" [1]

پ۱: ۴، ۱۱، ۱۳۔ پ۲: ۴۔ پ۳: ۱۱، ۱۵، ۱۶۔ پ۵: ۴، ۱۵، ۱۷، ۱۸۔ پ۶: ۴، ۱۴۔ پ۷: ۶، ۱۳، ۱۹۔ پ۷: ۱۴، ۱۵، ۱۹۔ پ۸: ۴، ۱۱، ۱۷۔ پ۹: ۱۱، ۱۴۔ پ۱۰: ۸، ۱۱۔ پ۱۱: ۴، ۷، ۹، ۱۲، ۱۶۔ پ۱۲: ۲، ۹، ۱۰۔ پ۱۴: ۸، ۱۶، ۱۷۔ پ۱۵: ۱۷۔ پ۱۶: ۶، ۸۔ پ۱۷: ۵، ۶، ۷، ۹، ۱۶، ۱۷۔ پ۱۸: ۴، ۱۷۔ پ۱۹: ۴، ۹، ۱۷، ۱۸، ۱۹۔ پ۲۰: ۱۱، ۱۴، ۱۶۔ پ۲۱: ۱۵، ۱۸۔ پ۲۲: ۴، ۹، ۱۷۔ پ۲۳: ۴، ۶، ۷۔ پ۲۴: ۱، ۲، ۱۲، ۱۳۔ پ۲۵: ۵، ۶، ۱۰، ۱۷۔ پ۲۶: ۱، ۶، ۱۲۔ پ۲۷: ۴، ۷۔ پ۲۸: ۷، ۱۱۔ پ۲۹: ۲، ۳، ۱۱۔

دُوْنِكَ: تیرے سوا، تیرے بغیر، دُوْنِ مضاف كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، پ۱۴: ۱۸، پ۲۶: ۲۔

دُوْنِکُمْ: تمہارے سوائے، تمہارے غیر، دُوْنِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، پ۴: ۳۔

دُوْنِنَا: ہمارے سوائے، ہمارے غیر، دُوْنِ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، پ۷۔

دُوْنِهٖ: اس کے سوائے، اس کے غیر، اس کے ورے، دُوْنِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ۵: ۱۵، پ۷: ۱۲، پ۸: ۸، پ۹: ۱۴، پ۱۲: ۵، ۱۵، پ۱۳: ۸، پ۱۴: ۱۱، پ۱۵: ۶، ۱۴، ۱۶، ۳۱، پ۱۷: ۲، ۱۵، پ۱۸: ۱۶، پ۳۰: ۱۶، پ۲۱: ۱۰، ۱۲، ۱۴، پ۲۲: ۱۴، پ۲۳: ۱، ۵، ۱۶، پ۲۴: ۱، ۲، ۷، پ۲۵: ۲، ۱۳، پ۲۶: ۴، پ۲۹: ۱۲۔

دُوْنِہَا: اس کے ورے، دُوْنِ مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، پ۱۶: ۲۔

دُوْنِہِمْ: ان کے سوائے، ان کے ورے۔ دُوْنِ مضاف ہِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ۱: ۴، پ۱۶: ۵، پ۲۰: ۶، پ۲۲: ۱۱۔

دُوْنِہِمَا: ان دونوں کے ورے، ان دو کے سوائے۔ دُوْنِ مضاف ہِمَا ضمیر تثنیہ مذکر غائب مضاف الیہ، پ۱۶: ۲، پ۲۷: ۱۳۔

دُوْنِیْ: میرے سوا، میرے علاوہ، میرا غیر، دُوْنِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ۱۵: ۱، ۱۹، پ۱۶: ۳۔

فصل الہاء

دِھَاقًا: بھرا ہوا، چھلکتا ہوا، دَھْقٌ سے جس کے معنی لبالب پُر ہونے اور چھلکنے کے ہیں، اسم صفت ہے، پ۳۰: ۲۔

دِھَانِ: تیل کی تلچھٹ، وہ تیل جس کی مالش کی جائے، سرخ زمی، اَدْھِنَۃٌ اور دُھْنٌ جمع اور بعض کا قول ہے کہ دُھْنٌ کی جمع ہے جس کے معنی تیل کے ہیں، پ۲۷: ۲۔

دَھْرٌ: زمانہ، اصل میں تو "دہر" عالم کے وجود میں آنے سے لیکر اس کے ختم ہونے تک کی مدت کا نام ہے اور پھر اس سے ہر بڑی مدت بھی مراد لے لی جاتی ہے برخلاف زَمَانٌ کے کیونکہ وہ مدتِ قلیلہ اور مدتِ کثیرہ دونوں کے لئے آتا ہے، پ۲۵: ۱۹، پ۲۹: ۱۹۔

دُھْنِ: تیل، چکنائی، اسم ہے دِھَانٌ اور اَدْھَانٌ جمع، پ۱۸: ۱۔

[1] الاتقان، ج ۱، ص ۱۶۲، ۱۶۳ (طبع مصر)

فصل الیاء المثناة

دِیَارِ : شہر، گھر دَارٌ کی جمع، ۱/۵۔

دَیَّارًا : بسنے والا، رہنے والا دَارٌ سے یا دَوْرٌ جس کے معنی گھومنے کے ہیں فَیْعَالٌ کے وزن پر ہے فَعَّالٌ کے وزن پر نہیں ورنہ دَوَّارٌ ہوتا جیسے قَوَّالٌ اور جَوَّادٌ ہے، ۲۹/۱۔

دِیَارِکُمْ : تمہارے گھر تمہارے شہر تمہارے وطن دِیَارٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ ۱/۱، ۵/۲، ۲۵/۸۔

دِیَارِنَا : ہمارے شہر ہمارے گھر ہمارے وطن، دِیَارِ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۲/۱۶۔

دِیَارِهِمْ : ان کے گھر ان کے وطن دِیَارِ مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ ۱/۱۶، ۷/۱۱، ۸/۲، ۱۰/۲، ۱۱/۸، ۱۲/۱۳، ۲۱/۱۷، ۲۸/۱۹، ۲۸/۴۔

دِیْنٌ : جزاء، اطاعت، شریعت، بدلہ دینا، اطاعت کرنا، حکم ماننا، "دین" بمعنے ملت ہی ہے مگر اس کا استعمال اطاعت اور شریعت کی پابندی کے معنی میں ہوتا ہے دَانَ یَدِیْنُ کا مصدر ہے اَدْیَانٌ جمع ۱/۱۶، ۲/۸، ۳/۲، ۱۷، ۴/۱۴، ۵/۴، ۶/۱۰، ۹/۱۹، ۱۰/۱۱، ۱۱/۱۶، ۱۲/۱۵، ۱۳/۳، ۱۴/۱۳، ۱۶/۱۷، ۱۷/۱۲، ۱۹/۹، ۲۱/۳، ۷، ۸، ۱۳، ۱۷، ۲۳/۱۴، ۱۵، ۱۶، ۲۴/۷، ۱۲، ۲۵/۳، ۴، ۲۶/۱۲، ۱۸، ۲۷/۱۵، ۲۸/۸، ۹، ۲۹/۷، ۱۶، ۳۰/۲۰، ۲۲، ۲۳، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵۔

دِیْنًا : ۳/۱۲، ۵/۱۵، ۶/۵، ۸/۷۔

دَیْنٌ : دام قرض، ادھار، قرض دینا، قرض لینا دَانَ یَدِیْنُ کا مصدر ہے دُیُوْنٌ جمع، ۳/۱۲۔

دِیْنَارٌ : دینار، اشرفی، ایک سونے کا سکہ جو عرب میں مستعمل تھا، دَنَانِیْرُ جمع، علامہ سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ "جوالیقی" وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ یہ فارسی ہے[1]، ۳/۱۶۔

دِیْنُکُمْ : تمہارا دین، دِیْنُ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ ۲/۱۱، ۳/۱۶، ۶/۳، ۵، ۱۳، ۱۴، ۸/۸، ۲۸/۸، ۲۶/۱۴، ۳۰/۴۴۔

دِیْنِهٖ : اس کا دین، دِیْنِ مضاف هٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۲/۱۱، ۲/۱۲۔

دِیْنَهُمْ : ان کا دین، دِیْنَ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ ۳/۱۱، ۵/۱۸، ۷/۱۴، ۸/۳، ۱۳، ۱۴، ۱/۳، ۱۸/۹، ۱۳، ۲۱/۷۔

دِیْنِیْ : میرا دین، دِیْنِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، ۱۱/۱۶، ۲۳/۱۶۔

دِیَةٌ : خون بہا، دیت، اصل میں وَدْیٌ یَدِیْ کا مصدر ہے مقتول کے بدلہ میں جو خون بہا ادا کیا جاتا ہے اسکا نام دیت ہے، دِیَةٌ اصل میں وَدْیٌ تھا، واؤ کو حذف کرکے آخر میں تا لگائی گئی ہے جیسا کہ عِدَةٌ میں ہوا ہے۔ "دیت" میں سو اونٹ یا ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم دینے

[1] اتقان، ج ۱، ص ۱۳۹

پڑتے ہیں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب موضح القرآن میں فرماتے ہیں :-

"خون بہا مذہبِ حنفی میں مسلمان کے دو ہزار سات سو چالیس روپے ہیں تخمیناً اور دینے آتے ہیں، قاتل کی برادری کو تین برس میں تفریق ادا کریں۔" ب۔

باب الذال المعجمة

فصل الالف

ذَا : یہ، جو، صاحب (والا) پہلے معنی کے اعتبار سے اسمِ اشارہ ہے قریب کے لئے استعمال ہوتا ہے اور جب اس پر ہاءِ تنبیہ داخل ہوتی ہے تو ہٰذا بولتے ہیں مگر قرآنِ مجید میں بغیر ہاءِ تنبیہ کے صرف ذا کا استعمال اسمِ اشارہ کے معنی میں نہیں ہوا ہے دوسرے معنی کے اعتبار سے بمعنی اَلَّذِیْ ہے یہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ جب وہ بعد مَا استفہامیہ اور مَنْ استفہامیہ کے واقع ہو اور اشارہ کیلئے نہ ہو اور تیسرے معنی کے اعتبار سے اسم ہے بمعنی صاحب کے (ملاحظہ ہوں الفاظ ذو، ماذا، من ذا اور ھٰذا)، پ۲/۱۰، ۱۱، ۱۶ پ۳/۲ پ۴/۸ پ۵/۳ پ۶/۵ پ۷/۴ و ۵ پ۸/۶ پ۹/۴ پ۱۱/۹، ۱۰ و ۱۵ پ۱۳/۳ پ۱۴/۹ و ۱۰ پ۱۵/۳ پ۱۶/۲ پ۱۸/۴ پ۱۹/۱۸ پ۲۰/۳ و ۱۰ پ۲۱/۷، ۱۰، ۱۳ و ۱۸ پ۲۲/۹، ۵ و ۱۷ پ۲۳/۷، ۱۱ و ۱۳ پ۲۶/۱ و ۹ پ۲۷/۱۸ پ۲۹/۳، ۱۳، ۱۵ پ۳۰/۱۵۔

ذَا الْقَرْنَيْنِ : ذوالقرنین اس جلیل القدر صالح بادشاہ کا لقب ہے جس کا قصّہ سورۂ کہف میں مذکور ہے۔ واضح رہے کہ قرآنِ مجید سیرت یا تاریخ کی کوئی کتاب نہیں ہے کہ وہ جس شخصیت کا ذکر کرے اس کے تمام حالات کا استقصار کرتا جائے کیونکہ یہ چیز اس کے موضوع سے خارج ہے، وہ جس شخص کا ذکر کرتا ہے اس کی زندگی کے اسی پہلو کو نمایاں کرتا ہے جو دوسروں کیلئے پند و موعظت اور عبرت و نصیحت کا سبق ہو چنانچہ قریش نے جب یہود سے معلومات حاصل کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ذوالقرنین کی نسبت سوال کیا تو قرآنِ مجید نے اس کے جواب میں وہی انداز اختیار کیا جو صالحین کے تذکرہ میں اس کا عام انداز ہے اور وحیِ ربانی کے معجزانہ جواب کے سامنے سائنس کو مجالِ دم زدن نہ رہی لیکن جاہلیتِ کبریٰ کی اس نشاۃِ جدیدہ میں جبکہ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ (کچھ نہیں پر

جس بات کے سمجھنے پر قابو نہ پایا اسے جھٹلانے لگے) کا مکمل دور دورہ ہے۔ حال کے معترضینِ قرآن نے ذوالقرنین کی شخصیت کو سب سے زیادہ اپنے معاندانہ اعتراضات کا ہدف بنالیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ذوالقرنین کا کوئی تاریخی وجود نہیں بلکہ ایک بے حقیقت افسانہ تھا جو عرب کے یہودیوں میں مشہور تھا اور پیغمبرِ اسلام علیہ السلام نے نعوذ باللہ خوش اعتقادی کی بنا پر حقیقت سمجھ کر اسے نقل کر ڈالا۔

بلاشبہ مفسرین کے اقوال اس کی شخصیت کے تعین میں سخت مضطرب ہیں۔ کوئی اس کو عرب کا بادشاہ سمجھ کر اذوا یمن میں سے قرار دیتا اور صعب نام بتاتا ہے اور کوئی اسکندر مقدونی کو ذوالقرنین خیال کرتا ہے، سید احمد خاں نے ازالۃ الغین عن ذی القرنین میں اسے "چی وانگ ٹی" بانی دیوارِ چین بنانے کی ناکام کوشش کی ہے، غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان میں سے کوئی بات بھی قابلِ التفات نہیں ہے لیکن بلا تحقیق کے معترضین کا اپنی علمی نارسائی کا اعتراف کرنے کی بجائے سرے سے اسکی شخصیت کا انکار کر بیٹھنا جہلِ مرکب کی کتنی شرمناک مثال ہے؟ آج اکتشافاتِ اثریہ نے جن سینکڑوں چھپی ہوئی حقیقتوں کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے انہیں سے ایک ذوالقرنین

کی بھی حقیقت ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے "ترجمان القرآن" میں اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ زمانۂ حال کی نہایت قیمتی اسلامی تحقیقات میں سے ہے، ہم اسی کا اقتباس موصوف ہی کے الفاظ میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں، مولانا فرماتے ہیں :-

"قرآن نے ذوالقرنین کی نسبت جو کچھ بیان کیا ہے اس پر بحیثیتِ مجموعی نظر ڈالی جائے تو حسبِ ذیل امور سامنے آجاتے ہیں :-

اولاً جس شخصیت کی نسبت پوچھا گیا ہے وہ یہودیوں میں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا یعنی ذوالقرنین کا لقب خود قرآن نے تجویز نہیں کیا ہے، پوچھنے والوں کا مجوزہ ہے کیونکہ فرمایا وَ یَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ۔

ثانیاً اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اسے حکمرانی عطا فرمائی تھی اور ہر طرح کا ساز و سامان جو ایک حکمران کے لئے ہو سکتا تھا اس کے لئے فراہم ہو گیا تھا۔

ثالثاً اس کی بڑی مہمیں تین تھیں، پہلے مغربی ممالک فتح کیے پھر مشرقی، پھر ایک ایسے مقام تک فتح کرتا ہوا چلا گیا جہاں پہاڑی درّہ تھا اور اس کی دوسری طرف سے یاجوج اور ماجوج آکر لوٹ مار

تمایا کرتے تھے۔

رابعاً اس نے وہاں ایک نہایت محکم سدّ تعمیر کردی اور یاجوج وماجوج کی راہ بند ہوگئی۔

خامساً وہ ایک عادل حکمران تھا، جب وہ مغرب کی طرف فتح کرتا ہوا دور تک چلا گیا تو ایک قوم ملی جس نے خیال کیا کہ دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح ذوالقرنین بھی ظلم و تشدد کریگا لیکن ذوالقرنین نے اعلان کیا کہ بے گناہوں کے لئے کوئی اندیشہ نہیں ہے، جو لوگ نیک عملی کی راہ چلیں گے ان کے لئے ویسا ہی اجر بھی ہوگا البتہ ڈرنا انہیں چاہئے جو جرم اور بدعملی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

سادساً وہ خدا پرست اور راستباز انسان تھا اور آخرت کی زندگی پر یقین رکھتا تھا۔

سابعاً وہ نفس پرست بادشاہوں کی طرح طامع اور حریص نہ تھا، جب ایک قوم نے کہا یاجوج اور ماجوج ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں، آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک سد تعمیر کردیں، ہم خراج دیں گے تو اس نے کہا مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ (جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہی میرے لئے بہتر ہے میں تمہارے خراج کا طامع نہیں یعنی میں خراج کی طمع سے یہ کام نہیں کرونگا اپنا فرض سمجھکر انجام دونگا۔

تاریخ قدیم کی جس شخصیت میں یہ تمام اوصاف پائے جائیں وہی ذوالقرنین ہوسکتا ہے، سوال یہ ہے کہ یہ کون شخص تھا؟

سب سے پہلا حل طلب مسئلہ جو مفسرین کے سامنے آیا وہ اس کے لقب کا تھا، عربی میں بھی اور عبرانی میں بھی "قرن" کے معنی صاف سینگ کے ہیں پس ذوالقرنین کا مطلب ہوا دو سینگوں والا، لیکن چونکہ تاریخ میں کسی ایسے بادشاہ کا سراغ نہیں ملا جس کا ایسا لقب رہا ہو اس لئے مجبوراً "قرن" کے معنی میں طرح طرح کے تکلفات کرنے پڑے پھر چونکہ فتوحات کی وسعت اور مغرب و مشرق کی حکمرانی کے لحاظ سے سکندر مقدونی کی شخصیت سب سے زیادہ مشہور رہی ہے اس لئے متاخرین کی نظریں اسی کی طرف اٹھ گئیں حالانکہ کسی اعتبار سے بھی قرآن کا ذوالقرنین سکندر مقدونی نہیں ہوسکتا، تو وہ خدا پرست تھا، نہ عادل تھا۔ نہ مفتوح قوموں کیلئے فیاض تھا اور نہ ہی اس نے کوئی سدّ بنائی۔

بہرحال مفسرین ذوالقرنین کی شخصیت کا سراغ نہ لگا سکے، اگر ذوالقرنین کے مفہوم کا کوئی سراغ ملتا تھا تو وہ صرف دور کا ایک اشارہ تھا جو حضرت دانیال کی کتاب میں ملتا ہے یعنی ایک خواب جو

انہوں نے بابل کی اسیری کے زمانے میں دیکھا تھا
چنانچہ کتاب دانیال میں ہے :

"میں دیکھتا ہوں کہ ندی کے کنارے ایک
مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں دونوں سینگ
اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے
کے پیچھے تھا، میں نے دیکھا کہ پچھم، اُتر اور دکھن
کی طرف وہ سینگ مارتا ہے یہاں تک کہ کوئی
جانور اس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکا اور وہ بہت بڑا
ہوگیا۔ میں یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھوں پچھم
کی طرف سے ایک بکرا آکے تمام روئے زمین
پر پھر گیا، اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے درمیان
ایک عجیب طرح کا سینگ تھا، وہ دو سینگ والے
مینڈھے کے پاس آیا اور اس پر غضب سے بھڑکا
اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور مینڈھے
کی قوت نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کرے۔" (دانیال ۸)

پھر اس کے بعد ہے کہ جبرئیل نمایاں ہوا اور اس
نے خواب کی یہ تعبیر بتلائی کہ دو سینگوں والا مینڈھا
مادہ (میڈیا) اور فارس کی بادشاہت ہے اور بال
والا بکرا یونان کی، جو بڑا سینگ اسکی آنکھوں کے
درمیان دکھائی دیتا ہے وہ اس کا پہلا بادشاہ ہوگا (۸: ۱۵)

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مادہ (میڈیا) اور
فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی
تھی اور چونکہ یہ دونوں مملکتیں مل کر ایک شہنشاہی
بننے والی تھیں اس لئے شہنشاہ مادہ وفارس کو
دو سینگوں والے مینڈھے کی شکل میں ظاہر کیا گیا
پھر اس مینڈھے کو جس نے شکست دی وہ یونان
کے بکرے کا پہلا سینگ تھا یعنی سکندر مقدونی
تھا جس نے فارس پر حملہ کیا اور کیانی شہنشاہی کا
خاتمہ ہوگیا۔

اس خواب میں بنی اسرائیل کے لئے بشارت
یہ تھی کہ ان کی آزادی وخوشحالی کا نیا دور انہی دو سینگوں
والی شہنشاہی کے ظہور سے وابستہ تھا یعنی شہنشاہِ
فارس بابل پر حملہ کر کے فتحمند ہونے والا تھا اور پھر
اسی کے ذریعہ بیت المقدس کی از سرِ نو تعمیر اور یہودی
قومیت کی دوبارہ شیرازہ بندی ہونے والی تھی چنانچہ
چند برسوں کے بعد سائرس[1] کا ظہور ہوا، اس نے

[1] یاد رکھنا چاہیے کہ شاہانِ فارس کے ناموں نے مختلف زبانوں
میں مختلف صورتیں اختیار کر لی ہیں اور اس کی وجہ سے مؤرخوں
نے سخت غلطیاں کی ہیں، سائرس کا اصلی نام گورش یا گوروش
تھا جیسا کہ دارا کے کتبہ بے ستون سے معلوم ہوتا ہے لیکن
یونانی اسے سائرس کہنے لگے اور یہودیوں نے اس کا تلفظ خورس
کی شکل میں کیا چنانچہ یسعیاہ، ارمیاہ اور دانیال کے صحائف میں
جا بجا یہ نام آیا ہے اور یہی گورش ہے جس نے عربی میں خسرو کی
شکل اختیار کر لی چنانچہ عرب مؤرخ اسے کیخسرو
کے نام سے پکارتے ہیں۔

میڈیا اور فارس کی مملکتیں ملا کر ایک عظیم الشان شہنشاہی قائم کر دی اور پھر بابل پر پے در پے حملے کر کے اسے سخر کر لیا۔

چونکہ اس خواب میں میڈیا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی اس لئے خیال ہوتا تھا کہ عجب نہیں فارس کے شہنشاہ کے لئے یہودیوں میں ذوالقرنین کا تخیل پیدا ہو گیا ہو یعنی دو سینگوں والی شہنشاہی اور وہ اسے اس لقب سے پکارتے ہوں تاہم یہ محض ایک قیاس تھا اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت موجود نہ تھی، لیکن ۱۸۳۸ء کے ایک انکشاف نے جس کے نتائج بہت عرصہ کے بعد منظرِ عام پر آئے، اس قیاس کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کر دیا اور معلوم ہو گیا کہ فی الحقیقت شہنشاہ سائرس کا لقب ذوالقرنین تھا اور یہ محض یہودیوں کا کوئی مذہبی تخیل نہ تھا بلکہ خود سائرس کا یا باشندگانِ فارس کا مجوزہ اور پسندیدہ نام تھا۔

اس انکشاف نے ظن و تخمین کے تمام پردے اٹھا دئے۔ یہ خود سائرس کا ایک سنگی تمثال ہے جو اصطخر کے کھنڈروں میں دستیاب ہوا، اس میں سائرس کا جسم اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں، اوپر خطِ میخی میں جو کتبہ کندہ تھا اس کا بڑا حصہ ٹوٹ کر ضائع ہو چکا ہے مگر جس قدر باقی ہے وہ اس کیلئے کافی ہے کہ تمثال کی شخصیت واضح ہو جائے، اس سے معلوم ہو گیا کہ مادہ اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دینے کا تخیل ایک مقبول اور عام تخیل تھا اور یقیناً سائرس کو ذوالقرنین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ تمثال میں پروں کا ہونا اس کے ملکوتی صفات و فضائل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ نہ صرف پارسیوں میں بلکہ تمام معاصر قوموں میں یہ اعتقاد عام طور پر پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی نوعیت کا انسان ہے۔ اب غور کرو قرآن کی تصریحات نے جو جامہ تیار کیا ہے وہ کس طرح ٹھیک ٹھیک سائرس ہی کے جسم پر راست آتا ہے؟ ہم نے اس بحث کے آغاز میں تصریحاتِ قرآنی کا خلاصہ دیدیا ہے جو سات دفعات پر مشتمل ہیں، ان پر پھر ایک نظر ڈال لو۔

سب سے پہلے اس بات پر غور کرو کہ ذوالقرنین کی نسبت سوال بالاتفاق یہودیوں کی جانب سے ہوا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی غیر یہودی بادشاہ

کی شخصیت یہودیوں میں عزت واحترام کی نظر سے
دیکھی جاتی تھی تو وہ صرف سائرس ہی کی تھی، انہیوں
کی پیشینگوئیوں کا مصداق دانیال نبی کے خواب
کا ظہور، رحمتِ الٰہی کی واپسی کی بشارت بنی اسرائیل
کا نجات دہندہ، خدا کا فرستادہ چرواہا اور مسیح،
یروشلم کی تعمیرِ ثانی کا وسیلہ، پس اس سے زیادہ قدرتی
بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسی کی نسبت ان کا سوال
ہو، علاوہ بریں سائرس کی تمثال کے انکشاف نے
قطعی طور پر یہ بات آشکارا کر دی ہے کہ اس کے
سر پر دو سینگوں کا تاج رکھا گیا تھا اور یہ فارس
اور مادہ کی مملکتوں کے اجتماع اور اتحاد کی علامت تھی۔

اس کے بعد قرآن کی تصریحات سامنے لاؤ
سب سے پہلا وصف جو اس کا بیان کیا ہے یہ
ہے کہ إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ
كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا (ہم نے اسے زمین میں قدرت
دی تھی اور ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا، قرآن
جب کبھی انسان کی کسی کامرانی و خوشحالی کو براہِ راست
خدا کی طرف منسوب کر کے کہتا ہے جیسا کہ یہاں کہا
ہے تو اس سے مقصود عموماً کوئی ایسی بات ہوتی ہے
جو عام حالات کے خلاف محض اس کے فضل و کرم
سے ظہور میں آئی ہو پس ضروری ہے کہ ذوالقرنین
کی حکمرانی کا مقام ایسے ہی حالات میں ملا ہو جو
بالکل غیر معمولی قسم کے ہوں اور انہیں محض توفیقِ الٰہی
کی کرشمہ سازی سمجھا جا سکے کیونکہ اس کے تمکن فی الارض
کو براہِ راست خدا کی طرف نسبت دی ہے
لیکن اس اعتبار سے سائرس کی زندگی ٹھیک ٹھیک
اس آئینہ کی تصویر ہے اس کی ابتدائی زندگی
ایسے حالات میں بسر ہوئی جنہیں حیرت انگیز
حوادث نے ایک افسانہ کی شکل دیدی ہے قبل
اس کے کہ پیدا ہو خود اس کا نانا اس کی موت
کا خواہشمند ہو گیا تھا، ایک وفادار آدمی اسکی زندگی
بچاتا ہے اور وہ شاہی خاندان سے بالکل الگ
ہو کر ایک گمنام گڈریے کی طرح پہاڑوں میں زندگی
بسر کرتا ہے پھر اچانک نمایاں ہوتا ہے اور بغیر کسی
جنگ و مقابلہ کے میڈیا کا تخت اس کے لئے
خالی ہو جاتا ہے یقیناً یہ صورتِ حال واقعات و
حوادث کی عام رفتار نہیں ہے جو ہمیشہ پیش آتی
ہو، نوادرِ ہستی کی ایک غیر معمولی عجائب آفرینی ہے
اور صاف نظر آرہا ہے کہ قدرت کا مخفی ہاتھ کسی
خاص مقصد سے ایک خاص ہستی تیار کر رہا ہے! دو
زمانہ کی عام رفتار تھم گئی ہے تاکہ اس کی راہ صاف
ہو جائے۔

اس کے بعد اس کی تین مہموں کا ذکر آتا ہے
ایک مغرب الشمس کی طرف یعنی پچھم کی طرف ایک
مطلع الشمس کی طرف یعنی پورب کی طرف تیسری ایک
ایسے مقام پر جہاں کوئی وحشی قوم آباد تھی اور
یاجوج اور ماجوج وہاں آکر لوٹ مار مچایا کرتے
تھے۔ اب دیکھو تمام تفصیلات کس طرح ٹھیک
ٹھیک سائرس کی فتوحات پر منطبق ہوتی ہیں۔
سائرس نے ابھی فارس اور میڈیا کا تاج
سر پر رکھا ہی تھا کہ ایشیائے کوچک کے بادشاہ
کروسس نے حملہ کر دیا۔ اب سائرس مجبور ہو گیا
کہ بلا توقف اس حملہ کا مقابلہ کرے وہ میڈیا
کے دارالحکومت ہگ متانہ سے (جو اب ہمدان
کے نام سے پکارا جاتا ہے) نکلا اور اس
تیزی کے ساتھ بڑھا کہ صرف دو جنگوں کے
بعد جو پیٹریا اور سارڈیس کے قریب واقع ہوئی
تھیں، لیڈیا کی تمام مملکت پر قابض ہو گیا،
اب تمام ایشیائے کوچک بحر شام سے بحر اسود
تک اس کے زیر نگین تھا وہ برابر بڑھتا گیا،
یہاں تک کہ مغربی ساحل پر پہنچ گیا۔ یہ لشکر کشی
جو اسے پیش آئی صریح مغرب کی لشکر کشی تھی
کیونکہ وہ ایران سے مغرب کی طرف چلا اور
خشکی کے مغربی کنارے تک پہنچ گیا، یہ اس
کے لئے مغرب الشمس کی آخری حد تھی۔
ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل نقشہ
میں نکالو، تم دیکھو گے کہ تمام ساحل اسطرح
کا واقع ہوا ہے کہ چھوٹے چھوٹے خلیج پیدا
ہو گئے ہیں اور سمرنا کے قریب اس طرح کے
جزیرے نکل آئے ہیں جنہوں نے ساحل کو ایک جھیل یا
حوض کی شکل دیدی ہے، لیڈیا کا دارالحکومت
سارڈیس مغربی ساحل کے قریب تھا اور اس کا محل
موجودہ سمرنا سے بہت زیادہ فاصلہ پر نہ تھا، بس
جب سائرس، سارڈیس کی تسخیر کے بعد آگے
بڑھا ہوگا تو یقیناً بحر ایجین کے اسی ساحلی مقام
پر پہنچا ہوگا جو سمرنا کے قرب و جوار میں واقع ہے،
یہاں اس نے دیکھا ہوگا کہ سمندر نے ایک
جھیل کی سی شکل اختیار کر لی ہے، ساحل کی کیچڑ
سے پانی گدلا ہو رہا ہے اور شام کے وقت اسی
میں سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے، اسی صورت
حال کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے
کہ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ
اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج ایک گدلے حوض
میں ڈوب رہا ہے، دوسری لشکر کشی مشرق کی

طرف تھی چنانچہ ہیروڈوٹس اور سیاز دونوں اسکی مشرقی لشکر کشی کا ذکر کرتے ہیں جو لیڈیا کی فتح کے بعد اور بابل کی فتح سے پہلے پیش آئی تھی اور دونوں نے تصریح کی کہ مشرق کے بعض وحشی اور صحرانشین قبائل کی سرکشی اس کا باعث ہوئی تھی، یہ ٹھیک ٹھیک قرآن کے اس اشارہ کی تصدیق کہ حتی اذا بلغ مطلع الشمس وجدھا تطلع علیٰ قوم لم نجعل لھم من دونھا ستراً جب وہ مشرق کی طرف پہنچا تو اسے ایسی قوم ملی جو سورج کے لئے کوئی آڑ نہیں رکھتی، یعنی خانہ بدوش قبائل تھے۔

یہ خانہ بدوش قبائل کون تھے؟ ان مورخین کی صراحت کے مطابق بکٹریا یعنی بلخ کے علاقہ کے قبائل تھے۔ نقشہ پر اگر نظر ڈالو گے تو صاف نظر آجائیگا کہ بکٹریا ٹھیک ٹھیک ایران کیلئے مشرق اقصیٰ کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اس کے آگے پہاڑ ہیں اور انہوں نے راہ روک دی ہے۔

تیسری لشکر کشی اس نے ایسے علاقہ تک کی جہاں یاجوج اور ماجوج کے حملے ہوا کرتے تھے یہ یقیناً اس کی شمالی مہم تھی جس میں وہ بحر خزر (کاسپین) کو داہنی طرف چھوڑتا ہوا کاکیشیا کے سلسلہ کوہ تک پہنچ گیا تھا اور وہاں سے اسے ایک درہ ملا تھا جو دو پہاڑی دیواروں کے درمیان تھا، اسی راہ سے یاجوج اور ماجوج آکر اس طرف کے علاقہ میں تاخت و تاراج کیا کرتے تھے اور یہیں اس نے سد تعمیر کی۔

اس کے بعد ذوالقرنین کا جو وصف سامنے آتا ہے وہ اس کی عدالت گستری اور خدمت انسانی کی فیاضانہ سرگرمی ہے اور یہ اوصاف سائرس کی تاریخی سیرت کی اس درجہ آشکارا حقیقتیں ہیں کہ مورخ کی نگاہ کسی دوسری طرف اٹھ ہی نہیں سکتی، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے مغرب میں جو قوم ملی تھی، اس کی نسبت حکم الٰہی ہوا تھا یاذا القرنین اما ان تعذب واما ان تتخذ فیھم حسناً یعنی قوم اب تیرے بس میں ہے جس طرح چاہے تو ان کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے، خواہ سزا دے خواہ انہیں اپنا دوست بنالے، یقیناً یہ لیڈیا کی لیڈیائی قوم تھی، اس کے بادشاہ کروسس نے تمام عہد و پیمان اور باہمی رشتہ داریاں بھلا کر بلا وجہ سائرس پر حملہ کر دیا تھا اور صرف خود ہی حملہ آور نہیں ہوا تھا بلکہ وقت کی تمام طاقتور حکومتوں کو بھی اسکے خلاف

ابھار کر اپنے ساتھ کر لیا تھا۔ تمام یونانی مؤرخ بالاتفاق شہادت دیتے ہیں کہ سائرس نے فتح کے بعد باشندگان لیڈیا کے ساتھ جو سلوک کیا وہ صرف منصفانہ ہی نہ تھا وہ اس سے بھی زیادہ تھا وہ فیاضانہ تھا وہ اگر اپنے دشمنوں کے ساتھ کرتا تو یہ انصاف ہوتا کیونکہ زیادتی ان ہی کی تھی لیکن وہ صرف منصف ہونے پر قانع نہیں ہوا اس نے رحم و بخشش کا شیوہ اختیار کیا، یہ تو صرف اس کی معرکی فتحمندی کی سرگزشت تھی، اب دیکھنا چاہیئے کہ اس کے اعمال کی عام رفتار کیسی رہی اور قرآن کا بیان کردہ وصف کہاں تک اس پر راست آتا ہے؟

بالاتفاق یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ سائرس تاریخ قدیم کی سب سے بڑی شخصیت ہے جس میں بیک وقت فتوحات کی وسعت، فرمانروائی کی عظمت اور اخلاق و انسانیت کی فضیلت جمع ہو گئی تھی اور وہ جس عہد میں ظاہر ہوا اس عہد میں اسکی شخصیت ہر اعتبار سے انسانیت کا ایک پیام اور نمونہ بن گئی تھی۔

اس سلسلہ میں آخری وصف جو ذوالقرنین کا سامنے آتا ہے وہ اس کا ایمان باللہ ہے۔ یہودیوں کے صحائف کی واضح شہادت موجود ہے کہ خدا نے اسے اپنا فرستادہ اور "مسیح" کہا اور وہ نبیوں کا موعود و منتظر تھا، ظاہر ہے کہ ایسی ہستی خدا کی نافرمان نہیں ہو سکتی"۔

ہم نے اقتباس میں نہایت ہی اختصار سے کام لیا ہے، مولانا کا یہ مقالہ جو ذوالقرنین، یاجوج و ماجوج اور سد کی تحقیق میں سپرد قلم ہوا ہے نہایت باریک خط کے اکتیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے تفصیل کے لئے اس کا مطالعہ ازبس مفید ہے۔

واضح رہے کہ ہمارے زمانے میں بھی اور اس سے پہلے بھی ذوالقرنین کی نبوت کا مسئلہ زیر بحث رہ چکا ہے اور ہر فریق اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل پیش کرتا ہے لیکن جس صورت میں کہ حاکم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کر رہے ہیں کہ

لا ادری ذا القرنین "مجھے نہیں معلوم ذوالقرنین نبی کان نبیا ام لا[1] تھے یا نہیں"۔

اس بحث کے فیصلہ کی جرأت کرنا کسقدر لایعنی ہے۔ (۱۶ / ۲ ب)

ذَا الْكِفْلِ: ذوالکفل علیہ السلام، قرآن مجید میں آپکا ذکر انبیاء علیہم السلام کے زمرہ میں دو مقام پر آیا ہے، لیکن دونوں جگہ صرف نام لیا گیا ہے، آپ کے حالات کا کوئی اجمالی یا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا گیا،

[1] المستدرک علی الصحیحین ج ۲ ص ۴۵۰ (طبع دائرۃ المعارف ۱۳۴۲ھ) حاکم نے اس کو بخاری مسلم کی شرط پر صحیح کہا اور ذہبی نے تلخیص میں اسکو تسلیم کر لیا ہے۔

اسی طرح جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس سلسلہ میں کچھ مروی نہیں ہے۔ قرآنِ پاک نے آپ کے صابرین، صالحین اور اخیار میں سے ہونے کی شہادت اور رحمتِ الٰہی میں داخل کرنے کی بشارت دی ہے، عالمِ انسانی کیلئے اس سے زیادہ کسی کی سیرت میں اور کس چیز کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے، پ ۱۷/۶، ۲۳/۱۳۔

ذَا النُّوْنِ: مچھلی والا، یہ حضرت یونس علیہ السلام کا لقب ہے چونکہ آپ کو مچھلی نگل گئی تھی اس لئے ذوالنون کہلائے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ذا و یونس) پ ۱۷/۶۔

ذَاتِ: والی، صاحب، مؤنث ہے ذُو کا جو معنی صاحب ہے، ذَوَاتٌ جمع (ملاحظہ ہو ذُو) پ ۳/۷،۴؛ ۷/۴؛ ۹/۱۵؛ ۱۰/۱؛ ۱۱/۱۷؛ ۱۵/۱۴،۱۶؛ ۱۷/۸؛ ۱۸/۳؛ ۲۰/۱؛ ۲۱/۱۲؛ ۲۲/۱۷؛ ۲۳/۱۵؛ ۲۵/۴؛ ۲۶/۱۸؛ ۲۷/۸،۱۱،۱۷؛ ۲۸/۱۵؛ ۲۹/۱؛ ۳۰/۱۰،۱۱،۱۴،۱۹۔

ذَارِیٰتِ: بکھیرنے والیاں، پراگندہ کرنے والیاں، ذَرْوٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، قرآنِ مجید میں یہ ہواؤں کی صفت بیان کی گئی ہے (ملاحظہ ہو ذَرْوًا) ۲۶/۱۸۔

ذَاقَا: ان دونوں نے چکھا (نصر) ذَوْقٌ سے جس کے معنی چکھنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ تثنیہ مذکر غائب، ۸/۹۔

ذَاقَتْ: اس نے چکھا، ذَوْقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۲۸/۱۸۔

ذَاقُوْا: انہوں نے چکھا، ذَوْقٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۸/۵، ۱۵/۸۔

ذٰکِرٰتِ: یاد کرنے والی عورتیں، ذَاکِرَۃٌ کی جمع، ذِکْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث (ملاحظہ ہو ذکر) ۲۲/۲۔

ذَاکِرِیْنَ: یاد رکھنے والے، یاد کرنیوالے، ذَاکِرٌ کی جمع، ذِکْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب و جر، ۱۲/۱، ۲۲/۲۔

ذٰلِکَ: یہ، یہی، اسمائے اشارہ میں سے ہے، بعید کے لئے آتا ہے اس میں ذَا اسمِ اشارہ ہے اور لِ حرفِ ... خطاب ہے اور اسی لئے مخاطب کے حالات کے اعتبار سے تذکیر، تانیث، تثنیہ اور جمع میں بدلتا رہتا ہے۔

پ۱: ۶،۷،۸،۹،۱۰ — پ۲: ۵،۶،۸،۱۲،۱۳،۱۴،۱۶ — پ۳: ۶،۱۰،۱۱،۱۳
پ۳: ۱۴،۱۶،۱۷ — پ۴: ۱،۳،۸،۱۰،۱۲،۱۳ — پ۵: ۱،۲،۴،۵،۶،۱۴،۱۵،۱۶
پ۶: ۲،۳،۷،۹،۱۰،۱۲،۱۳،۱۵ — پ۷: ۲،۳،۴،۹،۹،۱۱،۱۶،۱۷ — پ۸: ۱۴، ۱۵
پ۸: ۷،۱۰ — پ۹: ۷،۱۱،۱۲ — پ۱۰: ۳،۷،۱۰،۱۱،۱۴،۱۵،۱۶،۱۷ — پ۱۱: ۲،۱۳ و
پ۱۱: ۴،۶،۱۱،۱۲ — پ۱۲: ۶،۹،۱۰،۱۵،۱۶،۱۷ — پ۱۳: ۲،۵،۷،۱۳،۱۵
پ۱۴: ۵،۸،۱۴،۱۵،۱۷،۲۰،۲۱ — پ۱۵: ۴،۶،۱۱،۱۲،۱۳،۱۴،۱۶،۲۱
پ۱۶: ۲،۵،۷،۱۱،۱۲،۱۶ — پ۱۷: ۲،۶،۸،۹،۱۰،۱۵،۱۶ — پ۱۸: ۱،۲،۴
پ۱۸: ۷،۱۰،۱۲،۱۳،۱۷ — پ۱۹: ۲،۴،۵،۸،۹،۱۰،۱۱،۱۲،۱۳،۱۴،۱۹
پ۲۰: ۳،۶،۱۴،۱۵،۱۷ — پ۲۱: ۱،۶،۷،۸،۱۱،۱۲،۱۳،۱۴،۱۵،۱۶ و
پ۲۱: ۱۷،۱۸،۲۰ — پ۲۲: ۳،۵،۷،۸،۱۴،۱۵،۱۶ — پ۲۳: ۲،۶،۱۱،۱۲،۱۳ و

۲۳/۱۶، ۱۷ ـ ۲۴/۲، ۶، ۸، ۱۶، ۱۸ ـ ۲۵/۳، ۴، ۵، ۸، ۹، ۱۶، ۱۸، ۱۹، ۲۰ ـ ۲۶/۴، ۵، ۷، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸ ـ ۲۷/۴، ۶، ۱۵، ۱۸، ۱۹ ـ ۲۸/۱، ۲، ۴، ۵، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۹ ـ ۲۹/۳، ۴، ۷، ۸، ۱۱، ۱۵، ۱۸، ۱۹ ـ ۳۰/۲، ۳، ۴، ۸، ۱۰، ۱۴، ۲۳، ۲۵، ۳۲ ـ

ذٰلِکِ: یہ، یہی، اسم اشارہ ہے واحد مؤنث کے لئے استعمال ہوتا ہے، ۱۲/۳، ۱۹/۲۶ ـ

ذٰلِکُمْ: یہ، یہی، اس میں کُمْ ضمیر جمع خطاب کیلئے ہے، ۱/۶، ۲/۱۴، ۳/۷، ۱۰، ۱۵، ۴/۹، ۱، ۵/۵، ۶/۵، ۷/۱۸، ۱۹، ۸/۴، ۱۸، ۹/۹، ۱۶، ۱۰/۱۲، ۱۱/۶، ۹، ۱۳/۱۳، ۱۴/۵، ۱۶، ۱۸/۱۰، ۲۰/۱۴، ۲۱/۷، ۱۴، ۲۲/۴، ۱۴، ۲۳/۱۵، ۲۴/۷، ۱۲، ۱۳، ۱۷، ۲۵/۳، ۲۰، ۲۸/۱، ۸، ۱۰، ۱۲، ۱۷ ـ

ذٰلِکُمَا: یہ، یہی، اس میں کُمَا ضمیر تثنیہ خطاب کے لئے ہے، ۱۲/۱۵ ـ

ذٰلِکُنَّ: یہ، یہی۔ اس میں کُنَّ ضمیر جمع مؤنث خطاب کے لئے ہے، ۱۲/۱۴ ـ

ذٰنِکَ: یہ دو، ذَانِ ذَا کا تثنیہ ہے، اسماء اشارہ میں سے ہے اور کَ ضمیر خطاب ہے، ۲۰/۷ ـ

ذَاهِبٌ: جانے والا، ذَهَابٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو اَذْهَبُ)، ۲۳/۷ ـ

ذَائِقُوْا: چکھنے والے، ذَائِقٌ کی جمع ذَوْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، اصل میں ذَائِقُوْنَ تھا، نون اضافت کے سبب گر پڑا (ملاحظہ ہو ذَاقَا)، ۲۳/۶ ـ

ذَائِقُوْنَ: چکھنے والے، ذَوْقٌ سے، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، ۲۳/۶ ـ

ذَائِقَۃُ: چکھنے والی، ذَوْقٌ سے، اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، ۴/۱۰، ۱۷/۳، ۲۱/۲ ـ

فصل الباء الموحدۃ

ذُبَابٌ: مکھی، اَذِبَّۃٌ، ذِبَّانٌ، ذُبٌّ جمع، ۱۷/۱۴ ـ

ذُبَابًا: ۱۷/۱۴ ـ

ذُبِحَ: وہ ذبح کیا گیا، ذَبْحٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اَذْبَحَنَّ)، ۶/۵ ـ

ذِبْحٍ: قربانی، جس چیز کو ذبح کیا جائے اس کا نام ذِبْحٌ ہے، ۲۳/۷ ـ

ذَبَحُوْهَا: انہوں نے اس کو ذبح کیا، ذَبَحُوْا ذَبْحٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب، ۱/۸ ـ

فصل الراء المہملۃ

ذَرْ: تو چھوڑ دے، (سَمِعَ، فَتَحَ) وَذْرٌ سے جس کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں، امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، اسکی ماضی نہیں آتی ہے، ۱۴/۷ ـ

ذَرَأَ: اس نے پیدا کیا، اس نے پھیلایا، اس نے

بکھیرا، ذَرْءٌ سے جس کے معنی پیدا کرنے اور ظاہر کرنے اور پھیلانے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۸ ۔

ذِرَاعًا: گز، بازو، ہاتھ، کہنی سے لیکر بیچ کی انگلی کے سرے تک جو ہاتھ کا حصہ ہے "ذراع" کہلاتا ہے، اَذْرُعٌ اور ذُرْعَانٌ جمع، پ ۲۹ ۔

ذِرَاعَيْهِ: اس کے دونوں ہاتھ، اس کے دونوں بازو، ذِرَاعَيْ، ذِرَاعٌ کا تثنیہ، مضاف ہے اور اضافت کے سبب نون تثنیہ حذف ہو گیا ہے، ہِ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، پ ۱۵ ۔

ذَرَأَكُمْ: اس نے تم کو پیدا کیا، اس نے تم کو پھیلایا، اس نے تم کو بکھیر دیا۔ اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے، (ملاحظہ ہو ذَرَأَ)، پ ۵ ۔

ذَرَأْنَا: ہم نے پیدا کیا، ہم نے پھیلا دیا، ذَرْءٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، پ ۹ ۔

ذَرْعًا: طاقت، گنجائش، ہاتھ کی کشادگی، ذَرَعَ يَذْرَعُ کا مصدر ہے، خازن بغدادی لکھتے ہیں:

"ازہری کا بیان ہے کہ "ذرع" طاقت کی جگہ پر استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی اصل یوں ہے کہ اونٹ اپنی رفتار میں اگلے قدموں کو پچھلے قدموں کی وسعت کے اعتبار سے بڑھاتا ہے اور جب اس پر طاقت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا جاتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے اگلے قدم رک جاتے ہیں اور وہ کمزور ہو کر اپنی گردن لمبی کر دیتا ہے پس "ضیق ذرع" سے گنجائش اور طاقت کا ختم ہو جانا مراد لیا گیا اور ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا کے معنی ہوئے کہ معاملہ کی خرابی سے رہائی کی کوئی صورت نہ ہو سکی ازہری کے علاوہ دوسرے علماء کا بیان ہے کہ اسکے معنی دل تنگی اور کڑھنے کے ہیں اور اس کی اصل کا پتہ نہیں، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ "ذرع" وسعت (گنجائش) سے کنایہ ہے کیونکہ ذراع، ید میں داخل ہے اور عرب والے بولتے ہیں لیس هذا فی یدی (یہ میرے ہاتھ میں نہیں) اور مراد یہ لیتے ہیں کہ اس کی مجھ میں گنجائش نہیں، اور ضاق فلان ذرعا بکذا اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ وہ شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو اور اس سے نکلنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔"[1] پ ۱۲، پ ۲۱ ۔

ذَرْعُهَا: اس کا طول، اس کی درازی، اس کا ناپ، ذَرْعٌ مصدر ہے جس کے معنی پیمائش کرنے اور ناپنے کے آتے ہیں، مضاف ہے هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، پ ۲۹ ۔

---

[1] لباب التاویل، ج ۳، ص ۱۹۸، (طبع مصر ۱۳۳۱ھ)

ذَرْنَا: تو ہم کو چھوڑ دے، اس میں نَا ضمیر جمع متکلم ہے (ملاحظہ ہو ذَرْ)، ۱۰/۱۲۔

ذَرْنِيْ: تو مجھ کو چھوڑ دے، اس میں نونِ وقایہ اور ی ضمیر واحد متکلم ہے، ۱۴، ۱۳/۱۱، ۲۹/۱۵۔

ذَرْوًا: اڑانا، پراگندہ کرنا، جدا کرنا، ذَرَا يَذْرُوْ کا مصدر ہے، ۱۶/۱۸۔

ذَرُوْا: تم چھوڑ دو، وَذَرَ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو ذَرْ)، ۳/۶، ۶/۱، ۹/۱۲، ۲۵/۱۲۔

ذَرُوْنَا: تم ہم کو چھوڑ دو، اس میں نَا ضمیر جمع متکلم ہے، ۲۶/۱۰۔

ذَرُوْنِيْ: تم مجھے چھوڑ دو، اس میں نونِ وقایہ ی ضمیر واحد متکلم ہے، ۲۷/۸۔

ذَرُوْهُ: تم اس کو چھوڑ دو، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، ۱۲/۱۶۔

ذَرُوْهَا: تم اس کو چھوڑ دو، اس میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، ۸/۱۲، ۱۲/۹۔

ذَرَّةٍ: ذرہ، چھوٹی چیونٹی، ذَرَّاتٌ جمع، ۵/۳، ۱۱/۱۲، ۲۲/۹، ۳۰/۲۲۔

ذَرْهُمْ: تو ان کو چھوڑ دے، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو ذَرْ)، ۷/۱۷، ۸/۳، ۱۲/۱، ۱۴/۴، ۲۵/۱۳، ۲۷/۴، ۲۹/۸۔

ذُرِّيَّتَنَا: ہماری اولاد، ذُرِّيَّاتٌ، ذُرِّيَّةٌ کی جمع، مضاف ہے، نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۱۹/۴۔

ذُرِّيَّتِهِمْ: ان کی اولاد، ذُرِّيَّاتِ مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۸/۱۶، ۹/۹، ۲۷/۶۔

ذُرِّيَّةٌ: اولاد، اصل میں چھوٹے چھوٹے بچوں کا نام ذُرِّيَّة ہے مگر عرف میں چھوٹی اور بڑی سب اولاد کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے اور اگرچہ اصل میں یہ جمع ہے مگر واحد اور جمع دونوں کے لئے مستعمل ہے ذُرِّيَّةٌ کے بارے میں تین اقوال ہیں (۱) یہ ذَرْءٌ سے مشتق ہے جس کے معنی پیدا کرنے اور پھیلانے کے ہیں اور اس کی ہمزہ متروک ہو گئی ہے جیسے کہ رَوِيَّةٌ اور بَرِيَّةٌ ہیں۔ (۲) اس کی اصل ذُرْوِيَّةٌ ہے۔ (۳) ذَرٌّ سے جس کے معنی بکھیرنے کے ہیں فُعْلِيَّةٌ کے وزن پر ہے جیسے قُمْرِيَّةٌ ہے، ذَرَارِيٌّ اور ذُرِّيَّاتٌ جمع، ۳/۱۲، ۶/۱۲، ۳/۳، ۹/۱۲، ۱۱/۱۴، ۱۲/۱۲، ۱۵/۱، ۱۶/۷۔

ذُرِّيَّتِنَا: ہماری اولاد، ذُرِّيَّةٌ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۱/۱۵۔

ذُرِّيَّتِهٖ: اس کی اولاد، ذُرِّيَّةٌ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۶/۷، ۱۹/۱۹، ۲۰/۱۵، ۲۳/۷۔

ذُرِّيَّتَهَا: اس کی اولاد، ذُرِّيَّةٌ مضاف ھا

ضمیر واحد مؤنث غائب، مضاف الیہ، ۳/۱۲۔

ذُرِّیَّتَهُمْ : ان کی اولاد، ذُرِّیَّۃٌ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۹/۱۲، ۲۳/۲، ۲۷/۳۔

ذُرِّیَّتَهُمَا : ان دونوں کی اولاد، ذُرِّیَّۃٌ مضاف هُمَا ضمیر تثنیہ مذکر غائب مضاف الیہ ۲۳/۷، ۲۷/۸۔

ذُرِّیَّتِیْ : میری اولاد، ذُرِّیَّۃٌ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، ۱۵/۱۵، ۱۳/۱۸۔

فصل القاف

ذُقْ : تو چکھ، ذَوْقٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو ذَاقَا)، ۲۵/۱۶۔

فصل الکاف

ذِکْرٌ : ذکر، یاد، پند، نصیحت، بیان ذَکَرَ یَذْکُرُ کا مصدر ہے، امام راغب لکھتے ہیں:۔

" ذکر بول کر کبھی تو اس سے نفس کی وہ ہیئت مراد لی جاتی ہے کہ جس کے ذریعہ انسان کے لئے جو کچھ معرفت حاصل کرے اس کا یاد رکھنا ممکن ہوا اور یہ حِفظ ہی کی طرح ہے مگر حفظ باعتبار اس کے حصول کے بولا جاتا ہے اور ذکر باعتبار اس کے استحضار کے (یعنی حفظ یاد کرنے کے لئے) اور کبھی ذکر کسی چیز کے دل میں یا گفتگو میں یاد آجانے کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ ذکر دو ہیں، ذکر قلبی اور ذکر لسانی اور پھر دونوں میں سے ایک کی دو قسمیں ہیں، ایک بھولے پیچھے یاد آنا، دوسرے بغیر بھولے یاد رہنا بلکہ دائمی یاد رکھنا، نیز ہر قول یعنی گفتگو اور بیان کو بھی ذکر کہا جاتا ہے "

اور بیہقی تاج المصادر میں رقمطراز ہیں:۔

" ذکر کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ ذکر جو نسیان کی ضد ہے جیسے ارشادِ باری جل وعلا ہے وَمَا اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْکُرَهٗ (اور یہ مجھ کو بھلایا شیطان ہی نے کہ اس کا مذکور کروں) اور ایک وہ ذکر جو کہ قول ہے جس کا ذکر ہو اس کی برائی نہ ہو جیسا کہ عام طور پر گفتگو میں ہوتا ہے نیز وہ گفتگو بھی جس میں مذکور کا عیب بیان ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کی زبانی بیان فرمایا ہے سَمِعْنَا فَتًی یَّذْکُرُهُمْ (ہم نے سنا ہے ایک جوان ان کو کچھ کہتا ہے یعنی ان کو عیب دیتا ہے)"

آیت شریفہ اَؤُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّکْرُ مِنْ بَیْنِنَا (کیا ہم سب میں سے اسی پر ذکر اتارا گیا)

میں ذِکر سے قرآنِ مجید مراد ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر اور کونسا ذکر ہے، پ۳/۱۴ پ۷/۲ پ۸/۵،۱۶،۱۵ پ۱۲/۱۵ پ۱۳/۵،۱۰ پ۱۴/۱،۱۲ پ۱۶/۴ پ۱۷/۱،۲،۳،۴،۷ پ۱۸/۱۱،۱۷ پ۱۹/۱،۵ پ۲۱/۱ پ۲۲/۱۸ پ۲۳/۱،۲،۳،۱۲،۱۳،۱۴،۱۷ پ۲۴/۱۹ پ۲۵/۷،۱۰ پ۲۷/۸،۹،۱۹ پ۲۸/۲،۱۲،۱۴ پ۲۹/۴،۱۲ پ۳۰/۶ -

ذِکْرًا پ۲/۹ پ۱۵/۲۱ پ۱۶/۲،۱۴،۱۵ پ۱۷/۴ پ۲۲/۳ پ۲۳/۵،۹ پ۲۸/۱۸ پ۲۹/۲۱ -

ذَکَر: مرد، نر، ذُکُوْر اور ذُکْرَان جمع، کبھی اس سے عضوِ مخصوص کا کنایہ بھی ہوتا ہے پ۳/۱۲ پ۴/۱۱،۱۳ پ۵/۱۵ پ۶/۴ پ۱۴/۱۹ پ۲۴/۱۰ پ۲۶/۱۴ پ۲۷/۵،۷ پ۲۹/۱۸ پ۳۰/۱۷ -

ذَکَرَ: اس نے ذکر کیا، اس نے یاد کیا (نَصَرَ) ذِکْرٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب پ۲۱/۱۹ پ۳۰/۱۲ -

ذُکِرَ: وہ یاد کیا گیا، وہ ذکر کیا گیا، ذِکْر سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ۸/۱ پ۹/۱۵ پ۱۷/۱۲ پ۲۴/۲ پ۲۶/۷ -

ذُکِّرَ: اس کو یاد دلایا گیا، اس کو سمجھایا گیا، اس کو نصیحت کی گئی، تَذْکِیْرٌ سے جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں، ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَذْکِیْرًا) پ۱۵/۲ پ۲۱/۱۵ -

ذَکِّرْ: تو یاد دلا، تو سمجھا، تو نصیحت کر، تَذْکِیْرٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، پ۷/۱۴ پ۲۶/۱۷ پ۲۷/۲،۴ پ۳۰/۱۲،۱۳ -

ذُکْرَانَ: مرد، ذَکَر کی جمع پ۱۹/۱۲ -

ذُکْرَانًا. پ۲۵/۹ -

ذَکَرْتَ: تونے یاد کیا، تونے ذکر کیا، ذِکْرٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، پ۱۵/۵ -

ذُکِّرْتُمْ: تم کو سمجھایا گیا، تم کو نصیحت کی گئی، تَذْکِیْرٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو تَذْکِیْرًا) پ۲۲/۱۹ -

ذِکْرَکَ: تیرا ذکر، تیری یاد، تیرا مذکور، ذِکْرٌ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، پ۳۰/۱۹ -

ذِکْرِکُمْ: تمہارا ذکر، تمہارا مذکور، تمہارا یاد کرنا، تمہاری نصیحت، ذِکْرٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، پ۱۷/۱ -

ذِکْرِنَا: ہماری یاد، ذِکْرِ مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، پ۱۵/۱۲ پ۲۷/۹ -

ذَکَرُوْا: انہوں نے یاد کیا، انہوں نے ذکر کیا، ذِکْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ۴/۵ پ۱۹/۱۵ -

ذُکِّرُوْا: ان کو سمجھایا گیا، ان کو نصیحت کی گئی، ان کو یاد دلائی گئی، تَذْکِیْرٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ۶/۷ پ۷/۱۱ پ۹/۱۱ پ۱۹/۴ پ۲۱/۱۵ پ۲۳/۵ -

ذَکَرَہٗ: اس کو یاد کیا، اس کو ذکر کیا، ذَکَرَ صیغہ ماضی ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ۲۹/۱۶ پ۳۰/۵ -

ذِکْرِہِمْ: ان کا ذکر، ان کی نصیحت، ذِکْرِ مضاف ہِمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، پ۱۸/۴ -

ذَکِّرْہُمْ: تو ان کو نصیحت کر، تو انکو یاد دلا. ذَکِّرْ

تَذْکِیْرٌ سے، صیغہ امر، ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ۱۳/۱۲۔

ذِکْرٰی: نصیحت کرنا، ذکر کرنا، یاد دہانی، موعظت، ذَکَرَ یَذْکُرُ کا مصدر ہے، کثرتِ ذکر کے لئے ذِکْرٰی بولا جاتا ہے، یہ ذکر سے زیادہ بلیغ ہے ۶/۱۴، ۱۶، ۸/۱۴، ۱۲/۱۰، ۱۷/۶، ۱۹/۱۵، ۲۱/۱، ۲۳/۱۶، ۱۲، ۲۴/۱۱، ۲۵/۱۴، ۲۶/۱۵، ۱۷، ۲۷/۲، ۲۹/۱۵، ۳۰/۱۴، ۱۲، ۵۔

ذِکْرِیْ: میری نصیحت، میری یاد، میرا ذکر، ذِکْرٌ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ ۱۶/۱۲، ۱۰، ۱۱، ۱۶، ۱۸/۶، ۲۳/۱۰۔

ذَکَرَیْنِ: دو مرد، دو نر، ذَکَرٌ کا تثنیہ بحالت نصب وجر، ۸/۴۔

ذِکْرُھَا: اس کی یاد، اس کا مذکور، اس کا ذکر، ذِکْرٌ مضاف ھا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ ۳۰/۴۔

ذِکْرُھُمْ: ان کا نصیحت پکڑنا، ان کا یاد کرنا ذِکْرٰی مضاف، ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۲۶/۶۔

ذُکُوْرٌ: مرد، ذَکَرٌ کی جمع، ۲۵/۶۔

ذُکُوْرِنَا: ہمارے مرد، ذُکُوْرِ مضاف، نا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، ۸/۳۔

ذَکَّیْتُمْ: تم نے ذبح کیا، تَذْکِیَۃٌ سے جس کے معنی ذبح کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۶/۵۔

فصل اللام

ذُلٌّ: تواضع، ذلت، عاجزی، ذَلَّ یَذِلُّ کا مصدر ہے، دوسرے کے دباؤ اور قہر کی بنا پر جو ذلت ہو اس کو ذُلٌّ کہتے ہیں اور بغیر کسی کے قہر اور دباؤ کے خود اپنی سرکشی اور سخت گیری کے بعد جو ذلت حاصل ہو وہ ذُلٌّ کہلاتی ہے، ۱۵/۱۳، ۴، ۲۵/۶۔

ذُلُلًا: مسخر، مطیع، منقاد، ذَلُوْلٌ کی جمع ۱۴/۱۵۔

ذُلِّلَتْ: وہ پست کر دی گئی، وہ مسخر کر دی گئی، وہ تابع کر دی گئی، تَذْلِیْلٌ سے، ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب (ملاحظہ ہو تَذْلِیْلًا)، ۲۹/۱۹۔

ذَلَّلْنٰھَا: ہم نے ان کو رام کر دیا، ہم نے ان کو فرمانبردار کر دیا، ہم نے ان کو عاجز کر دیا ذَلَّلْنَا تَذْلِیْلٌ سے، ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ھا ضمیر واحد مؤنث غائب اَنْعَام (مویشی) کی طرف راجع ہے اس لئے جمع کے معنی دے گی، ۲۳/۴۔

ذَلُوْلٌ: رام، نرم، مطیع، ہموار، پست ذُلٌّ اور ذِلٌّ سے، صفت مشبہ کا صیغہ، ذُلُلٌ جمع، ۱/۸۔

ذَلُوْلًا، ۲۹/۲۔

ذِلَّۃٌ: ذلت، خواری، رسوائی ذَلَّ یَذِلُّ کا مصدر ہے ۱/۷، ۴/۳، ۹/۴، ۱۱/۸، ۲۹/۴، ۸۔

فصل المیم

ذِمَّۃً : عہد، ذِمَمٌ جمع، ۱۰/۸ ۔

فصل النون المعجمۃ

ذَنْبٌ : گناہ، ذُنُوبٌ جمع، اصل میں ذَنْبٌ کے معنی کسی چیز کی دم پکڑنے کے ہیں اور دم کے اعتبار سے ہی اس کا استعمال ہر اس فعل کے متعلق ہوتا ہے جس کا انجام بُرا ہو اور اسی وجہ سے بُرے انجام کا نام ذَنْب ہے اور چونکہ گناہ کا انجام برا ہے اس لئے اسے ذَنْب کہتے ہیں، ۹/۱، ۲۴/۶، ۳۰/۶ ۔

ذَنْبِكَ : تیرا برا انجام، تیرا گناہ، ذَنْبِ مضاف كَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۱۲/۱۳، ۲۴/۱۱، ۲۶/۹،۶ ۔

ذَنْبِهٖ : اس کا گناہ، ذَنْبِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، ۲۰/۱۹، ۲۷/۲ ۔

ذَنْبِهِمْ : ان کا گناہ، ذَنْبِ مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۲۹/۱، ۳۰/۱۶ ۔

ذَنُوبٌ : بھرا ڈول، بطور استعارہ حصہ اور نصیب کے معنی میں بھی آتا ہے، ذَنَائِبُ، ذِنَابٌ اور اَذْنِبَۃٌ جمع ۲۷/۲، ذَنُوبًا ۲۷/۲ ۔

ذُنُوبٌ : گناہ، ذَنْبٌ کی جمع ۴/۵، ۱۵/۲، ۱۹/۳، ۲۴/۳ ۔

ذُنُوبِكُمْ : تمہارے گناہ، ذُنُوبِ مضاف كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۲/۱۲، ۴/۷، ۱۳/۱۴، ۲۲/۶، ۲۶/۴، ۲۷/۹ ۔

ذُنُوبَنَا : ہمارے گناہ، ذُنُوبَ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، ۳/۱۰، ۴/۱۱،۶، ۱۲/۵، ۲۴/۷ ۔

ذُنُوبِهِمْ : ان کے گناہ، ذُنُوبِ مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۳/۱۰، ۴/۵، ۶/۱۱، ۷/۷، ۹/۳، ۱۰/۲، ۱۱/۲، ۲۰/۱۱، ۲۴/۸ ۔

فصل الواو

ذُو : والا، صاحب، اسم ہے اس کے ذریعہ اسماء اجناس و انواع سے موسوم کیا جاتا ہے، یہ اسمائے ستہ مکبرہ میں سے ہے یعنی ان چھ اسموں میں سے ہے کہ جب ان کی تصغیر نہ ہو اور وہ غیر یائے متکلم کی طرف مضاف ہوں تو ان کو پیش کی حالت میں واؤ، زبر کی حالت میں الف اور زیر کی حالت میں یا ء آتی ہے جیسے ذُو، ذَا، ذِی، یہ ہمیشہ مضاف ہو کر ہی استعمال ہوتا ہے اور اسم ظاہر ہی کی طرف مضاف ہوتا ہے، ضمیر کی طرف نہیں اور اس کا تثنیہ بھی آتا ہے اور جمع بھی، علامہ سہیلی کا بیان ہے :۔

ذُو کے وصف میں صاحب کے وصف کی

بہ نسبت زیادہ بلاغت ہے اور اس کے ذریعہ اضافت میں زیادہ شرف ہے کیونکہ ذُوْ تابع کی طرف مضاف ہوتا ہے اور صاحب متبوع کی طرف چنانچہ ابوھریرۃ صاحب النبی بولتے ہو النبی صاحب ابی ھریرۃ نہیں بولتے لیکن ذُو کے ساتھ جب ذُوا المال اور ذوا العرش کہو گے تو پہلا اسم نہیں متبوع ہی ملے گا تابع نہیں اور یہی فرق ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانبیاء میں فرمایا ہے وَذَا النُّوْنِ اور اسکی اضافت نون کی طرف کی ہے جس کے معنی مچھلی کے ہیں اور سورۂ نون میں ارشاد ہے وَلَا تَکُنْ کَصَاحِبِ الْحُوْتِ حالانکہ معنی ایک ہی ہیں لیکن دو مختلف حالتوں کی طرف جس خوبی کے ساتھ دونوں لفظوں میں اشارہ کیا ہے، بڑا تفاوت ہے کیونکہ تعریف کے موقع پر جب ان کا ذکر کیا تو ذا لایا گیا کہ اس ذریعہ اضافت میں زیادہ بزرگی ہے، نیز لفظِ نون استعمال کیا کہ وہ لفظِ حُوت سے اشرف ہے کیونکہ اوائلِ سورہ میں موجود ہے اور لفظِ حوت میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جس کے ذریعہ اسکو یہ شرف حاصل ہو، اس لئے اسی کو استعمال کیا گیا اور جب ایسے مقام پر ان کا ذکر کیا جہاں ان کی پیروی سے نہی ہے تو "صاحب" کا استعمال کیا گیا۔" [1]

پ ۱/۱۳، پ ۲/۱۶، ۱۷، پ ۳/۴، ۹، ۱۶، پ ۴/۷، ۹، پ ۷/۳، پ ۸/۳، ۵، پ ۹/۱۸، پ ۱۱/۱۱، پ ۱۳/۷، ۱۹، پ ۱۵/۲۰، پ ۲۰/۲، ۱۱، پ ۲۳/۱۰، پ ۲۴/۷، ۱۲، ۱۹، پ ۲۵/۱، پ ۲۷/۲، ۵، ۱۱، پ ۲۷/۱۲، ۱۹، ۲۰، پ ۲۸/۱۱، ۱۷، پ ۳۰/۱۰۔

ذَوَا: والے، صاحب، ذُوْ کا تثنیہ بحالت رفع پ ۷/۴۸۔

ذَوَاتَا: والیاں، صاحب، ذاتُ کا تثنیہ بحالتِ رفع (ملاحظہ ہو ذاتُ)، پ ۲۷/۱۳۔

ذَوَاتَیْ: والیاں، صاحب، ذاتُ کا تثنیہ بحالتِ نصب و جر، پ ۲۲/۸۔

ذُوْقُوْا: تم چکھو، ذَوْقٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو ذَاقَ) پ ۴/۲، ۱۰، پ ۷/۹، پ ۸/۱۱، پ ۹/۱۸، پ ۱۰/۳، ۱۱، پ ۱۱/۱۰، پ ۱۲/۹، پ ۲۱/۱۵، پ ۲۲/۱۱، ۱۹، پ ۲۳/۱۲، پ ۲۶/۴، ۱۸، پ ۲۷/۹، ۱۰، پ ۳۰/۱۔

ذُوْقُوْہُ: تم اس کو چکھو، اس میں ہ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ ۹/۱۶۔

ذَوَیْ: والے، صاحب، ذُوْ کا تثنیہ بحالتِ نصب و جر، پ ۷/۲۵۔

ذَوِیْ: والے، صاحب، ذُوْ کی جمع، بحالت نصب و جر، پ ۲/۶۔

---

[1] الاتقان مؤلفہ امام سیوطی، ج ۱، ص ۱۶۳ (طبع مصر)

فصل الہاء

ذَهَاب : جانا، چلنا، چھوڑنا ذَهَبَ يَذْهَبُ کا مصدر ہے (ملاحظہ ہو اِذْهَبْ)۔

ذَهَبَ : وہ گیا، وہ لے گیا ذَهَاب سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔

ذَهَب : سونا، زر، اَذْهَاب، ذُهُوب، ذُهْبَان جمع۔

ذَهَبًا :۔

ذَهَبَتْ : وہ گئی، وہ چلی گئی، ذَهَاب سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب۔

ذَهَبْنَا : ہم گئے، ہم چلے گئے، ذَهَاب سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر متکلم۔

ذَهَبُوا : وہ گئے، وہ لے گئے، ذَهَاب سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔

فصل الیاء المثناة

ذِی : والا، صاحب، اسماء ستہ مکبرہ میں سے ہے (ملاحظہ ہو ذُو)۔

ذِئْب : گرگ، بھیڑیا، ذِئَاب اَذْؤُب، ذُؤْبَان جمع۔

باب الراء المہملۃ

فصل الالف

رَاٰی : اس نے دیکھا، رُؤْيَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، یہ تمام قرآن میں بغیر یاء کے تنہا الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے، البتہ سورۃ النجم میں دیگری کے ساتھ مرقوم ہے (ملاحظہ ہو اَرَیٰ اور رَاٰی)۔

رَابِطُوا : تم دل لگائے رہو، تم لگے ہو تم آمادہ رہو، رِبَاط اور مُرَابَطَة سے جس کے معنی محافظت اور نگرانی کرنے اور چوکی دینے کے ہیں، امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، علامہ خازن بغدادی لکھتے ہیں :۔

"مُرَابَطَة کی اصل یہ ہے کہ ادھر کے لوگ اپنے گھوڑے اور ادھر کے لوگ اپنے گھوڑے اس طرح باندھ لیں کہ فریقین میں سے ہر ایک دوسرے سے جنگ کے لئے مستعد رہے، بعد میں ہر اس شخص کو جو سرحد پر اقامت گزین ہو کر سرحد پار کا

دفاع کرنے لگا، مُرَابِطٌ کہنے لگے کہ اس کے پاس کوئی سواری بندھی ہوئی نہ ہو۔" [1]

شرعًا مرابطت کی دو قسمیں ہیں ایک اسلامی سرحد پر کافروں کے مقابلہ میں دفاع کے لئے چوکی دیتے رہنا، دوسرے نفس کی بندش اور نگرانی کرنا، اسی لئے حدیث میں ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں مصروف رہنے کو رباط کہا گیا ہے، ۴/۱۱۔

رَابِعُهُمْ: ان کا چوتھا، رَابِعٌ اسم عدد مضاف ہے، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۱۵/۱۵ ۲۲/۲۔

رَابِيًا: چڑھنے والا، پھولنے والا، بلند، رَبْوٌ سے جس کے معنی پھولنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، ۱۳/۸۔

رَابِيَةٌ: سخت، زائد، رُبُوٌّ سے جس کے معنی بڑھنے اور زائد ہونے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، ۲۹/۵۔

رَأَتْهُ: اس (عورت) نے اس کو دیکھا، رَأَتْ رُؤْيَةٌ سے، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اَرٰی اور رَاٰی) ۱۹/۱۸۔

رَأَتْهُمْ: اس نے ان کو دیکھا، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۱۸/۱۷۔

[1] تفسیر لباب التاویل، ج ۱، ص ۳۹۴، ۳۹۵ (طبع مصر)

رَاجِعُوْنَ: پھر جانے والے، لوٹنے والے، رُجُوع سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، رَاجِعٌ کی جمع بحالت رفع (ملاحظہ ہو اِرْجِعْ اور رَجَعَ) ۲/۱ ۲/۳ ۲/۶ ۱۵/۴۔

رَاجِفَةُ: کانپنے والی، رَجْفٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث (ملاحظہ ہو تَرْجُفُ) ۳۰/۳۔

رَاحِمِيْنَ: رحم والے، مہربانی کرنیوالے، رُحْمٌ اور رَحْمَةٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، رَاحِمٌ کی جمع بحالتِ نصب وجر (ملاحظہ ہو رُحَمَاءُ و رَحْمٰن) ۹/۸ ۱۲/۱۲ ۱۳/۲ ۱۷/۶ ۱۸/۶۔

رَادٌّ: رد کرنے والا، پھیرنے والا، دفع کرنے والا، رَدٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو تَرُدُّ) ۱۱/۱۶

رَادِفَةٌ: پیچھے آنیوالی، رِدْفٌ سے جس کے معنی پیچھے ہونے اور کسی کے پیچھے سواری پر بیٹھنے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، ۳۰/۴۔

رَآدُّكَ: تجھ کو پھیرنے والا، تجھ کو لوٹانے والا، رَآدُّ مضاف، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، ۲۰/۱۲۔

رَآدُّوْهُ: اس کو پھیرنے والے، اس کو لوٹا دینے والے، رَآدُّوْ رَدٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت رفع، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، رَآدُّوْ اصل میں رَآدُّوْنَ تھا، نون جمع اضافت کے سبب گر پڑا، ۲۰/۴۔

رَادِّيْ: پھیرنے والے، لوٹا دینے والے، رَدٌّ

سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب و جر
یہ بھی اصل میں رَازِقِیْنَ تھا، نونِ جمع اضافت کے
سبب سے ساقط ہو گیا ہے، ۱۴/۱۶ -

رَازِقِیْنَ : رزق دینے والے، روزی دینے والے
رِزْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر (ملاحظہ ہو
اُرْزُقْ اور یَرْزُقُ) ۵/۲۲ ۲/۱۴ ۱۵/۱۴ ۱۴/۱۳ ۱۱/۱۲ ۱۲/۲۵ -

رَأْسِ : سر، رُءُوْسٌ جمع، ۸/۴ ۱۶/۱۳ -

رَاسِخُوْنَ : ثابت قدم، مضبوط، پکے، رُسُوْخٌ
سے جس کے معنی کسی شے کے استوار اور مضبوط ہونے
کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، ۹/۳ ۲/۶ -

رَأْسِہٖ : اس کا سر، رَأْسِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد
مذکر غائب، مضاف الیہ، ۸/۲ ۱۵/۱۲ ۱۶/۲۵ -

رَأْسِیْ : میرا سر، رَأْسِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم
مضاف الیہ، ۱۴/۱۳ ۱۵/۱۶ -

رَاسِیٰتٌ : ایک جگہ دھری رہنے والی، چولہوں پر
قائم رہنے والی، رُسُوٌّ سے جس کے معنی کسی چیز پر
قائم رہنے اور استوار ہونے کے ہیں، اسم فاعل کا
صیغہ جمع مؤنث، رَاسِیَۃٌ واحد، ۸/۲۲ -

رَاشِدُوْنَ : بھلائی پانے والے، راہ یافتہ،
رَشَدٌ اور رُشْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر،
رَاشِدٌ کی جمع (ملاحظہ ہو رَشَدًا اور رُشْدٌ) ۱۳/۲۶ -

رَاضِیَۃٌ : پسندیدہ، خوش، من بھاتی، رَاضِیْ،
رِضًی سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث (ملاحظہ ہو
تَرْضٰی) ۵/۲۹ ۱۳ ۳۰/۲۶، ۱۴، ۱۳ -

رَاعِنَا : ہماری رعایت کر، ہمارا خیال رکھ، ہماری
طرف کان لگا، رَاعِ مُرَاعَاۃٌ سے جس کے معنی کسی
کی بات پر کان رکھنا اور دوسرے کے حق کی رعایت
کرنے کے ہیں، امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، نا ضمیر جمع
متکلم، شاہ عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں :-

"یہود پیغمبر کی مجلس میں بیٹھتے اور حضرت کلام فرماتے
یعنی بات جو نہ سنی ہوتی چاہتے کہ پھر تحقیق کریں تو
کہتے رَاعِنَا یعنی ہماری طرف بھی متوجہ ہوں،
ان سے مسلمان بھی سیکھ کر کسی وقت یہ لفظ کہتے
اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا کہ یہ لفظ نہ کہو اگر کہنا ہو تو
اُنْظُرْنَا کہو، اس کے معنی بھی یہی ہیں اور آگے
سے سنتے رہو کہ پوچھنا ہی نہ پڑے، یہود کو اس
کہنے میں دغا تھی، اس کو زبان دبا کر کہتے تو
رَاعِیْنَا ہو جاتا یعنی چرواہا اور ان کی زبان
میں رَاعِنَا احمق کو بھی کہتے تھے" [1]
۱/۱۳ ۵/۴ -

رَاعُوْنَ : نباہنے والے، رعایت کرنے والے،

---

[1] موضح القرآن، سورہ بقرہ -

خبردار، رِعَایَۃٌ سے جس کے معنی نگہداشت رکھنے
اور نگرانی کرنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر رَاعِیٌ
کی جمع بحالتِ رفع، پ ۱۸ ع ۱، پ ۲۹ ع ۷ ۔

رَاغَ: وہ جا گھسا، وہ پوشیدہ طور سے گیا (نَصَرَ)
رَوْغٌ سے جس کے معنی چپکے سے کسی چیز کی طرف ہونے
اور خفیہ داؤ گھات لگانے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد
مذکر غائب، پ ۲۳ ع ۷، پ ۲۶ ع ۱۹ ۔

رَاغِبٌ: رغبت کرنے والا، بے رغبتی کرنے والا
رَغْبَۃٌ سے، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، جب اس
کے صلہ میں عن آتا ہے تو اس کے معنی بے رغبتی کرنے
اور منہ پھیرنے کے ہوتے ہیں اور یہاں یہی صورت ہے
(ملاحظہ ہو اِرْغَبْ اور رَغْبًا)، پ ۱۶ ۔

رَاغِبُوْنَ: رغبت کرنے والے، رَغْبَۃٌ سے اسم
فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ رفع رَاغِبٌ کی جمع،
پ ۱۰ ع ۱۲، پ ۲۹ ع ۳ ۔

رَافِعُكَ: تجھ کو اٹھانے والا، رَافِعٌ رَفْعٌ سے
جس کے معنی اٹھانے اور بلند کرنے کے ہیں، اسم فاعل
کا صیغہ واحد مذکر مضاف ہے، کَ ضمیر واحد مذکر
حاضر مضاف الیہ۔ واضح رہے کہ یہاں رفع سے
رفع حقیقی جسمانی مراد ہے، رفع روحانی یا رفع درجات
مراد نہیں ہے، جیسا کہ منکرینِ نزولِ مسیح (علیہ الصلوٰۃ و
والسلام) کا خیال ہے کیونکہ یہود مدعیانِ قتلِ مسیح
ہیں اور آیت ان کے اس زعمِ باطل کی تردید میں ہے
اور ظاہر ہے کہ اگر رفعِ روحانی یا رفعِ درجات مراد
لیا جائے تو تردید کے لئے کوئی معنی ہی نہیں رہتے
کیونکہ رفعِ روحانی یا رفعِ درجات اور قتل میں باہم
کوئی منافات نہیں ہے، پس قتل کی تردید اس
بات کے کہنے سے کس طرح ہو سکتی ہے کہ ان کی
روح آسمان پر اٹھا لی گئی یا ان کے درجے بلند
ہو گئے، ہاں اگر رفع حقیقی جسمانی مراد لیا جائے تو
بلاشبہ ان کے دعاءِ قتل کی واشگاف تردید ہے
کہ انہوں نے تو داؤ لگایا ہی ہے مگر ہم تم کو صحیح و
سالم مع جسم کے اٹھا لیں گے، آیت کو بغور پڑھیے
کہ رفعِ حقیقی جسمانی یعنی صحیح و سالم، زندہ و سلامت
آسمان پر اٹھا لینے کے علاوہ دوسرے معنی مناسب
ہو ہی نہیں سکتے، ارشاد ہے:۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ — اور خفیہ تدبیر کی انہوں نے اور
وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ — خفیہ تدبیر کی اللہ نے اور اللہ تدبیر
اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى — کرنے والوں میں بہتر ہے جس وقت
اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ — کہا اللہ نے اے عیسیٰ میں تجھ کو
رَافِعُكَ اِلَيَّ ۔ — بھر لوں گا اور اٹھا لوں گا اپنی طرف

شاہ عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں:۔

"یہود کے عالموں نے اس وقت کے بادشاہ کو بہکایا کہ یہ شخص ملحد ہے، توریت کے حکم سے خلاف بتلاتا ہے، اس نے لوگ بھیجے کہ ان کو پکڑ لادیں، جب وہ پہنچے، حضرتِ عیسیٰ کے یار سرک گئے، اس شتابی میں حق تعالیٰ نے حضرتِ عیسیٰ کو آسمان پر اٹھا لیا اور ایک صورت ان کی رہ گئی اسی کو پکڑ لائے، پھر سولی پر چڑھایا"۔ له

غور کیجیے یہود کی خفیہ تدبیر تو یہ تھی کہ انہوں نے مکر و فریب سے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھانا چاہا اور حق تعالیٰ کی خفیہ تدبیر یہ تھی کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو تو زندہ و سلامت آسمان پر اٹھا لیا اور جو شخص سب سے پہلے ان کو گرفتار کرنے آیا تھا اسی پر حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ ڈال دی اور یہود نے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے شبہ میں اسی شخص کو سولی پر چڑھا دیا، اب یہاں کس طرح سے رفع جسمانی حقیقی کے علاوہ کچھ اور مراد لیا جا سکتا ہے، پ ۳ ع ۱۴

رَافِعَةٌ: بلند کرنیوالی، اونچا کرنیوالی، رَفْعٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، پ ۲۷ ع ۱۴۔

رَأْفَةٌ: ترس، مہربانی، شفقت، رحمت، نرمی رَأَفَ یَرْأَفُ کا مصدر ہے، پ ۱۸ ع ۷، پ ۲۷ ع ۲۰۔

رَاقٍ: افسوں کنندہ، جھاڑنے پھونکنے والا، رُقْیَةٌ سے جس کے معنی افسوں اور جھاڑ پھونک کرنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، پ ۲۹ ع ۱۷۔

رَاٰكَ: اس نے تجھ کو دیکھا، رَاٰی رُؤْیَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو آرٰی اور رَاٰی)، پ ۱۷ ع ۳۔

رَاكِعًا: جھکنے والا، عاجزی کرنیوالا، سجدہ کرنے والا، رکوع کرنیوالا، رُكُوْعٌ سے جس کے معنی انحنار یعنی جھکنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، رکوع کا استعمال کبھی تو نماز کی ہیئت مخصوصہ کے لیے ہوتا ہے اور کبھی تواضع و تذلل یعنی عاجزی اور گڑگڑانے کیلئے خواہ کسی عبادت میں ہو یا غیر عبادت میں، پ ۲۳ ع ۱۱

رَاكِعُوْنَ: رکوع کرنیوالے، عاجزی کرنیوالے، جھکنے والے، رُكُوْعٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ رفع، رَاكِعٌ کی جمع، پ ۶ ع ۱۲، پ ۱۱ ع ۳۔

رَاكِعِيْنَ: جھکنے والے، رکوع کرنیوالے، رُكُوْعٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب و جر رَاكِعٌ کی جمع، پ ۱ ع ۵، پ ۳ ع ۱۳۔

رَانَ: اس نے زنگ پکڑ لیا (ضَرَبَ) رَیْنٌ سے جس کے معنی زنگ آلود ہونے اور میل پکڑنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۳۰ ع ۸۔

له موضح القرآن، سورۂ آل عمران۔

رَأَوْا : انہوں نے دیکھا، رُؤْيَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، رَأَوْا اصل میں رَأَيُوْا تھا، ی متحرک ماقبل اس کا مفتوح، اس یاء کو الف سے بدلا، اب الف اور واؤ دو ساکن جمع ہوئے، الف کو حذف کر دیا ۹/۸، ۱۶/۸، ۲۳/۵، ۲۴/۱۴، ۲۵/۶، ۲۵/۱۲، ۲۹/۱۲ -

رَأَوْا : انہوں نے دیکھا، رُؤْيَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۲/۴، ۱۱/۱۱، ۱۲/۱۴، ۲۰/۱۰، ۲۲/۱۰ -

رَاوَدْتُّنَّ : تم نے گفت و شنید کی، تم نے بہلایا، تم نے پھسلایا، مُرَاوَدَةٌ سے جس کے معنی دوسرے کو کسی کام پر جس کے کرنے کا وہ ارادہ نہ رکھتا ہو، پھسلانے، آمادہ کرنے اور اس کے متعلق گفت و شنید کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع مؤنث حاضر۔

راغب لکھتے ہیں :۔

والمراودة ان تنازع	مرادہ یہ ہے کہ تمہاری اپنے غیر
غيرك في الارادة	سے ارادہ میں نزاع ہو، تم اس بات کی
فتريد غير ما يريد	خواہش کرو جو وہ نہیں چاہتا یا تم بسہولت
او ترود غير ما	اس چیز کے طالب ہو جس کا وہ
يرود -	بسہولت طالب ہو۔

۱۲/۱۲ -

رَاوَدَتْنِيْ : اس نے مجھے پھسلایا، اس نے مجھ سے گفت و شنید کی، اس نے مجھ سے خواہش کی، رَاوَدَتْ مُرَاوَدَةٌ سے، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ن وقایہ، ی ضمیر واحد متکلم، ۱۲/۱۲ -

رَاوَدْتُّ : میں نے اس کو پھسلایا، میں نے اس سے گفت و شنید کی، رَاوَدْتُّ مُرَاوَدَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، ۱۲/۱۲، ۱۲/۱۴ -

رَاوَدَتْهُ : اس (عورت) نے اس کو پھسلایا، اس نے اس کو بہلایا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، ۱۲/۱۲ -

رَاوَدُوْهُ : انہوں نے اس سے گفت و شنید کی، انہوں نے اس کو پھسلایا، رَاوَدُوْا مُرَاوَدَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ۲۷/۹ -

رَأَوْكَ : انہوں نے تجھ کو دیکھا، اس میں كَ ضمیر واحد مذکر حاضر ہے (ملاحظہ ہو رَأَوْا) ۹/۲ -

رَأَوْهُ : انہوں نے اس کو دیکھا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، ۲۱/۸، ۲۶/۳، ۲۹/۲ -

رَأَوْهَا : انہوں نے اس کو دیکھا، اس میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، ۲۹/۲ -

رَأَوْهُمْ : انہوں نے ان کو دیکھا، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۳۰/۸ -

رَآهُ : اس نے اس کو دیکھا، رَأَى رُؤْيَةٌ سے

ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ہ ضمیر واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو رَأَى) پ۱۹/۱۸، پ۲۲/۱۴، پ۲۳/۹، پ۲۷/۵، پ۳۰/۲،۱۶۔

رَاٰهَا: اس نے اس کو دیکھا، اس میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، پ۱۹/۱۶، پ۲۰/۲۔

رَأْيَ: دیکھنا، رَأَى يَرَى کا مصدر ہے نیز غلبہ ظن کی بنا پر نقیضین[1] میں سے کسی ایک پر نفس کے اعتقاد کا نام "رائے" ہے، اس کی جمع آراء ہے، پ۱۲/۳۔

رَاٰی: اس نے دیکھا، رُؤْيَةٌ اور رَأْيٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، رُؤْيَةٌ کے معنی ادراکِ مرئی کے ہیں اور نفس کے مختلف قوی کے اعتبار سے اس کی مختلف قسمیں ہیں، اول آنکھ سے یا ایسی چیز سے جو آنکھ کے قائم مقام ہو، دیکھنا جیسے لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ (البتہ تم دیکھو گے دوزخ کو پھر دیکھو گے دوزخ کو یقین کی آنکھ سے) یعنی بچشم سر دیکھو گے اور فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ (پس اب اللہ دیکھے گا تمہارے کام) آنکھ کے دیکھنے سے بھی بڑھکر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ذرہ ذرہ کو دیکھتا ہے مگر اس کو آنکھوں کی احتیاج نہیں، دوسرے بذریعہ وہم وخیال جیسے وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا (اور کبھی تو دیکھے جس وقت جان لیتے ہیں کافروں کی) کہ یہاں دیکھنے سے اس وقت کا خیال کرنا مراد ہے، تیسرے بذریعہ تفکر جیسے إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ (میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے) یعنی میں اس تفکر میں ہوں جس میں تم نہیں، چوتھے بذریعہ عقل جیسے مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ (جھوٹ نہیں کہا دل نے جو دیکھا) کہ یہاں رؤیت بذریعہ عقل ہے نیز جب رَاٰی کا تعدیہ دو مفعولوں کی طرف ہوگا تو علم کے معنی کا مقتضی ہوگا جیسے وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ (اور جانتے ہیں وہ لوگ کہ جن کو علم دیا گیا ہے)[2]، پ۲۲/۵۔

رَأَيْتُ: میں نے دیکھا، رُؤْيَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم، یہاں خواب میں دیکھنے کا مذکور ہے، بیداری کی حالت میں دیکھنے اور بحالتِ خواب دیکھنے میں یہ فرق ہے کہ بیداری میں حقیقۃً بذریعہ بصر اس شئے کا ادراک ہوتا ہے اور خواب میں اس شئے کا تصور قلب میں ہوتا ہے اس توہم پر کہ بذریعہ حاسۂ بصر اس کا ادراک ہو رہا ہے حالانکہ بذریعہ حاسہ ادراک نہیں ہوتا[3]، پ۱۲/۱۱۔

رَأَيْتَ: تو نے دیکھا، رُؤْيَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر أَرَأَيْتَ (کیا تو نے دیکھا، بھلا تو نے دیکھا) میں الف اولیٰ لفظاً استفہام تقریر وتنبیہ کیلئے ہے محض استفہام کیلئے نہیں ہے۔[4]

[1] کلام میں وہ دو باتیں کہ ایک کے صحیح ہوتے دوسری صحیح نہ ہوسکے، نقیضین کہلاتی ہیں، مثلاً کسی ایک ہی چیز کے متعلق یہ کہنا کہ وہ سپید ہے اور وہ سپید نہیں، باہم نقیضین ہیں۔

[2] مفردات امام راغب۔ [3] التحفۃ النظامیۃ فی الفروق الاصطلاحیۃ للشیخ علی اکبر النجفی طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ۱۳۴۰ھ۔ [4] کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم لابن خالویہ ص ۲۰۱ طبع دار الکتب المصریۃ ۱۳۶۰ھ۔

امام راغب لکھتے ہیں :-

"اَرَاَیْتَ اَخْبِرْنِیْ (تو مجھے بتا) کے قائمقام ہوتا ہے اور اس پر کاف داخل ہوتا ہے اور تا کو تثنیہ جمع اور تانیث میں اسی کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور تغیر و تبدل کاف پر ہوتا ہے تا پر نہیں ہوتا ارشاد ہے اَرَاَیْتَکَ ھٰذَا الَّذِیْ، قُلْ اَرَاَیْتَکُمْ"

۵/۶، ۷/۱۴، ۱۵/۲۱، ۱۶/۸، ۱۹/۲،۱۵، ۲۵/۱۹، ۲۶/۷، ۲۷/۷، ۳۰/۲۱،۲۲، ۳۴/۳۵۔

رَاَیْتَکَ : تونے دیکھا، یہاں اَرَاَیْتَکَ (آیا تونے دیکھا، بھلا دیکھ تو) ہے۔ اس میں الف بلفظِ استفہام تنبیہ کے معنی میں ہے اور رَاَیْتَ رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر ہے اور کَ ضمیر واحد مذکر حاضر خطاب کے لئے ہے۔ امام اللغۃ علامہ ابنِ خالویہ لکھتے ہیں کہ :

"اس کاف میں جو تا کے بعد ہے تین اقوال ہیں، کسائی کے قول میں موضع نصب میں ہے اس کی تقدیراً اَرَاَیْتَ نَفْسَکَ ہے اور فرا کے قول میں موضعِ رفع میں ہے اور تقدیراً اَرَاَیْتَ اَنْتَ نَفْسَکَ ہے اور اہلِ بصرہ کے قول میں کاف کا کوئی موضع نہیں بلکہ تاکیدِ خطاب کے لئے آیا ہے جس طرح کہ ذَاکَ اور ذٰلِکَ کہا جاتا ہے۔"[1] ۱۵/۱

رَاَیْتَکُمْ : تم نے دیکھا، یہاں اَرَاَیْتَکُمْ (دیکھو تو، کیا دیکھا ہے تم نے !) ہے، اس میں ہمزہ بلفظِ استفہام تنبیہ کے معنی میں ہے، رَاَیْتَ صیغہ واحد مذکر حاضر ہے اور کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر خطاب جمع کے لئے ہے۔ علامہ ابن الشجری نے امالی میں تصریح کی ہے کہ اَرَاَیْتَکُمْ وغیرہ میں جو تا کو فتحہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ تذکیر، تانیث کی اصل ہے اور توحید تثنیہ و جمع کی، پس جب صیغہ واحد مذکر حاضر کو فتحہ تا سے مخصوص کر کے تا کو خطاب سے مجرد کر لیا گیا اور کاف اور جو کاف پر زیادہ کیا گیا ہے مثلاً کُمَا، کُمْ اور کُنَّ خطاب کے لئے مستقل ہو گیا تو تا کیلئے حرکتِ اصلیہ کو لازم کر دیا گیا۔[2] ۱۰/۱۰،۱۱۔

رَاَیْتُمْ : تم نے دیکھا، رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر اَرَاَیْتُمْ اور اَفَرَاَیْتُمْ میں ہمزہ بلفظِ استفہام تنبیہ کے معنی میں ہے، ۶/۴۱، ۱۰/۱۱،۱۱، ۱۲/۳، ۸،۹

۱۹/۹، ۲۰/۱۰، ۲۲/۱۲، ۲۴/۱، ۲۵/۱، ۲۶/۱، ۲۷/۵،۱۵، ۲۹/۲۔

رَاَیْتُمُوْہُ : تم نے اس کو دیکھا، اس میں واؤ اشباع کا اور ہُ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، ۳/۵۔

رَاَیْتَہٗ : تو نے اسکو دیکھا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، (ملاحظہ ہو رَاَیْتَ) ۲۷/۹۔

---

[1] اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم، ص ۲۰۲۔

[2] ملاحظہ ہو امالی ابن الشجری، ج ۱، ص ۲۹۹، طبع دائرۃ المعارف۔

رَاَیْتَھُمْ: تونے ان کو دیکھا، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۱۶/۱۴، ۲۱/۱۸، ۲۵/۱۲، ۲۹/۱۹۔

رَاَیْتُھُمْ: میں نے ان کو دیکھا، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو رَاَیْتُ) ۱۲/۱۱۔

رَاَیْنَهٗ: ان عورتوں نے اس کو دیکھا، رَاَیْنَ رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مؤنث غائب، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، ۱۲/۱۴۔

فصل الباء الموحدة

رَبٌّ: پروردگار، مالک، صاحب، یہ اصل میں رَبَبٌ یَرُبُّ کا مصدر ہے جس کے معنی تربیت کے ہیں اور پھر مبالغہ کے لئے عَدْلٌ کی طرح بطورِ وصف استعمال کیا جانے لگا اور بعض کا قول ہے کہ بَرٌّ کی طرح صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے، امامِ راغب کا بیان ہے کہ رَبٌّ مصدر ہے جو فاعل کے لئے مستعار ہے۔ تربیت کی تعریف امامِ موصوف نے ان الفاظ میں کی ہے ھو انشاء الشیئ حالاً فحالاً الی حد التمام یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے ایک حالت سے دوسری حالت میں اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ حدِ کمال تک پہنچ جائے، اس معنی کے اعتبار سے امامِ حلیمی نے جو رَبٌّ کی تعریف کی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں درجِ ذیل ہے

امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں رقمطراز ہیں:۔

قال الحلیمی رحمہ اللّٰہ	حلیمی رحمہ اللّٰہ نے رب کے
فی معنی الرب ھو	معنی میں فرمایا ہے کہ رب وہ
المبلغ کل ما ابدع	ہے جو ہر اس چیز کو جسے اس نے
حد کمالہ الذی	ایجاد کیا ہے کمال کی اس حد
قدرہ فھو یسیل	تک پہنچا دیتا ہے کہ جو حد اس
النطفۃ من الصلب	چیز کیلئے اس نے مقدر فرما دی
ثم یجعلھا علقۃ ثم	ہے پس وہ نطفہ کو پشت سے
العلقۃ مضغۃ ثم	نکالتا، پھر اسکو پھٹکی بناتا
یخلق المضغۃ عظاما	پھر پھٹکی کو بوٹی پھر بوٹی
ثم یکسو العظم لحما	سے ہڈیاں پیدا کرتا پھر
ثم یخلق فی البدن	ہڈیوں پر گوشت چڑھاتا
الروح ویخرجہ	پھر بدن میں جان ڈالتا
خلقا اٰخر وھو	اور اسکو ایک نئی صورت
صغیر ضعیف فلا	میں جبکہ وہ ناتواں بچہ ہوتا
یزال ینمیہ وتنشیہ	ہے نکال کھڑا کرتا اور برابر
حتی یجعلہ رجلا	اس کو نشوونما کرتا رہتا ہے
ویکون فی بدئ	یہانتک کہ اسکو پورا مرد کر دیتا ہے
امرہ شابا ثم	اور ابتداء حال میں وہ جوان ہوتا
یجعلہ کھلا ثم	ہے پھر اسکو ادھیڑ پھر بوڑھا
شیخا وھکذا کل	بنا دیتا ہے اور جو چیز بھی اس نے

لہ مفردات۔

شیئ خلقه فهو — پیدا کی اس کا یہی طور ہے پس

القلم علیه والمبلغ — رب وہ ہے جو اسکا نگران اور

ایاه الحد الذی — اس حد پر اسکو پہنچانیوالا ہو جو

وضعه وجعل — حد کہ اس کے لئے اس نے

نهایته و مقدارا — مقرر کی اور اس کی نہایت و

له — مقدار قرار دی ہے۔

ابن خالویہ لغوی نے تصریح کی ہے کہ رب کے معنی لغت میں سید اور مالک کے ہیں[1]، امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں امام خطابی سے ناقل ہیں کہ :-

"بہت سے مفسرین سے آیۂ کریمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی تفسیر میں مروی ہے کہ رب کے معنی سید (سردار) کے ہیں اور یہ معنی اس وقت بن سکتے ہیں جب کہ ہم عالمین کے معنی جماد کو چھوڑ کر ممیزین یعنی ذوی العقول کے قرار دیں کیونکہ جس طرح سید الناس کہا جاتا ہے اسی طرح سید الشجر والجبال وغیرہ کہنا درست نہیں ہے اور اسی معنی میں ارشادِ الٰہی ہے اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ (پھر جا اپنے آقا کے پاس اور اس سے پوچھ کیا حقیقت ہے ان عورتوں کی جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے) کہ یہاں رب بمعنی سید (آقا، خاوند) ہے اور بعض کا قول ہے کہ رب یعنی مالک ہے اور اس اعتبار سے اضافت بر بنائے عموم درست ہے اور بہت سے علماء اس طرف گئے ہیں کہ اسم عالم تمام کائنات کے لئے بولا جاتا ہے ان کا استدلال اس آیتِ کریمہ سے ہے قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا اِنْ کُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ ۔ (بولا فرعون کیا معنی جہان کا صاحب، موسٰی نے کہا صاحب آسمان اور زمین کا اور جو ان کے بیچ میں ہے اگر تم یقین کرو)"[2]

امامِ راغب نے لکھا ہے :-

"رَبّ' مطلقاً (یعنی جب بغیر کسی شرط کے استعمال ہو) سوائے اللہ تعالیٰ کے جو مصالح موجودات کا کفیل ہے' اور کسی کے لئے نہیں بولا جاتا چنانچہ ارشاد ہے بَلْدَةٌ طَیِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ (دیس ہے پاکیزہ اور رب ہے گناہ بخشتا) اور اسیطرح اللہ کا قول ہے وَلَا یَاْمُرَکُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِکَةَ وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا (اور نہیں لائق کہ تم کو حکم کرے کہ ٹھہراؤ فرشتوں کو اور نبیوں کو رب) یعنی انہیں معبود قرار دو اور خالق اور مسبب الاسباب اور بندوں کی مصلحتوں کا کفیل سمجھو۔

---

[1] کتاب الاسماء والصفات ص ٥٦، طبع انوار احمدی الہ آباد۔

[2] کتاب اعراب ثلاثین سورة من القرآن الکریم، ص ٢١۔

[3] کتاب الاسماء والصفات، ص ٥٦۔

اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے
بھی بولا جاتا ہے اور غیر اللہ کے لئے بھی آتا ہے جیسے
ارشاد ہے رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (سارے جہان کا صاحب)
اور رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ (صاحب
تمہارا اور صاحب تمہارے اگلے باپ دادوں کا)
اور ربُّ الدار (گھر والا) اور ربُّ الفرس (گھوڑے
والا) ان دونوں کے مالک کے لئے بولا جاتا ہے
اور اس معنی میں ارشادِ الٰہی ہے اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ
رَبِّكَ فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ
(میرا ذکر کیجیو اپنے بادشاہ کے پاس سو بھلا دیا شیطان
نے ذکر کرنا اپنے بادشاہ سے) اور ارشاد ہے اِرْجِعْ
اِلٰى رَبِّكَ (پھر جا اپنے بادشاہ کے پاس)۔
آیہ کریمہ (قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ
مَثْوَايَ (اس نے کہا خدا کی پناہ وہ مالک ہے میرا
اچھی طرح رکھا ہے مجھ کو) میں بعض کا قول ہے کہ
رب سے اللہ تعالیٰ مراد ہے اور بعض کہتے ہیں کہ
وہ بادشاہ مراد ہے جس نے ان کی تربیت کی تھی
اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قول کے زیادہ
مناسب پہلے معنی ہیں"۔ اَرْبَابٌ جمع۔

۱: ۱۵، ۱۶ — ۳: ۱۲، ۱۳ — ۶: ۸، ۹ — ۷: ۱۱، ۱۵ — ۸: ۷، ۱۴، ۱۵، ۱۶ — ۹: ۳، ۴، ۷ و
۹: ۸ و ۹ — ۱۱: ۵، ۶، ۹ — ۱۲: ۴، ۱۴ — ۱۳: ۵، ۸، ۱۸ — ۱۴: ۳ — ۱۵: ۳، ۹، ۱۲ و ۱۴ — ۱۶: ۴، ۷، ۱۰
۱۶: ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۱۶ — ۱۷: ۲، ۵، ۶، ۷ — ۱۸: ۲، ۳، ۵، ۹ — ۱۹: ۱، ۶، ۷، ۹، ۱۰ و ۱۱ و
۱۹: ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸ — ۲۰: ۳، ۵، ۶، ۷، ۱۵ — ۲۱: ۱۴ — ۲۲: ۸ — ۲۳: ۲، ۵،
۲۳: ۷، ۸، ۹، ۱۲، ۱۴ — ۲۴: ۵، ۱۲، ۱۶ — ۲۵: ۱۱، ۱۳، ۱۴، ۲۰ — ۲۶: ۲، ۱۸ — ۲۷: ۷ و ۱۱ و
۲۷: ۱۶ — ۲۸: ۵، ۱۴، ۲۰ — ۲۹: ۶، ۸، ۹، ۱۰، ۱۳ — ۳۰: ۲، ۶، ۸، ۱، ۳، ۳۸ و ۳۹

رَبًّا ث (ملاحظہ ہو اَرْبَابًا)۔

رِبًا: بیاج، سود۔ امام راغب لکھتے ہیں:۔
"رأس المال (اصل سرمایہ) پر جو زیادتی ہو وہ "ربا"
ہے لیکن شرع میں وہ اس زیادتی کے ساتھ مخصوص
ہے جو ایک خاص ہی طریقہ پر ہو اور دوسری طرح
نہ ہو"

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:۔
"الربا مقصور ہے اور مد بھی بیان کیا گیا ہے
جو شاذ ہے، یہ رَبَا یَرْبُوْ سے ہے اور الف کے ساتھ
لکھا جاتا ہے لیکن قرآن کے رسم الخط میں واؤ کے
ساتھ واقع ہے اور "ربا" کی اصل زیادت ہے خواہ نفس
شے میں ہو جیسے ارشادِ الٰہی ہے اِهْتَزَّتْ وَرَبَتْ
(وہ لہلہائی اور بڑھی) یا مقابلہ میں جیسے دو درہم کے
بدلہ ایک درہم۔ اب بعض کا قول تو یہ ہے کہ یہ دونوں
معنی میں حقیقت ہے اور بعض کہتے ہیں کہ پہلے میں
حقیقت ہے اور دوسرے میں مجاز۔ ابن سریج
کہتے ہیں کہ یہ دوسرے معنی میں حقیقتِ شرعیہ ہے

نیز ربا کا اطلاق ہر بیع حرام پر بھی ہوتا ہے۔" [1]

حضرت الاستاذ فقیہ النفس علامہ محمود حسن خاں صاحب ٹونکی صاحب معجم المصنفین فرماتے ہیں:

"ربا اور بیع لغاتِ عرب سے ہے جب تک کوئی اصطلاحِ شرعی توقیفی خلافِ لغت کے مغیر نہ ہو کتاب و سنت کے معنی لغتِ عرب سے معلوم ہوتے ہیں 'ربا' لغۃً زیادۃ ہے اور لسان العرب وغیرہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ حقیقت 'بیع' کی معاہدہ فی تعاوض الاموال ہے پس لغوی اعتبار سے ربا کی تعریف یہ ہے کہ تعاوض الاموال کے معاہدہ میں عوضین مماثلین سے ایک عوض کا دوسرے عوض پر زیادۃ مذکور ہونا یا عوضین میں سے عوضِ دین پر زیادۃ مذکور ہونا اور جب معاہدہ میں زیادۃ مذکور رہوئی تو اس زیادۃ کا نام عرب میں 'ربا' ہے وھو المتعامل فیما بین الناس اور معاہدہ میں مذکور ہونے کی وجہ سے اس کو مشروط کہا جائیگا کسائر شروط البیع والمعاوضات۔

باجماعِ امت 'ربا' دو قسم ہے ایک حسی جس کو کتاب اللہ نے لاتاکلوا الربوا اضعافا مضاعفۃ میں بیان فرمایا ہے اور حدیث صحیح الفضل ربًا میں اسی حسی ربا کو بیان کیا گیا ہے اور حدیث فلا یاخذن الا مثلا بمثل (بروایۃ مسلم عن فضالۃ) اور حدیث لاتاخذوا الدینار بالدینارین ولا الدرھم بالدرھمین (طبرانی عن ابن عمر) بھی بحق ربا کتاب اللہ کی تفسیر ہے اور تفسیر اضعافا کے تحت داخل ہے، حدیث بخاری بھی ربا حسی کی مفسر ہے الذھب بالذھب مثلا بمثل والورق بالورق مثلا بمثل (رواہ البخاری) یعنی فضل ربا ہے پس اس حسی ربا میں شارع نے لغوی معنی میں اور شرعی معنی میں مغایرت پیدا نہیں فرمائی ہے پس حسی ربا شرعی کی بھی وہی تعریف ہے جس کی عربی عبارت یہ ہے ھو الفضل الخالی عن العوض المشروط فی البیع۔

دوسرا ربا حکمی ہے کہ حسًا تفاضل عوضین میں نہیں ہے لیکن شارع نے سدًا للباب لربا صورتِ تماثل کو بھی ربا حسی کے حکم میں قرار دیا ہے جبکہ معاوضہ یدًا بید نہ ہو کیونکہ مادہ ربا کا تاخیر و تاجیل ہے اور بغیر تاخیر کے فضل غیر متعامل ہے، اسی معنی پر محمول ہے حدیث مسلم کی لاربا فیما کان یدا بید، فضل حسی کا دروازہ اسی ربا حکمی سے مفتوح ہے کہ تجارت حاضرہ میں فضل حسی عادۃً ناممکن ہے، اس ربا حکمی کو شارع نے حدیث نہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع دینارا اور حدیث الذھب بالورق ربًا

[1] فتح الباری، ج ۴، ص ۲۶۴ (طبع میریہ مصر)

لاھاء ولاھاء الحدیث فی الاشباہ السنۃ المنقص میں بیان فرمایا ہے اس ربا شرعی پر لغوی ربا صادق نہیں ہے۔" [1]

حضرت الاستاذ مدظلہم نے ربوٰ کے موضوع پر ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے جس میں ربا کی حقیقت شرعیہ پر نہایت مجتہدانہ اور سیر حاصل بحث ہے اس عہدِ ضلالت میں جبکہ ربوٰ کی حقیقت شرعیہ کے سمجھنے میں عوام تو عوام خواص کو غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں اس رسالہ کا بغور مطالعہ ان تمام غلط فہمیوں کے ازالہ کا ضامن ہے [2]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں رقمطراز ہیں :-

" ربا وہ قرض ہے جو اس شرط پر ہو کہ قرضدار قرض خواہ کو جتنا لیا ہے اس سے زیادہ یا اس سے اچھا واپس ادا کرے۔" [3]

اور بعد چند سطور کے ارقام فرماتے ہیں :-

" واضح رہے کہ ربا کی دو صورتیں ہیں حقیقی اور محمول بر حقیقی، لیکن حقیقی ربا تو وہ دیون میں ہوتا ہے اور ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس میں معاملات جس غرض کے لئے وضع کئے گئے ہیں وہ غرض الٹ جاتی ہے، لوگ زمانۂ جاہلیت میں اس کے اندر بہت منہمک تھے اس کے باعث وسیع جنگیں پیش آئی ہیں اور یہ تھوڑا سا بھی بہت کی دعوت دیتا ہے پس اس کا دروازہ سرے سے مسدود کرنا واجب ہے چنانچہ قرآن میں اس کے بارے میں جو اترنا تھا اتر چکا۔

دوسرے ربا الفضل (یعنی تجارت میں بڑھتی لینا) اور اصل اس بارے میں حدیث مستفیض الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ و البر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواءً بسواءٍ یداً بید فاذا اختلف الاصناف فبیعوا کیف

---

[1] ملاحظہ ہو "صدارت کے استفسار کا جواب مسئلۂ ربوٰ میں" ص ۱۱۳ و ۱۱۴

[2] اس رسالہ کی تصنیف دفتر صدارت عالیہ محکمۂ امور مذہبی حیدرآباد دکن سے شائع کئے ہوئے ایک استفسار کے جواب میں جو ربا القرض کے متعلق ہے عمل میں آئی ہے اور چونکہ جواب مجتہدانہ مطلوب تھا اس لئے حسب فرمائش سلیقۂ اجتہاد پر ہی جواب تحریر کیا گیا، حضرت الاستاذ مدظلہم العالی کی فقہ و اصول میں جو مجتہدانہ شان ہے اور اس کا اندازہ علماء کو اس کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے یہ رسالہ ۱۴۳ صفحے پر مشتمل ہے اور ۱۳۴۳ھ میں دستی پریس کے ذریعہ طبع ہو کر حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکا ہے۔

[3] حضرت الاستاذ فرماتے ہیں "یہ تعریف ربا کی بالکل صحیح اور جامع تعریف ہے اس لئے کہ قرض لغت عرب میں دین ہے، لسان العرب، صحاح، مصباح وغیرہ سے ثابت ہو چکا ہے اور جملہ دیون کو لفظ قرض شامل ہے۔" ص ۳۴ -

شئتم اذا کان یدا بید (جیسے سونے کو سونے سے اور چاندی کو چاندی سے اور گیہوں کو گیہوں سے اور جو کو جو سے اور کھجور کو کھجور سے اور نمک کو نمک سے جتنا ایک اتنا دوسرا برابر سرابر ہاتھوں ہاتھ، اور جب جنسیں مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو بشرطیکہ ہاتھوں ہاتھ ہو) سے یہ ربا الفضل، ربا حقیقی سے مشابہت کی بنا پر تغلیظاً ربا سے موسوم ہے جس طرح کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے منجم کو کاہن فرمایا ہے اور اسی سے لا ربا الا النسیئۃ (ربا نہیں مگر نسیئہ یعنی دین ہیں) کے معنی سمجھے جا سکتے ہیں پھر شریعت میں ربا کا استعمال اس معنی میں کثرت سے ہوا یہاں تک کہ وہ اس معنی میں بھی حقیقت شرعیہ بن گیا، واللہ اعلم[1]

ایامِ جاہلیت میں ربا کا جس طور معمول تھا اس کے متعلق امامِ مالک، زید بن اسلم سے جو مشہور تابعی ہیں، ناقل ہیں کہ انہوں نے بیان کیا جاہلیت میں ربا یہ تھا کہ ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ ایک مدتِ معینہ کے لیے حق (واجب الادا) ہوتا پس جب مدت پوری ہو چکتی تو کہتا کہ تو ادا کرتا ہے یا زیادہ کرتا ہے، اب اگر وہ ادا کر دیتا تو اس کو لے لیتا ورنہ اپنا حق زیادہ کر دیتا اور مہلت میں تاخیر کر دیتا[2]

امام طبری نے عطا اور مجاہد سے اسی کے قریب قریب روایت کیا ہے نیز قتادہ سے نقل کیا ہے کہ جاہلیت میں ربا کا یہ دستور تھا کہ ایک شخص مدتِ معینہ پر سودا بیچتا، جب مدت پوری ہو جاتی اور خریدار کے پاس ادا کرنے کیلئے نہ ہوتا تو یہ رقم زیادہ کر دیتا اور مدت کو مؤخر کر دیتا[3] ۲ بـ۱۲

رِبَاطِ : باندھنا، سرحد پر چوکی دینا، یہ باب مفاعلت کا مصدر ہے اور مجرد میں رَبْطٌ کا بھی جس کے معنی مضبوط اور مستحکم باندھنے کے ہیں، نیز اسم بھی آتا ہے اس شے کے معنی میں جس کے ساتھ دل یا گھوڑے باندھے جائیں اور اس جگہ کے معنی میں بھی جہاں دشمن کے دفاع کے لیے لشکر کا پڑاؤ ہوتا ہے جیسے مورچہ اور چھاؤنی یہاں اس کا استعمال مصدر ہی کے معنی میں یعنی گھوڑے باندھنے کے ہوا ہے (ملاحظہ ہو رابِطُوا) ۳ بـ۴ ـ

رُبٰعَ : چار چار، یہ اَرْبَعَۃٌ اَرْبَعَۃٌ سے معدول ہے اور چونکہ اس میں دو عدل ہیں ایک اس کے صیغہ سے دوسری اس کی تکرار سے اس لئے غیر منصرف ہے، یہ علامہ زمخشری کی رائے ہے اور قاضی بیضاوی کے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ص ۸۰ (طبع مصر ۱۳۲۲ھ)

[2] مؤطا مع شرح تنویر الحوالک ج ۲ ص ۱۶۳ (طبع دار احیاء الکتب العربیہ، ۱۳۴۳ھ)

[3] فتح الباری، ج ۴، ص ۲۶۴۔

خیال میں بنا بر عدل و وصف غیر منصرف ہے، وہ کہتے ہیں، دباع مبنی بر صفت ہے اگرچہ اس کی اصل وصف پر مبنی نہیں ہے[1]، ۱۲، ۱۳/۲۲۔

رَبَّانِيُّوْنَ: زاہد، خدا پرست، درویش، اللہ والے مربی، مرشدِ خلق، رَبَّانِيٌّ کی جمع بحالتِ رفع۔

امام راغب لکھتے ہیں:-

"رَبَّانِيٌّ کے متعلق بعض کا قول ہے کہ وہ رَبَّان کی طرف منسوب ہے اور لفظِ فعلان فَعِلَ (بکسر العین) سے بنایا جاتا ہے جیسے عطشان اور سکران اور قلت کے ساتھ فَعَلَ (بفتح العین) سے بنتا ہے چنانچہ نعسان آیا ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ ربّ کی طرف منسوب ہے جو مصدر ہے اور ربانی وہ ہے کہ جو علم کی پرورش کرے جیسے کہ حکیم ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ منسوب تو اسی کی طرف ہے جو مصدر ہے اور اس کے معنی ہیں اس شخص کے جو اپنے نفس کی علم کے ذریعہ تربیت کرے اور حقیقت میں یہ دونوں معنی باہم متلازم ہیں کیونکہ جس نے بذریعہ علم اپنے نفس کی پرورش کی اور جس نے علم کی پرورش کی اس نے اس کے ذریعہ اپنے نفس کی پرورش کی، اور بعض کا قول ہے کہ یہ ربّ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے پس جیسے الٰهیٌّ ہے اسی طرح رَبَّانِيٌّ ہے اور نون کی زیادتی اس میں ایسی ہے جیسی کہ اہلِ عرب لحیانی اور جسمانی کے بولتے وقت کرتے ہیں، حضرت علی کا قول ہے انا ربانی هٰذه الامة (میں اس امت کا ربانی ہوں)، جمع رَبَّانِيُّوْنَ ہے اور بعض کا قول ہے کہ لفظِ رَبَّانِيٌّ اصل میں سریانی ہے اور یہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ اہلِ عرب کے کلام میں قلیل الوجود ہے۔" ۱۳/۱۱، ۶۔

رَبَّانِيِّيْنَ: زاہد، خدا پرست، درویش، اللہ والے مربی، مرشدِ خلق، رَبَّانِيٌّ کی جمع بحالتِ نصب و جر، ۳/۶۔

رَبَآئِبُكُمْ: تمہاری جوروؤں کی لڑکیاں، رَبَآئِبُ رَبِيْبَةٌ کی جمع جس کے معنی اس زیرِ پرورش لڑکی کے ہیں جو اگلے شوہر سے ہو، مضاف ہے کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، ربیبہ کو ربیبہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ماں کے دوسرے شوہر کے آغوشِ تربیت میں ہوتی ہے، ۴/۱۵۔

رَبَتْ: وہ بڑھی، وہ پھولی، وہ ابھری (نَصَرَ) رَبْوٌ سے جس کے معنی بڑھنے، پھلنے اور بلند ہونے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۱۷، ۱۴/۱۸، ۱۹۔

رَبِحَتْ: وہ سود مند ہوئی، اس نے فائدہ دیا، اس نے نفع دیا (سَمِعَ) رِبْحٌ سے جس کے معنی نفع دینے اور

[1] الکمالین علی الجلالین، شیخ سلام اللہ، ص ۱۳، ضمیر ص ۷، ۶ (طبع نولکشور)

سود مند ہونے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ۱ ۲۔

رَبَطْنَا: ہم نے گرہ دی، ہم نے باندھ دیا، (ضَرَبَ) رَبْطٌ سے جس کے معنی باندھنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع متکلم، پ۱۵ ۱۴، پ۲۰ ۴۔

رُبُعُ: چوتھائی حصہ، چہارم، اسم ہے، اَرْبَاعٌ جمع، پ۴ ۱۳۔

رَبُّكَ: تیرا رب، تیرا پروردگار، تیرا مالک، تیرا صاحب، رَبٌّ مضاف، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، جیسے ارْجِعْ إِلٰى رَبِّكَ (پھر جا اپنے بادشاہ کے پاس) اور اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ (میرا ذکر کیجو اپنے بادشاہ کے پاس) میں رَبّ بمعنی بادشاہ، سردار اور آقا کے ہے،

پ۱ ۴،۷،۸ — پ۲ ۱،۲۰ — پ۳ ۱۲،۱۳،۱۴ — پ۵ ۶ — پ۶ ۸،۱۳،۱۴ — پ۷ ۵،۶،۱۰ — پ۸ ۱۹،۱۱ — پ۹ ۱۰،۲۰

پ۸ ۳،۵،۷ — پ۹ ۶،۹،۱۱،۱۲،۱۴،۱۵،۱۶،۱۷ — پ۱۱ ۷،۹،۱۲،۱۵ — پ۱۲ ۲،۶،۷،۱۰

پ۱۲ ۱۰،۱۱،۱۵،۱۶،۱۷ — پ۱۳ ۷،۹ — پ۱۴ ۲،۳،۶،۱۰،۱۵،۲۰،۲۱،۲۲ — پ۱۵ ۲،۳،۲۴

پ۱۵ ۵،۶،۷،۹،۱۰،۱۶،۱۸،۲۰ — پ۱۶ ۳،۴،۷،۸،۱۰،۱۱،۱۷ — پ۱۷ ۲،۳،۱۳

پ۱۷ ۱۴،۱۶ — پ۱۸ ۴،۱۷ — پ۱۹ ۳،۵،۶،۸،۹،۱۰،۱۱،۱۲،۱۳،۱۴ — پ۲۰ ۲،۳

پ۲۰ ۷،۸،۹،۱۰،۱۲،۱۳ — پ۲۱ ۱۴،۱۶،۱۷ — پ۲۲ ۷،۸ — پ۲۳ ۹،۱۰،۱۴ — پ۲۴ ۶،۱۱،۱۹

پ۲۴ ۲۰ — پ۲۵ ۳،۹،۱۱،۱۳،۱۴،۱۶،۱۸ — پ۲۶ ۱۷،۱۹ — پ۲۷ ۱،۳،۴،۶،۷

پ۲۷ ۱۲،۱۳،۱۵،۱۶ — پ۲۹ ۳،۴،۵،۶،۱۳،۱۴،۱۵،۱۷،۲۰ — پ۳۰ ۲،۳

پ۳۰ ۷،۹،۱۰،۱۲،۱۴،۱۸،۱۹،۲۱،۲۴،۲۶،۳۰،۳۲،۳۳،۳۵۔

رَبُّكِ: تیرا رب، تیرا پروردگار، تیرا مالک، رَبٌّ مضاف، كِ ضمیر واحد مؤنث حاضر مضاف الیہ، پ۱۶ ۵، پ۲۶ ۱۹، پ۳۰ ۱۴۔

رَبُّكُمْ: تمہارا رب، تمہارا پروردگار، تمہارا مالک، تمہارا صاحب، رَبٌّ مضاف كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ،

پ۱ ۳،۹،۱۳،۱۹،۲۶ — پ۲ ۶،۹،۱۹ — پ۳ ۱۳،۱۹ — پ۴ ۴،۵،۱۱،۱۲ — پ۶ ۳،۴،۱۳

پ۷ ۲،۱۱،۱۹ — پ۸ ۵،۶،۷،۸،۱۲،۱۴،۱۵،۱۶،۱۷،۱۸ — پ۹ ۳،۸،۱۵

پ۹ ۱،۱۱،۱۲،۱۴،۱۵ — پ۱۱ ۶،۹،۱۱،۱۶،۱۷ — پ۱۲ ۳،۵،۸،۱۳،۱۴ — پ۱۳ ۱۴

پ۱۴ ۷،۹،۱۱،۱۲ — پ۱۵ ۱،۲،۳،۴،۶،۷،۹،۱۴،۱۵،۱۶ — پ۱۶ ۵،۱۲،۱۴

پ۱۷ ۵،۶،۸،۱۷ — پ۱۸ ۴ — پ۱۹ ۶،۱۳ — پ۲۱ ۱۳،۱۴ — پ۲۲ ۸،۹،۱۴ — پ۲۳ ۸،۱۰،۱۵،۱۶

پ۲۳ ۱۷ — پ۲۴ ۳،۵،۸،۹،۱۰،۱۱،۱۲،۱۴،۱۷ — پ۲۵ ۳،۶،۷،۱۲،۱۴،۱۸

پ۲۷ ۱۴،۱۹ — پ۲۸ ۷،۱۷،۲۰ — پ۲۹ ۹ — پ۳۰ ۳۔

رَبُّكُمَا: تم دونوں کا رب، تم دونوں کا پروردگار، تم دونوں کا مالک، تم دونوں کا صاحب، رَبٌّ مضاف، كُمَا ضمیر تثنیہ مذکر حاضر، مضاف الیہ، پ۹ ۹، پ۱۶ ۱۱، پ۲۷ ۱۱،۱۲،۱۳۔

رُبَمَا: کسی وقت، بہت وقت، رُبَّ حرف جر ہے اور مَا کافہ ہے اور بعض کے خیال میں نکرہ موصوفہ ہے، امام سیوطی لکھتے ہیں:

• رُبَّ حرف جر ہے اس کے معنی میں آٹھ اقوال ہیں (۱) وہ دائمی طور پر تقلیل کے لئے آتا ہے اکثر علماء اسی پر ہیں (۲) وہ دائمی طور پر تکثیر کے لئے آتا ہے چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ (بہت وقت آرزو کریں گے یہ لوگ جو منکر ہیں کسی طرح ہوتے مسلمان) کیونکہ وہ

کثرت سے اس کی تمنا کریں گے اور اول قول کے قائل یہ کہتے ہیں کہ وہ احوالِ قیامت کی مدہوشیوں میں اس طرح مشغول ہوں گے کہ بہت کم ہوش میں آئیں گے جب اس کی تمنا کریں گے (۳) وہ تقلیل و تکثیر دونوں کے لیے مساوی طور پر آتا ہے (۴) وہ اکثر تقلیل کے لیے آتا ہے اور نادراً تکثیر کے لیے اور یہ بھی اختیاری ہے۔ (۵) اس کے بالکل برعکس (یعنی تکثیر کے معنی میں کثرت سے اور تقلیل کے معنی میں ندرت سے) (۶) ان دونوں معنی میں سے کسی کے لیے اس کی وضع عمل میں نہیں آئی بلکہ حرفِ اثبات ہے جو نہ تکثیر پر دلالت کرتا ہے نہ تقلیل پر اور جو کچھ سمجھا جاتا ہے خارجی طور پر سمجھا جاتا ہے (۷) فخر و مباہات کے مواقع پر تکثیر کے لیے اور دیگر مواقع پر تقلیل کے لئے (۸) مبہم عدد کے لئے خواہ تقلیل ہو یا تکثیر اور رُبَّ کافہ بھی داخل ہوتا ہے جو اس کو عمل جر سے روک کے جملوں پر داخل کرتا ہے، اس صورت میں بیشتر اس کا دخول ایسے جملہ فعلیہ پر ہوتا ہے جس کا فعل ماضی ہو خواہ وہ لفظاً موجود ہو یا معناً، اور آیتِ سابقہ میں وہ مستقبل پر داخل ہوا ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ اس بنیاد پر ہے گویا صور پھونک چکا[1] اور قیامت آگئی (یعنی مستقبل یہاں معنیٰ ماضی ہی ہے) پ ۱۴ / ۱ ۔

رَبَّنَا: ہمارا رب، ہمارا پروردگار، ہمارا صاحب، ہمارا مالک، رَبّ مضاف نا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ،

پ۱: ۱۵، ۱۶ — پ۲: ۹، ۱۷ — پ۳: ۸، ۹، ۱۰، ۱۳ — پ۴: ۶، ۱۶ — پ۵: ۷، ۸ — پ۷: ۱، ۵، ۹ — پ۸: ۳، ۹، ۱۱ — پ۸: ۱۲، ۱۳ — پ۹: ۱، ۶، ۸ — پ۱۱: ۴ — پ۱۳: ۱۸، ۱۹ — پ۱۴: ۱۸ — پ۱۵: ۱۲، ۱۳، ۱۴ — پ۱۶: ۱۱، ۱۳، ۱۷ — پ۱۷: ۱۳، ۱۴ — پ۱۸: ۱، ۶ — پ۱۹: ۲، ۴، ۷ — پ۲۰: ۸، ۹، ۱۰ — پ۲۱: ۱۵ — پ۲۲: ۵، ۸، ۹، ۱۶، ۱۹ — پ۲۳: ۹، ۱۱، ۱۲ — پ۲۴: ۴، ۷، ۱۶، ۱۸ — پ۲۵: ۳، ۷، ۱۲ — پ۲۶: ۲، ۳، ۱۶ — پ۲۸: ۳، ۷، ۲۰ — پ۲۹: ۳، ۱۱، ۱۹ ۔

رِبٰوا: سود، بیاج۔ یہ لفظ تمام قرآن میں با کے بعد واو اور واؤ کے بعد الف سے مرقوم ہے مگر ایک جگہ سورہ الروم میں با کے بعد الف سے لکھا ہوا ہے، قاضی بیضاوی اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں:۔

"چونکہ ایک لغت پر اس میں تفخیم ہے اس لئے صلوٰۃ کی طرح واو سے اس کو لکھا گیا اور واؤ کے بعد الف اس لئے زیادہ کر دیا گیا کہ واؤ جمع سے مشابہ ہے"[2]

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو رِبًا) پ۳: ۵ — پ۴: ۲ — پ۶: ۲ — پ۲۱: ۷ ۔

رَبْوَۃٍ: بلندی، بلند جگہ، ٹیلا، اسم ہے، رِبًا اور رُبُوٌّ سے مشتق ہے، رُبیٰ اور رُبیٰ جمع (ملاحظہ ہو رَابِیًا) پ۳: ۴ — پ۱۸: ۳ ۔

رَبُّہٗ: اس کا رب، اس کا پروردگار، اس کا صاحب،

[1] الاتقان، ۱/۲۰، ص ۱۶۳ (طبع مصر)

[2] تفسیر انوار التنزیل، ج۱، ص ۱۰۳ (طبع مصر)

اس کا مالک، رَبّ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، آیت شریفہ اَمَّا اَحَدُکُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّہٗ خَمْرًا (ایک جو ہے تم دونوں میں سو پلا دیگا اپنے بادشاہ کو شراب) اور فَاَنْسٰہُ الشَّیْطٰنُ ذِکْرَ رَبِّہٖ (سو بھلا دیا اس کو شیطان نے ذکر کرنا اپنے بادشاہ سے) میں رَبّ سے مراد آقا اور بادشاہ ہے ذاتِ باری نہیں۔

پ۱: ۴، ۱۳، ۱۵، ۱۹ پ۳: ۳، ۶، ۷، ۸، ۱۲ پ۷: ۱۰ پ۸: ۱۴، ۱۷ پ۹: ۷ پ۱۱: ۷ پ۱۲: ۲، ۴ و پ۱۲: ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۷ پ۱۳: ۷، ۱۰ پ۱۴: ۴ پ۱۵: ۳، ۹، ۲۰ پ۱۶: ۲، ۳، ۴، ۷، ۱۲، ۱۶، ۱۷ پ۱۷: ۶، ۱۱، ۱۶ پ۱۸: ۶ پ۱۹: ۳ پ۲۱: ۱۵ پ۲۲: ۸ پ۲۳: ۱۱، ۱۳، ۱۵، ۱۷ پ۲۴: ۸ پ۲۵: ۱۴ پ۲۶: ۶ پ۲۷: ۵، ۸، ۱۳ پ۲۸: ۱۹ پ۲۹: ۴، ۱۱، ۱۳، ۲۰ پ۳۰: ۲، ۳، ۴، ۹، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۷، ۲۳، ۲۵۔

رَبُّھَا: اس کا رب، اس کا پروردگار، اس کا مالک، اس کا صاحب، رَبّ مضاف ھا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، پ۳: ۱۴ پ۱۳: ۱۶ پ۲۴: ۶ پ۲۶: ۳ پ۲۸: ۱۳، ۲۰ پ۲۹: ۱۷ پ۳۰: ۹۔

رَبُّھُمْ: ان کا رب، ان کا مالک ان کا پروردگار، ان کا صاحب، رَبّ مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ۔ پ۱: ۱، ۳، ۵، ۸، ۱۶ پ۲: ۱، ۳ پ۳: ۴، ۶، ۱۰، ۱۷ پ۴: ۵، ۸، ۱۱ پ۶: ۵، ۱۳ پ۷: ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۹ پ۸: ۲، ۵، ۶، ۱۷ پ۹: ۹، ۱۵ پ۱۰: ۳، ۹ پ۱۱: ۶ پ۱۲: ۲، ۳، ۵، ۹ پ۱۳: ۷، ۸، ۹، ۱۳، ۱۵، ۱۶ پ۱۴: ۱۲، ۱۳، ۱۹ پ۱۵: ۶، ۱۴، ۱۷، ۲۰ پ۱۶: ۳ پ۱۷: ۹، ۱۴ پ۱۸: ۴ پ۱۹: ۴ پ۲۱: ۲، ۴، ۷، ۱۰، ۱۳، ۱۵ پ۲۲: ۱۰، ۱۵، ۱۷ پ۲۳: ۲، ۳ پ۲۳: ۱۷، ۱۸ پ۲۴: ۵، ۱۶ پ۲۵: ۲، ۳، ۴، ۵، ۱۷، ۲۰ پ۲۶: ۵، ۶، ۱۸ پ۲۷: ۳، ۱۳، ۱۵ پ۲۹: ۴، ۵، ۱۷، ۲۰، ۲۱ پ۳۰: ۸، ۱۶، ۲۲، ۲۳، ۲۵۔

رَبُّھُمَا: ان دونوں کا رب، ان دونوں کا پروردگار، ان دونوں کا صاحب، ان دونوں کا مالک، رَبّ مضاف ھُمَا ضمیر تثنیہ مذکر غائب مضاف الیہ، پ۹: ۱۴ پ۱۶: ۱۔

رَبِّیْ: میرا رب، میرا پروردگار، میرا مالک، میرا صاحب، رَبّ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ۳: ۳، ۱۳ پ۶: ۱۴ پ۷: ۶، ۸، ۱۳، ۱۵ پ۸: ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۵، ۱۶، ۱۷ پ۹: ۱۳، ۱۴ پ۱۱: ۷، ۱۰ پ۱۲: ۴، ۵، ۸، ۹، ۱۴، ۱۵، ۱۷ پ۱۳: ۱۵، ۱۰، ۱۸ پ۱۵: ۱۰، ۱۱، ۱۵، ۱۶، ۱۷ پ۱۶: ۲، ۳، ۵، ۶، ۱۱، ۱۵ پ۱۷: ۱ پ۱۹: ۴، ۶، ۸، ۱۰، ۱۳، ۱۶ پ۲۰: ۴، ۷، ۱۲، ۱۵ پ۲۲: ۱۰، ۱۱، ۱۲ پ۲۳: ۱، ۶، ۷، ۱۲، ۱۶ پ۲۴: ۸، ۹، ۱۲ پ۲۵: ۱، ۳، ۱۲، ۱۴ پ۲۸: ۱۵ پ۲۹: ۱۲ پ۳۰: ۱۴۔

رَبَّیٰنِیْ: ان دونوں نے مجھ کو پالا، ان دونوں نے میری پرورش کی، رَبَّیَا، تَرْبِیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ تثنیہ مذکر غائب ہے الف تثنیہ نون سے قبل محذوف ہے، ن وقایہ، ی ضمیر واحد متکلم، پ۱۵: ۳۔

رِبِّیُّوْنَ: خدا کے طالب، خداپرست، اللہ والے، ہزاروں جماعتیں، رِبِّیٌّ کی جمع جو رَبَّانِیٌّ کی طرح ہے یہ امام راغب کا بیان ہے، امام بخاری نے اس کے معنی جماعتوں کے کئے ہیں اور اس کا واحد رِبِّیٌّ بتایا ہے یہ معنی اصل میں امام لغت ابوعبیدہ سے منقول ہیں[1] اس صورت میں رِبِّیٌّ حسبِ تصریح قاضی بیضاوی

[1] ماخوذ از فتح الباری شرح صحیح بخاری ج ۸ ص ۱۵۵ (طبع مصر)

رِبِّیَّۃ کی طرف بطور مبالغہ منسوب ہے جس کے معنی جماعت کے ہیں[۱]۔

امام بغوی لکھتے ہیں :-

" رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ کے معنی حضرتِ ابنِ عباس، مجاہد اور قتادہ نے جماعاتِ کثیرہ کے بیان کئے ہیں اور حضرتِ ابنِ مسعود نے ہزاروں بتلائے ہیں، کلبی کا قول ہے کہ ایک 'رِبِّیَّہ' دس ہزار کا ہوتا ہے ضحاک ایک ہزار کہتے ہیں اور حسن بصری' فقہا ر و علماء ترجمہ کرتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ رِبِّیُّوْن اتباع ہیں' ربانیون حکام اور ربیون رعیت اور بعض کہتے ہیں کہ 'رب' کی طرف منسوب ہے یعنی وہ لوگ جو رب کی عبادت کرتے ہیں"[۲]

اور ابو حاتم احمد بن حمدان لغوی نے کتاب الزینۃ میں تصریح کی ہے کہ یہ سریانی لفظ ہے[۳] ۴/۶۔

فصل التاء المثناۃ

رَتْقًا : منہ بند، ملا ہوا، جڑا ہوا، رَتَقَ یَرْتُقُ کا مصدر ہے " رتق " کے معنی اصل میں بند ہونے اور جُڑ جانے کے ہیں' خواہ خلقی طور پر ہو یا صناعی طور پر مصدر یہاں پر اسم فاعل یا اسم مفعول کے معنی میں ہے، ۱۷/۳۔

رَتِّلِ : کھول کھول کر پڑھ، آہستہ آہستہ یعنی واضح پڑھ، ترتیل سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو تَرْتِیْلًا) ، ۲۹/۱۴۔

رَتَّلْنٰہُ : ہم نے اس کو تھم تھم کر پڑھا، ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ سنایا، رَتَّلْنَا ترتیل سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ہ ضمیر واحد مذکر غائب، ۱۹/۱۔

فصل الجیم المعجمۃ

رَجًّا : کپکپانا، لرزانا، ہلانا، رَجَّ یَرُجُّ کا مصدر ہے' اس کے معنی کسی چیز کو ہلانے اور جنبش دینے کے ہیں، ۲۷/۱۴۔

رِجَالٌ : مرد، پیادے، پاؤں چلتے، اول معنی کے اعتبار سے رَجُلٌ کی جمع ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے رَاجِلٌ کی جیسے رِکَابٌ رَاکِبٌ کی جمع ہے رَاجِلٌ رِجْلٌ سے مشتق ہے جس کے معنی پیر کے ہیں اور اسی مناسبت سے پاؤں پیدل اور پیادہ کو رَاجِلٌ کہتے ہیں۔

واضح رہے کہ مردانِ جن کے لئے بھی رِجَالٌ کا استعمال ہوتا ہے ارشاد ہے وَاَنَّہٗ کَانَ رِجَالٌ

[۱] انوار التنزیل، ج ۱ ص ۱۳۲
[۲] معالم التنزیل، ج ۱ ص ۳۶۲ (طبع مصر ۱۳۳۱ھ)
[۳] الاتقان، ج ۱ ص ۱۳۹

مِّنَ الْجِنِّ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (اور بہت سے مرد آدمیوں میں سے پناہ لیتے ہیں جنوں کے مردوں سے) شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے تصریح کی ہے کہ رجال الغیب جن ہی ہوتے ہیں اور اسی آیت کو استدلال میں پیش کیا ہے[1] قرآن مجید میں دو جگہ 'رجال' پیادوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے ایک فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا (پھر اگر تم کو ڈر ہو تو پیادہ پڑھ لو یا سوار) اور دوسرے يَاْتُوْكَ رِجَالًا (آئیں گے تیرے پاس پاؤں چلتے)

۲/۱۲، ۴/۱۲، ۵/۲،۳،۷،۱۱، ۸/۱۲،۱۷، ۱۱/۲، ۸/۱۰،۱۱، ۱۹/۱۹۔

۲۰/۱۵، ۲۱/۱۹، ۲۶/۱۱، ۲۹/۱۱ رِجَالًا ۳/۱۵، ۴/۱۲، ۶/۴

۹/۱۳، ۳/۶، ۳/۱۲، ۱۷/۱۰،۱۱، ۲۳/۱۳ ۔

رِجَالِكُمْ : تمہارے مرد، رِجَالِ مضاف كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۳/۲، ۲۲۔

رُجَّتْ : وہ ہلائی گئی، اس کو جنبش دی گئی (نَصَرَ) رُجٌّ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۲۷/۱۴ ۔

رُجْزَ : پلیدی، گناہ، عذاب، بت، امام بغوی وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" مجاہد، عکرمہ، قتادہ، زہری، ابن زید اور ابو سلمہ کا بیان ہے کہ رُجز سے مراد اوثان یعنی بُت ہیں، پس اللہ نے فرمایا کہ اس سے دُور رہ اور قریب نہ جا، اور بعض کا قول ہے کہ "ز" اس میں سین سے بدل لی گئی ہے' اہلِ عرب قربِ مخرج کے سبب سین اور زے کو ایک دوسرے کی جگہ لے آتے ہیں اس تاویل کی دلیل فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کے معنی ہیں گناہوں سے دور رہ، اور ابوالعالیہ اور ربیع کہتے ہیں کہ رُجز، را کے پیش سے بمعنی بت اور را کے زبر سے بمعنی نجاست و معصیت ہے، ضحاک نے اس کا ترجمہ شرک سے کیا ہے اور کلبی نے عذاب کے معنی بتائے ہیں"[2] ۲۹/۱۵ ۔

رِجْزٌ : عقوبت، بلا، عذاب، قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ :-

" رُجز اصل میں وہ چیز ہے جس سے گھن آئے اور رجس بھی اسی کی طرح ہے"[3]

[1] ملاحظہ ہو الصارم المنکی فی الرد علی السبکی للحافظ ابن عبد الہادی المقدسی، ص ۱۲۳ (طبع مصر ۱۳۱۶ھ)۔ امام موصوف کی عبارت یہ ہے:
" ورجال الغیب ہم الجن قال تعالیٰ وانہ کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن فزادوہم رہقا "

[2] معالم التنزیل، ج ۷ ص ۱۴۴　[3] انوار التنزیل، ج ۱ ص ۴۴ و ۴۵

لیکن علامہ زمخشری الفائق فی غریب الحدیث میں رقمطراز ہیں :-

" رجز اور رجس کے معنی عذاب کے ہیں۔ ابوتراب کا بیان ہے کہ میں نے ابوالسمیدع حسینی سے سنا، وہ کہتے تھے کہ رجز اور رجس وہ سخت مصیبت ہے جو لوگوں پر نازل ہو، یہ اہلِ عرب کے محاورہ ارتجزت السماء بالرعد و ارتجست (آسمان بجلی کی کڑک سے کانپ اٹھا اور لرز گیا) اور رعد مرتجز و مرتجس (کپکپا دینے اور لرزا دینے والی گرج) سے ماخوذ ہے اور وہ ایسی جنبش ہے جس کے ساتھ شور ہو کیونکہ جو عذاب کہ اترتا ہے اس میں ضروری ہے کہ جن پر اترے وہ ہل جائیں اور چیخ اٹھیں۔ [1]"

اور امام راغب فرماتے ہیں :-

" رجز کی اصل اضطراب (یعنی خوب ہلنا اور جنبش کرنا ہے) اور اسی سے رجز البعیر رجزا فھو ارجز و ناقۃ رجزاء آتا ہے جبکہ اونٹ یا اونٹنی کے قدم قریب قریب پڑنے اور ضعف کے سبب ڈگمگانے لگیں۔"

آیۂ شریفہ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ (بلا کی مار سے دکھ والی) میں رجز یہاں زلزلہ کی طرح ہے۔"

۹/۱۶،۶ ، ۲۳/۴ ، ۲۵/۱۷ ، رِجْزًا ۷/۶ ، ۹/۱۰ ، ۳۰/۲۹ -

رِجْسٌ : ناپاک، پلید، گندہ، عقوبت، عذاب، بلا۔ اَرْجَاسٌ جمع، رجس کی چار صورتیں ہیں، (۱) طبیعت کی جہت سے (۲) عقل کی جہت سے (۳) شرع کی جہت سے (۴) ان تینوں جہت سے رجسِ شرعی جُوا اور شراب، رجسِ عقلی شرک اور لحمِ خنزیر، تینوں کا مجموعہ میتہ (مردار) ہے۔ حق تعالیٰ نے سب کے لئے لفظِ رجس استعمال کیا ہے، بعض کا قول ہے کہ رِجْزٌ اور رِجْسٌ زور کی چیخ کو کہتے ہیں (ملاحظہ ہو رِجن) ۲/۷ ، ۱۶/۵،۳۲ ، ۱۵/۱۱ ، ۱۱/۱۷ ، ۲۲/۱ ، رِجْسًا ۵/۱۱ -

رِجْسِهِمْ : ان کی نجاست، ان کی گندگی، ان کی پلیدی، رِجْسِ مضاف ھِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۵/۱۱ -

رَجْعٌ : پھر آنا، لوٹ آنا، مینہ، بارش، رَجَعَ یَرْجِعُ کا مصدر ہے متعدی آتا ہے آیتِ شریفہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ میں بعض نے "ذات الرجع" کا ترجمہ چکر مارنے والا کیا ہے، شاہ عبدالقادر صاحب نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور قاضی بیضاوی کا بھی رجحان اسی

[1] الفائق فی غریب الحدیث، طبع دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن۔

طرف ہے اس اعتبار سے آسمان کو "ذات الرجع" اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے ہر دورہ میں جس جگہ سے حرکت کرتا ہے وہیں لوٹ آتا ہے[1] لیکن اکثر مفسرین اور ائمہ لغت کی تصریح کے مطابق یہاں رجع اپنے معنی مصدری میں نہیں بلکہ بارش اور بینہ کے معنی میں اسم ہے، علامہ ابن خالویہ لغوی ابو عبیدہ سے ناقل ہیں کہ رجع مطر یعنی بارش کو کہا جاتا ہے اور ابن الاعرابی روایت کرتے ہیں کہ کل مطر یثبت فی الارض فھو رجع[2] (ہر وہ بارش جو زمین میں ٹھہر جائے، رجع ہے) بارش یا مینہ کا نام رجع کیوں پڑا؟ قاضی بیضاوی نے اس کی دو وجہیں لکھی ہیں: لان اللہ یرجعہ وقتا فوقتا او لما قیل من ان السحاب یحمل الماء من البحار ثم یرجعہ الی الارض[3] (اس لئے کہ اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً بارش کو لوٹاتا رہتا ہے یا اس لئے کہ کہا گیا ہے کہ ابر سمندروں سے پانی لا دلیتا اور پھر زمین کی طرف لوٹا دیتا ہے) حاکم نے بسند صحیح حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رجع کے معنی بارش کے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب نے بھی یہی ترجمہ کو اختیار کیا ہے، پ ۳۰ ع ۱۵ آ ۱۱۔

رَجَعَ: وہ لوٹا، وہ پھر آیا (ضَرَبَ) رُجُوع سے جس کے معنی جہاں سے ابتداء ہوئی یا ابتداء کا اندازہ ہوا وہیں لوٹنے کے ہیں خواہ وہ کوئی مکان ہو یا فعل ہو یا قول اور خواہ رجوع بذاتہ ہو یا کسی جزء کے ذریعہ یا کسی فعل کے ذریعہ غرض رجوع کے معنی عود کرنے اور لوٹنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ واضح رہے کہ رجوع مصدر لازم ہے، پ ۹ ع ۱۶ آ ۱۳۔

رُجِعْتُ: میں لوٹایا گیا، رَجْعٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد متکلم، پ ۲۵ ع ۱۔

رَجَعْتُمْ: تم لوٹے، تم پھرے، رُجُوع سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ ۲ ع ۸ آ ۱۔

رَجَعَكَ: تجھ کو واپس لوٹایا یا تجھ کو پھیر لایا، رَجَعَ رَجْعٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ک ضمیر واحد مذکر حاضر، پ ۱۰ ع ۱۔

رَجَعْنَا: ہم لوٹے، ہم واپس ہوئے، ہم پھرے، رُجُوع سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، پ ۲۸ ع ۱۳۔

---

[1] انوار التنزیل، ج ۲، ص ۳۶۸ (طبع مصر)
[2] کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم، ص ۴۹، ۵۱
[3] انوار التنزیل، ج ۲، ص ۳۶۸
[4] مستدرک، ج ۲، ص ۵۲۰ (طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن)

رَجَعْنٰكَ: ہم نے تجھ کو واپس لوٹایا، ہم تجھے پھیر لائے، رَجَعْنَا رَجْعٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، پ ۱۶/۱۱۔

رَجَعُوْا: وہ پھرے، وہ واپس لوٹے، رُجُوْعٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۱۱/۴، پ ۱۳/۲، پ ۱۷/۵۔

رَجْعِهٖ: اس کو لوٹانا، اس کو پھیر لانا، رَجْعِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ پ ۳۰/۱۱۔

رُجْعٰی: پھر جانا، لوٹنا، رَجَعَ یَرْجِعُ کا مصدر ہے، لازم آتا ہے، پ ۳۰/۲۱۔

رَجْفَةٌ: زلزلہ، بھونچال، کپکپاہٹ، لرزش اسم ہے، پ ۸/۱۷، پ ۹/۹،۱، پ ۲۰/۱۹۔

رَجُلٌ: مرد، جس کی مردی و مردانگی ظاہر ہو، رِجَالٌ جمع ہے پ ۳/۷، پ ۷/۱۳، پ ۸/۱۵،۱۶، پ ۱۱/۶، پ ۱۲/۷، پ ۱۵/۲،۳، پ ۲۰/۵، پ ۲۱/۱۷، پ ۲۲/۱۹،۱۱،۷، پ ۲۳/۱۷، پ ۲۴/۹، پ ۲۵/۹۔

رَجُلًا: پ ۹/۹، پ ۱۵/۵،۷، پ ۱۸/۱۶، پ ۲۳/۱۷، پ ۲۴/۹۔

رَجُلَانِ: دو مرد، رَجُلٌ کا تثنیہ بحالتِ رفع واضح رہے کہ اسم و فعل کے تثنیہ میں الف جب تک طرف (آخر) میں واقع نہ ہو، قرآن کے رسم الخط میں وہ لکھا نہیں جاتا، صرف قَدَّمَتْ یَدَاكَ اس سے مستثنیٰ ہے، پ ۶/۸۔

رِجْلِكَ: تیرا پاؤں، رِجْلِكَ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، پ ۲۳/۱۳۔

رَجِلِكَ: تیرے پیادے، رَجِلِ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، رَجِلٌ رَاجِلٌ کی جمع ہے، پ ۱۵/۷۔

رَجُلَيْنِ: دو مرد، رَجُلٌ کا تثنیہ بحالتِ نصب جر، پ ۶/۷، پ ۱۴/۱۶، پ ۱۵/۱۷، پ ۲۰/۵۔

رِجْلَيْنِ: دو پیر، دو پاؤں، رِجْلٌ کا تثنیہ بحالتِ نصب و جر، پ ۱۸/۱۲۔

رَجْمًا: سنگسار کرنا، قتل کرنا، بے سوچے سمجھے منہ سے بات نکال دینا، لعنت کرنا، برا بھلا کہنا، پھٹکارنا، دھتکارنا، رَجَمَ یَرْجُمُ کا مصدر ہے اصل میں رَجْمٌ کے معنی رِجَامٌ (پتھروں) سے مارنے کے ہیں اور بقیہ تمام معانی مستعار ہیں، پ ۱۵/۱۵۔

رَجَمْنٰكَ: ہم نے تجھ کو سنگسار کیا، ہم نے تجھ پر پتھراؤ کیا، رَجَمْنَا رَجْمٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، پ ۱۲/۸۔

رُجُوْمًا: آلاتِ سنگساری، رَجْمٌ کی جمع، رجم اصل میں مصدر ہے اور جس چیز کے ذریعہ سنگسار کیا جائے اس کے لئے بطورِ اسم مستعمل ہے، پ ۲۹/۱۔

رَجِيْمٌ: ملعون، مردود، راندہ ہوا، رَجْمٌ سے

بروزن فَعِیل بمعنی مَفعُول یعنی مَرجُوم ہے شیطان چونکہ اللہ تعالیٰ کی درگاہ سے راندہ ہوا اور مردود ہے اس لئے یہ اس کی مخصوص صفت ہے اور قرآن مجید میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے اسی کی صفت میں آیا ہے، ۳/۱۲، ۱۴/۱۲، ۱۹/۱۳، ۱۲/۱۴، ۳۰/۶۔

فصل الحاء المهملة

رِحَالِهِمْ : ان کی خرجیں، ان کے کجاوے، رِحَال مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ رِحَال رَحْلٌ کی جمع ہے، ۱۳/۲۔

رَحُبَتْ : وہ کشادہ ہوئی، وہ فراخ ہوئی (کَرُمَ) رُحْبٌ سے جس کے معنی فراخ ہونے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۱۰/۱۳۔

رَحْلِ : کجاوہ، خرجیں، تھیلیاں، اصل میں اونٹ پر سواری کے لئے جو چیز رکھی جاتی ہے یعنی پالان کو رَحْلٌ کہتے ہیں اور مجازاً منزل و مسکن اور سامان سفر خرجیں اور تھیلیاں وغیرہ کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے رِحَالٌ جمع، ۱۳/۳۔

رَحْلِهٖ : اس کا اسباب سفر، اس کا پالان اس کا کجاوہ، رَحْلِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۳/۳۔

رِحْلَةَ : سفر کرنا، کوچ کرنا، کجاوہ کسنا، اصل میں تو اس کے معنی اونٹ پر پالان کسنے کے ہیں اور چونکہ اس کا مقصد کوچ اور سفر ہوتا ہے، اس لئے سفر کے معنی میں آنے لگا رَحَلَ یَرْحَلُ کا مصدر ہے، ۳۰/۳۱۔

رَحِمَ : اس نے رحم کیا، اس نے مہربانی کی (سَمِعَ) رُحْمٌ اور رَحْمَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ۱۲/۴، ۱۳/۱، ۲۵/۱۵۔

رُحْمًا : شفقت، محبت، مہربانی، رَحِمَ یَرْحَمُ کا مصدر ہے، ۱۶/۱۔

رُحَمَاءُ : بڑے نرم دل، بڑے مہربان، رَحِیْمٌ کی جمع، (ملاحظہ ہو رَحِیْمٌ) ۲۶/۱۲۔

رَحْمَتِكَ : تیری مہربانی، تیری مہر، تیری بخشش، رَحْمَةٌ مضاف كَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ (ملاحظہ ہو رَحْمَةٌ) ۸/۱۴، ۱۱/۱۴، ۱۹/۱۲۔

رَحْمَتِنَا : ہماری مہربانی، ہماری رحمت، ہماری بخشش، رَحْمَةٌ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، ۱۳/۱، ۱۶/۲،۶، ۱۷/۶،۵۔

رَحْمَتِهٖ : اس کی رحمت، اس کی مہربانی، رَحْمَةٌ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ۸،۱۳/۱، ۳/۱۶، ۵/۱۴،۸، ۶/۱۴، ۱۱/۱،۱۱، ۵/۱۴،۱۶، ۸/۷،۸،۹۔

پ ۱۹/۳، ۲۰/۱۰،۱۱، ۲۱/۸، ۲۴/۱، ۲۵/۲،۴،۲۰، ۲۶/۱۱، ۲۷/۲۰، ۲۹/۲۰ ۔

رَحِمْتَهٗ: تونے اس پر رحم کیا : تونے اس پر مہربانی کی، رَحِمتَ رُحمًا اور رَحْمَۃً سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ؛ پ ۲۴/۶ ۔

رَحْمَتِیْ: میری رحمت، میری مہربانی، رَحْمَۃ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ ۹/۹، ۲۰/۱۵ ۔

رَحْمٰن: بڑا مہربان، بہت بخشش کرنے والا، چونکہ اس لفظ کے معنی بجز ذاتِ باری کے اور کسی پر صادق نہیں آتے کیونکہ اسی کی رحمت سب پر عام ہے اس لئے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لئے اس لفظ کا استعمال نہیں ہوتا۔ علماءِ عربیت کا اس میں اختلاف ہے کہ "رحمٰن" عربی زبان کا لفظ ہے یا نہیں؟ اور عربی ہونے کی صورت میں یہ مشتق ہے یا غیر مشتق، مبرد اور ثعلب جو لغتِ عربیت کے امام ہیں اس طرف گئے ہیں کہ یہ عبرانی لفظ ہے اور اس کی اصل خاء معجمہ سے ہے[1]۔ امام خطابی لکھتے ہیں :-

" رحمٰن، کی تفسیر اور اس کے معنی میں نیز اس امر میں کہ وہ رحمۃ سے مشتق ہے یا نہیں، لوگوں کا اختلاف ہے، بعض اس طرف گئے ہیں کہ یہ غیر مشتق ہے کیونکہ اگر یہ رحمۃ سے مشتق ہوتا تو مرحوم کے ذکر کے ساتھ آتا اور جس طرح کہ رحیم لعبادہ کہا جاتا ہے رحمٰن لعبادہ کہنا جائز ہوتا، نیز اس لئے کہ اگر رحمۃ سے مشتق ہوتا تو عرب سننے کے ساتھ ہی اس پر انکار نہ کرتے کیونکہ وہ رحمتِ پروردگار کے منکر نہ تھے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا (جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں رحمٰن کیا ہے ؟ کیا تو جس کو کہے گا اس کو ہم سجدہ کریں گے اس سے ان کی نفرت میں اور زیادتی ہوتی جاتی ہے) اور بعض نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ عبرانی نام ہے اور جمہور اس طرف گئے ہیں کہ یہ رحمۃ سے مشتق ہے اور مبالغہ پر مبنی ہے، اس کے معنی رحمت والے کے ہیں اس سلسلہ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ جس طرح رحیم کا تثنیہ اور جمع آتا ہے، اس کا تثنیہ اور جمع نہیں آتا، فعلان کا وزن کلامِ عرب میں مبالغہ کا وزن ہے چنانچہ

[1] الاتقان، ج ۱ ص ۱۳۹

شدید الاستلاء کو مَلآن اور خوب پیٹ بھرے کو شبعان کہتے ہیں۔" سلہ

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ خدا کے لئے رحمٰن کا لفظ اسلام سے پہلے عام طور پر عربوں میں مستعمل نہ تھا اور صرف یہود و نصاریٰ اور بعض دیگر اربابِ مذاہب اس کو بولتے تھے چنانچہ نجد کے آخری کتبات میں رحمٰن ہی کا نام ملتا ہے۔ سدِ عرم کے عیسائی کتبہ کا آغاز بنعمۃ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے اسی لئے اسلام نے جب ابتداءً رحمٰن کا نام لیا تو قریش کو اچنبھا ہوا کہ یہ کون نیا نام ہے۔ صلح حدیبیہ میں جب حضرتِ علی نے عہد نامہ کی پیشانی پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا تو قریش نے ماننے سے انکار کیا کہ ہم رحمٰن کو نہیں مانتے۔ سلہ

جو لوگ رحمٰن کو رحمت سے مشتق بتاتے ہیں وہ رحمٰن و رحیم میں نہایت دقیق اور نازک فرق بیان کرتے ہیں چنانچہ ابنِ حجر عسقلانی لکھتے ہیں:۔

"اس میں اختلاف ہے کہ آیا رحمٰن اور رحیم کے ایک ہی معنی ہیں جس طرح کہ ندمان اور ندیم کے ہیں اور ان دونوں کو جو ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے وہ تاکید کیلئے ہے یا باعتبار تعلق دونوں میں باہم مغایرت ہے پس رحمٰن ہے دنیا کے لئے اور رحیم ہے آخرت کے لئے کیونکہ دنیا میں اس کی رحمت مومن و کافر سب کے لئے عام ہے اور آخرت میں مومن کے ساتھ مخصوص ہے یا مغایرت کسی اور جہت سے ہے کہ رحمٰن تو اس حیثیت سے زیادہ بلیغ ہے کہ وہ بڑی بڑی نعمتوں اور ان کے اصول پر مشتمل ہے جیسے کوئی غضب میں بھرا ہو تو اسے غضبان کہتے ہیں اور رحیم کو اس کے بعد ہی اس لئے لایا گیا کہ بطور تتمہ ہو کر چھوٹی نعمتوں کو شامل ہو جائے اور بعض کا قول ہے کہ رحیم زیادہ بلیغ ہے کیونکہ "فعیل" کا صیغہ مبالغہ کا مقتضی ہے اور تحقیق یہ ہے کہ مبالغہ کی جہت دونوں میں مختلف ہے" سلہ

علامہ ابنِ خالویہ لغوی کا بیان ہے کہ:۔

" رحمٰن کو رحیم پر اس لئے مقدم کیا گیا کہ رحمٰن، اللہ تعالیٰ کا اسم خاص ہے اور رحیم

سلہ کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی، ص ۲۷ (طبع انوار احمدی، الٰہ آباد) سلہ ارض القرآن، ج ۲، ص ۲۳۹ (طبع معارف پریس، اعظم گڑھ) سلہ فتح الباری، ج ۸، ص ۱۱۸ (طبع میریہ، مصر)

اسم مشترک ہے کیونکہ رجل رحیم تو بولتے ہیں مگر
رجل رحمٰن نہیں بولتے، پس خاص کو عام
پر مقدم کیا گیا، ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کہتے
ہیں کہ رحمٰن اور رحیم دو ایسے اسم ہیں
جن میں رقت کے معنی ہیں اور ایک میں بہ
نسبت دوسرے سے رقت کا مفہوم زیادہ
ہے اور دوسروں کا بیان ہے کہ رحمٰن میں ملاح
زیادہ ہے اور رحیم میں رقت زیادہ ہے پس
رحیم، لطیف کی طرح ہے، اور ابو عبیدہ کہتے ہیں
کہ رحمٰن اور رحیم دونوں نعتیں ہیں پس رحیم
تو رحمت سے بروزن فعیل ہے اور رحمٰن بروزن
فعلان۔ ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ یہ اس بنا پر
ہے کہ اہل عرب کے نزدیک زبان میں وسعت ہے
جیسے کہ ندیم اور ندمان کے ایک ہی معنی ہیں،
ابو عبیدہ نے اس شعر کو پیش کیا ہے ؎

وَنَدْمَانٍ تَزِيْدُ الْكَاسَ طِيْبًا
سَقَيْتُ وَقَدْ تَغَوَّرَتِ النُّجُوْمُ

اور دوسرے علماء کا قول ہے کہ رحمٰن عبرانی کا نام
ہے، ان لوگوں نے جریر کی یہ بیت استشہاد میں
پیش کی ہے:

اَوْ تَتْرُكُوْنَ اِلَى الْقَسَّيْنِ هِجْرَتَكُمْ
وَمَسْحَكُمْ صُلْبَهُمْ رُحْمَانَ قُرْبَانًا [1]

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں ایک
اور فرق نمایاں کیا ہے، فرماتے ہیں :۔
"اگرچہ یہ دونوں اسم رحمت سے ہیں لیکن
رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے
ہیں، عربی میں فعلان کا باب عموماً ایسے
صفات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو محض
صفات عارضہ ہوتے ہیں، فعلی ظہور ان
کے لئے ضروری نہیں ہوتا جیسے پیاسے
کے لئے عطشان غضبناک کیلئے غضبان
سراسیمہ کے لئے حیران، مست کے لئے
سکران لیکن فعیل کے وزن میں صفات
قائمہ و فاعلہ کا خاصہ ہے یعنی عموماً ایسے صفات
کے لئے بولا جاتا ہے جو جذبات و عوارض
ہونے کی جگہ صفات قائمہ ہوتے ہیں اور اپنا
فعلی ظہور بھی رکھتے ہیں مثلاً کریم کرم کرنیوالا
عظیم بڑائی رکھنے والا، حکیم حکمت
رکھنے والا، پس الرحمٰن کے معنی یہ ہوئے کہ
وہ ذات جس میں رحمت ہے اور الرحیم

[1] کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم، ص ۱۳

کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس کی رحمت اپنا فعلی ظہور بھی رکھتی ہے اور تمام کائنات اسی سے فیض یاب ہو رہی ہے۔" سلہ

شاہ عبدالعزیز صاحب تفسیر فتح العزیز میں ایک اور نکتہ واضح فرماتے ہیں:-

"باید دانست کہ از لوازم پرورش دو قسم رحمت ست، قسم اول رحمتے کہ در عین پرورش می باشد و آں رحمت اگر نباشد پرورش متصور نشود و حقیقت آں رحمت توجہ تام بدفع حاجات پروردہ خود و تعہدِ ضروریات او در ہر وقت و تفقد بالیست و نابالیست او در ہر آں ست و ازیں رحمت باسم رحمان تعبیر فرمودہ اند و قسم دوم از رحمت آنست کہ بعد از پرورش بحصول کمال ثمرات آں کمال را مترتب فرمایند و آں کمال را رائیگاں نسازند و ازیں رحمت تعبیر فرمودہ اند برحیم۔" سلہ

بہرحال یہ سب نکتہ سنجیاں اس بنیاد پر ہیں کہ رحمٰن کا اشتقاق رحمت سے ہے اور وہ عربی زبان کا لفظ ہے ورنہ اگر اس کو عبرانی لفظ مان لیا جائے تو پھر کسی دقیقہ سنجی کی ضرورت نہیں رہتی، اس صورت میں یہ لفظ اللہ کی طرح ذات باری کا علم ہوگا، قرآنِ مجید میں یہ لفظ ۵۷ جگہ مذکور ہے اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا استعمال بطور صفت نہیں بلکہ بطورِ علم ہوا ہے، ۲/۳ ، ۱۳/۱۰ ، ۱۵/۱۲

۱۶: ۵، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۴، ۱۵ ؛ ۱۷: ۲، ۳، ۴، ۷ ؛ ۱۹: ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۱۷ ؛ ۲۲/۱۸، ۱۹ ؛ ۲۳/۱، ۳ ؛ ۲۴/۱۵ ؛ ۲۵: ۸، ۹، ۱۰، ۱۳ ؛ ۲۶/۱۷ ؛ ۲۷/۱۱ ؛ ۲۸/۶ ؛ ۲۹/۱، ۲ ؛ ۳۰/۲-

رَحِمَنَا: اس نے ہم پر رحم کیا، اس نے ہم پر مہربانی کی، اس نے ہم پر رحمت کی، رَحِمَ صیغہ ماضی نا ضمیر جمع متکلم ہے (ملاحظہ ہو رَحِمَ) ۲۹/۲-

رَحِمْنٰهُمْ: ہم نے ان پر مہربانی کی، ہم نے ان پر رحم کیا، ہم نے ان پر بخشش کی، رَحِمْنَا رَحِمْنَا اور رَحِمْنٰہُمْ ہے، ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، ۱۸/۴-

رَحِمَهٗ: اس پر رحم کیا، اس پر مہربانی کی، اس پر بخشش کی، اس میں ہ ضمیر واحد مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو رَحِمَ) ۷/ب-

رَحْمَةٌ: رحمت، بخشش، مہربانی، رَحِمَ یَرْحَمُ کا مصدر ہے، امام راغب لکھتے ہیں:-

سلہ ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۳۹ (طبع دہلی ۱۳۵۰ھ)

سلہ تفسیر فتح العزیز، ص ۴ (طبع محمدیہ ۱۲۶۴ھ)

"رحمت وہ رقت ہے جو مرحوم کی طرف (یعنی جس پر رحم کیا جائے) احسان کی مقتضی ہو اور کبھی اس کا استعمال مجرد رقت کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنی میں جو رقت سے خالی ہو جیسے رحم اللہ فلانا (اللہ نے فلانے پر رحم کیا) جب اس سے ذاتِ باری کو موصوف کیا جائے گا تو صرف احسان مراد ہو گا، رقت مراد نہ ہو گی، اس لئے مروی ہے کہ اللہ کی طرف سے رحمت انعام اور فضل ہے اور آدمیوں کی طرف سے رحمت رأفت و تعطف (شفقت) ہے اور اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے جو آپ نے اپنے رب سے نقل کیا ہے کہ جب اس نے رحم کو پیدا کیا تو اس سے فرمایا میں رحمٰن ہوں اور تو رحم ہے، میں نے تیرے نام کو اپنے نام میں سے نکالا ہے پس جب تجھے ملائیگا میں اسے ملاؤں گا اور جو تجھے قطع کرے گا میں اسے پارہ پارہ کر دونگا، یہ اسی طرف اشارہ ہے جو سابق میں گزرا کہ رحمت، رقت اور احسان دو معنوں پر مشتمل ہے، پس رقت کو طبائعِ انسانی میں جگہ دی اور احسان کے ساتھ خود منفرد رہا تو یہ ہوا کہ جس طرح لفظِ رحم رحمت سے ہے اسی طرح اس کے جو معنی لوگوں میں موجود ہیں وہ اس معنی سے ہیں جو ذات باری کے لئے پائے جاتے ہیں اور ان دونوں کے معنوں میں بھی وہی تناسب ہے جو ان دونوں کے لفظوں میں ہے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو میں رحمت کی اچھی تشریح کی ہے جو ان ہی کے لفظوں میں درج ذیل ہے:

"عربی میں رحمت کا عواطف کی ایسی رقت اور نرمی کو کہتے ہیں جس سے کسی دوسری ہستی کے لئے احسان و شفقت کا ارادہ جوش میں آجائے، پس رحمت میں محبت، شفقت، فضل، احسان سب کا مفہوم داخل ہے اور مجرد محبت لطف اور فضل سے زیادہ وسیع ہے۔" [1]

۲ — ۳، ۱۱، ۱۶　۳ — ۹　۴ — ۲، ۸　۵ — ۱۰　۶ — ۴　۷ — ۸، ۱۲　۸ — ۲، ۵، ۶، ۷

[illegible] — ۱۳، ۱۴، ۱۶　۹ — ۱۴، ۹　۱۰ — ۹، ۱۴　۱۱ — ۸، ۱۱　۱۲ — ۲، ۳، ۵، ۶، ۷، ۸

۱۳ — ۶　۱۴ — ۱، ۸، ۱۴، ۱۴　۱۵ — ۳، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۲۰، ۲۱　۱۶ — ۱، ۲

۱۶ — ۳، ۵　۱۷ — ۶، ۷　۲۰ — ۴، ۸، ۱۲　۲۱ — ۱، ۶، ۷، ۸، ۱۰، ۱۸　۲۲ — ۱۳

۲۳ — ۴، ۱۰، ۱۳، ۱۵　۲۴ — ۱، ۳، ۱۶　۲۵ — ۱، ۶، ۹، ۱۴، ۱۸　۲۶ — ۲　۲۷ — ۱۸، ۲۰

---

[1] ترجمان القرآن، ج ۱ ص ۳۹

رَحِیْق: شراب، ناب: اسم جامد ہے، علامہ ابومنصور ثعالبی، فقہ اللغۃ میں ابوعبید سے ناقل ہیں الرحیق صفوۃ الخمر التی لیس فیہا غش[1] (رحیق وہ شراب صاف ہے جس میں ذرا آمیزش نہ ہو)، ۲۵/۸۳۔

رَحِیْم: بڑا مہربان، نہایت رحمت والا، رَحْمَۃٌ سے بروزن فَعِیْلٌ مبالغہ کا صیغہ رُحَمَاءُ جمع، رحیم اسمائِ حسنیٰ میں سے ہے اس کا استعمال غیر کے لئے بھی ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید میں رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ کہا گیا ہے، ابن مبارک کہتے ہیں رحمٰن وہ ذات ہے کہ جب اس سے مانگا جائے تو عطا فرمائے اور رحیم وہ ذات ہے کہ اس سے نہ مانگا جائے تو غضب میں آئے[2] (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو رحمٰن)۔

۱/۱، ۳، ۱۵، ۲/۱۰، ۲، ۵، ۸، ۶، ۹، ۱۱، ۱۲، ۳/۱۲، ۱۲، ۱۷، ۴/۴ ... [numeric verse references]

رَحِیْمًا: ... [numeric verse references]

فصل الخاء المعجمۃ

رُخَاءً: ملائم، نرم نرم، اسم ہے رِخْوَۃٌ اور رَخَاوَۃٌ سے جس کے معنی نرم ہونے کے ہیں ماخوذ ہے، ۳۸/۳۶۔

فصل الدال المہملۃ

رَدَّ: اس نے پھیر دیا، اس نے لوٹا دیا، اس نے واپس کر دیا (نَصَرَ) رَدٌّ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو رَدُّوْهَا) ۲۰/۱۹۔

رِدْأً: مددگار، مدد دینے والا، جو دوسرے کی مدد کے لئے ساتھ چلے یا ذریعہ کہلاتا ہے ردء سے جس کے معنی مدد کرنے کے ہیں صفتِ مشبہ کا صیغہ اَرْدَاءٌ جمع، ۲۸/۳۴۔

رُدَّتْ: وہ واپس کر دی گئی، وہ لوٹا دی گئی، رَدٌّ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب ۱۲/۶۵۔

---

[1] فقہ اللغۃ: باب ۲۴، فصل ۱۵ فی تفصیل اسماء الخمر وصفاتہا۔ [2] فتح الباری، ج ۸، ص ۱۱۸

رُدِدْتُّ : میں لوٹایا گیا، مجھ کو واپس کیا گیا، مجھے پھیرا، رَدٌّ سے، ماضی مجہول کا صیغہ واحد متکلم ۱۸ پ ۱۵ ۔

رَدَدْنَا : ہم نے پھیر دیا، ہم نے لوٹا دیا، ہم نے واپس کر دیا، رَدٌّ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، پ ۱۵ ۔

رَدَدْنٰهُ : ہم نے اس کو پھیر دیا، ہم نے اس کو واپس کر دیا، ہم نے اس کو لوٹا دیا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ ۳۰ پ ۲۰ ۔

رَدِفَ : وہ پیچھے لگا، وہ پیچھے ہوا (سَمِعَ) رَدْفٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَابِعُ رَادِفَۃٌ) پ ۲۰ ۔

رَدْمًا : موٹی دیوار، مضبوط دیوار، سدِ محکم، رَدَمَ یَرْدِمُ کا مصدر ہے جس کے معنی رخنہ کو پتھروں سے بند کر دینے کے ہیں مگر یہاں مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، پ ۱۶ ۔

رَدُّوْا : انہوں نے الٹا دیا، انہوں نے لوٹایا، انہوں نے پھیر دیا، رَدٌّ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، آیہ شریف فَرَدُّوْا اَیْدِیَهُمْ فِیْۤ اَفْوَاهِهِمْ (پھر انہوں نے اپنے ہاتھ الٹے دئے اپنے منہ میں) کے تین معانی بیان کئے گئے ہیں (۱) غصہ کے مارے پشتِ دست کاٹنے لگے (۲) منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش کرنے لگے (۳) اَفْوَاهِهِمْ میں هِمْ کی ضمیر بجائے انبیاء کے راجع کی جائے یعنی انبیاء کے منہ پر ہاتھ رکھنے لگے رَدٌّ کے استعمال سے یہاں اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ انہوں نے بار بار ایسا کیا، پ ۱۳ ۔

رُدُّوْا : وہ واپس لائے گئے، وہ لوٹائے گئے وہ پھیرے گئے، رَدٌّ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۵، پ ۹، پ ۱۴، پ ۸ ۔

رَدُّوْهُ : انہوں نے اس کو لوٹا دیا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، (ملاحظہ ہو رَدُّوْا) پ ۵ ۔

رُدُّوْهُ : اس کو رجوع کرو، اس کو لوٹاؤ، اس کو پھیر دو، رُدُّوْا رَدٌّ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ ۵ ۔

رُدُّوْهَا : اس کو پھیر دو، اس کو واپس لاؤ، اس میں ھَا ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ ۲۳ پ ۵ ۔

رَدَّهَا : اس کا پھیر دینا، رَدٌّ مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، رَدٌّ رَدَّ یَرُدُّ کا مصدر ہے جس کے معنی کسی شے کے لوٹانے کے ہیں، خواہ ذاتِ شے کو لوٹایا جائے یا اس کی کسی حالت کو، پ ۱۷ ۔

رَدِّهِنَّ : ان (عورتوں) کا لوٹانا، ان کا پھیر لینا رَدٌّ مضاف هِنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب مضاف الیہ، پ ۲ ۔

فصل الزاء المعجمة

رَزَّاقٌ: رزق دینے والا، روزی دینے والا، رِزْقٌ سے جس کے معنی روزی دینے کے ہیں، بروزن فَعَّالٌ مبالغہ کا صیغہ، امام حلیمی کہتے ہیں "رزق پہ رزق کثرت سے اور وسعت کے ساتھ دینے والا رزاق ہے"

امام خطابی کا بیان ہے کہ رزاق وہ ذات ہے جو رزق کی متکفل ہے اور ہر جان کے قیام کے لئے جس قدر قوت کی ضرورت ہے اسکی بہم پہنچانیوالی ہے[1]، یاد رہے کہ اس لفظ کا اطلاق بجز ذاتِ باری کے غیر پر جائز نہیں ہے، ۲۷/۲۔

رِزْقٌ: روزی، رزق۔ راغب لکھتے ہیں کہ رزق کبھی تو عطاءِ جاری کو کہا جاتا ہے خواہ دنیوی ہو یا اخروی اور کبھی حصہ کو اور جو پیٹ میں پہنچکر غذا بن جاتی ہے اس کو، عطاءِ دنیوی کی مثال فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ (آسمان میں ہے تمہاری روزی) اور عطاءِ اُخروی کی مثال وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (اور ان کو ہے ان کی روزی وہاں صبح اور شام) اور حصہ کی مثال وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ (اور اپنا حصہ یہی لیتے ہو کہ تم جھٹلاتے ہو) اور غذا کی مثال فَلْيَأْتِكُم بِرِزْقٍ مِّنْهُ (سو وہ تمہارے لئے اس میں سے کھانا لے آئے) اَرْزَاقٌ جمع، ۱/۲، ۸/۱۱، ۹/۱۵، ۱۰/۶، ۱۱/۱۱، ۱۳/۹، ۱۴/۱۶، ۱۵/۳،۱۵، ۱۶/۱۷، ۱۷/۱۴، ۱۸/۹، ۲۰/۱۱،۱۴، ۲۱/۲،۷، ۲۲/۷،۸،۱۰،۱۱، ۲۳/۶، ۲۴/۲، ۲۵/۳،۴،۷، ۲۷/۲۔

رِزْقًا ۱/۲، ۳/۱۲، ۱۳/۱، ۱۳/۱۷، ۱۴/۱۲،۱۶، ۱۶/۱۷، ۱۷/۱۵، ۲۰/۹،۱۴، ۲۲/۱، ۲۴/۷، ۲۶/۱۵، ۲۸/۱۸۔

رِزْقُكُمْ: تمہارا رزق، تمہاری روزی، رِزْقٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، ۲۶/۱۸، ۲۷/۱۶۔

رَزَقَكُمْ: اس نے تم کو روزی دی، اس نے تم کو رزق دیا، رَزَقَ رِزْقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو اُرْزُقْ) ۲/۲، ۸/۴،۱۳، ۹/۱۷، ۱۴/۱۶،۲۱، ۱۴/۷، ۲۳/۳، ۲۴/۱۲۔

رِزْقُنَا: ہمارا رزق، ہماری روزی، رِزْقٌ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۲۳/۱۲۔

رُزِقْنَا: ہمیں روزی دی گئی، ہمیں رزق دیا گیا، رِزْقٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع متکلم، ۱/۳۔

رَزَقْنٰكُمْ: ہم نے تم کو رزق دیا، ہم نے تم کو روزی دی، رَزَقْنَا رِزْقٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، ۱/۶، ۲/۵، ۳/۲، ۹/۱۰، ۱۶/۱۳، ۲۸/۷

---

[1] کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی، ص ۵۰

پ ۲۸/۱۴ ۔

رَزَقْنٰهُ: ہم نے اس کو روزی دی، ہم نے اس کو رزق دیا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ ۲۴/۱۶ ۔

رَزَقْنٰهُمْ: ہم نے ان کو روزی دی، ہم نے ان کو رزق دیا، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، پ ۱/۱، پ ۵/۱۰، پ ۹/۱۵، پ ۱۳/۱۲، پ ۱۴/۱۳، پ ۱۵/۷، پ ۱۷/۱۲، پ ۲۰/۹، پ ۲۱/۱۵، پ ۲۲/۱۶، پ ۲۵/۵، ۱۸ ۔

رَزَقَنِیْ: اس نے مجھے رزق دیا، اس نے مجھے روزی دی، ن وقایہ ی ضمیر واحد متکلم (ملاحظہ ہو رِزْقُكُمْ) پ ۱۲/۸ ۔

رُزِقُوْا: وہ روزی دیئے گئے، ان کو رزق دیا گیا، رِزْقٌ سے، ماضی مجہول کا صیغہ، جمع مذکر غائب، پ ۱/۳ ۔

رِزْقُهٗ: اس کا رزق، اس کی روزی، رِزْقٌ مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، پ ۲۸/۱۶، پ ۲۹/۲، پ ۳۰/۱۴ ۔

رِزْقُهَا: اس کا رزق، اس کی روزی، رِزْقٌ مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب، مضاف الیہ، پ ۱۲/۱، پ ۲۴/۲۱، پ ۲۶ ۔

رِزْقُهُمْ: ان کا رزق، ان کی روزی، رِزْقٌ مضاف، ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، پ ۲۴/۱۶، پ ۲۶ ۔

رَزَقَهُمْ: اس نے ان کو رزق دیا، اس نے ان کو روزی دی، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو رَزَقَكُمْ) پ ۳/۵، پ ۳/۸، پ ۱۲/۱۱، ۱۷ ۔

رِزْقُهُنَّ: ان (عورتوں) کی روزی، ان کا رزق، رِزْقٌ مضاف ھُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب مضاف الیہ، پ ۲/۱۴ ۔

فصل السین المهملة

رَسّ: کنواں، ابن ابی حاتم نے مجاہد سے جو کبار تابعین میں سے مشہور مفسر ہیں، یہی معنی نقل کئے ہیں، امام بخاری نے "رَسّ" کے معنی معدن (کان) کے بیان کئے ہیں اور اس کی جمع رِساس بتائی ہے، ابو عبیدہ کا بھی یہی قول ہے، خلیل کہتے ہیں "ہر وہ کنواں جس کی گولائی پختہ نہ تعمیر کی جائے "رس" کہلاتا ہے"[1]، راغب لکھتے ہیں:۔

"بعض کا قول ہے کہ "رس" ایک وادی ہے شاعر کہتا ہے ع وَهُنَّ لِوَادِي الرَّسِّ كَالْيَدِ لِلْفَمِ

اور اصل میں "رس" کسی شے کا تھوڑا سا اثر

[1] فتح الباری، ج ۸، ص ۳۷۷

جو پایا جاتا ہے اس کو کہتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے سمعت رسامن الخبر (میں نے کچھ یوں ہی سی خبر سنی) رس الحدیث فی نفسی (میرے جی میں کچھ بات پڑی) وجد رسا من حمی (اس نے بخار کا کچھ اثر محسوس کیا) رُسَّ المیت (میت دفن کی گئی) یعنی اس کی ذات کے بعد اس کا نشان رکھا گیا"

"اصحاب الرس" کے متعلق جو تحقیق تھی سابق میں گزر چکی، ۹/۲، ۲۶/۱۵ -

رِسٰلٰتِ: پیغامات، رِسَالَۃٌ کی جمع، ۸/۱۵،۱۶، ۹/۱، ۲۲/۲، ۲۹/۱۲ -

رِسٰلٰتِہٖ: اس کے پیغامات، رِسَالٰتِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، ۲۶/۱۱ -

رِسٰلٰتِیْ: میرے پیغامات، رسالات مضاف ی ضمیر واحد متکلم، مضاف الیہ، ۹/۱ -

رِسَالَۃٌ: پیغام، اِرْسَالٌ سے جس کے معنی بھیجنے کے ہیں اسم ہے اس کے معنی پیغام اور خط کے آتے ہیں، رَسَائِلُ اور رِسَالَاتٌ جمع رسالت کی شرعی تعریف علامہ سعد الدین تفتازانی نے ان الفاظ میں کی ہے "ھی سفارۃ العبد بین اللہ وبین ذوی الالباب من خلیقتہ لیزیح بہا عللہم فیما قصرت عنہ عقولہم من مصالح الدنیا والآخرۃ[1] (وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی ہوشمند مخلوق کے مابین بندہ کی سفارت ہے تاکہ اس کے ذریعہ ان بیماریوں کو زائل کردیا جائے کہ جن میں ان کی عقلیں دنیا و آخرت کی مصلحتوں سے عاجز ہو چکی ہیں، ۷/۱۲ -

رِسَالَتَہٗ: اس کا پیغام، رِسَالَۃَ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۶/۱۴، ۸/۲ -

رُسُل: رسول، پیغمبر، رَسُوْلٌ کی جمع ہے ۱/۱۱، ۳/۱، ۴/۱،۶، ۶/۲،۷،۱۴، ۷/۵،۷،۱۰، ۸/۲،۳،۱۱،۱۲،۱۳، ۱۲/۷،۱۰، ۱۳/۶،۱۱،۱۹، ۱۴/۱۱، ۱۷/۳، ۱۸/۴، ۱۹/۲، ۲۲/۱۳، ۲۳/۱۰، ۲۴/۱۵،۱۶،۱۹، ۲۶/۱،۱۴،۱۵، ۲۹/۲۱، رُسُلاً، ۶/۳،۱۴، ۱۱/۱۳، ۱۳/۱۲، ۱۴/۷، ۲۱/۸، ۲۲/۱۳، ۲۴/۱۳ -

رُسُلُکَ: تیرے پیغمبر تیرے رسول، رُسُلِ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۴/۱۱ -

رُسُلُکُمْ: تمہارے رسول تمہارے پیغمبر، رُسُل مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۲۴/۱۰ -

رُسُلُنَا: ہمارے بھیجے ہوئے ہمارے رسول، ہمارے پیغمبر، رُسُل مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ

[1] شرح عقائد تفتازانی، ص ۹۷ (طبع علوی لکھنؤ)

پ ۱/۹ پ ۴/۱۴ ث ۱۱ پ ۱۸/۵،۸ پ ۱۲/۷ ش ۱۵/۳ پ ۲۰/۱۶ پ ۲۴/۱۲،۷ پ ۲۵/۱۳،۱۰ پ ۲۷/۲۰،۱۹ ۔

رُسُلِہٖ: اس کے رسول، اس کے پیغمبر، رُسُلَ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، پ ۱/۲ پ ۳/۸ پ ۴/۹ پ ۵/۱۷ پ ۶/۳،۱ پ ۱۲/۵ پ ۱۳/۱۹ پ ۲۷/۱۹،۱۸ پ ۲۸/۱۸،۴ ۔

رُسُلِهِمْ: ان کے رسول، ان کے پیغمبر، رُسُلِ مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، پ ۱۰/۱۵ پ ۹/۳ پ ۱۱/۷ پ ۱۳/۱۵،۱۴ پ ۲۱/۴ پ ۲۲/۱۸ پ ۲۵/۳ ۔

رُسُلِیْ: میرے رسول، میرے پیغمبر، رُسُلِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ پ ۶/۷ پ ۱۶/۳ پ ۲۲/۱۱ پ ۲۵/۳ ۔

رَسُوْل: پیغمبر، بھیجا ہوا، رسول، رِسَالَۃٌ سے ہے، شیخ شمس الدین قہستانی لکھتے ہیں :۔

"فَعُوْلٌ مبالغہ ہے مُرْسَلٌ مُفْعَلٌ بالفتح کا اور فَعُوْلٌ کا استعمال اس طرح پر نادر ہی ہوتا ہے"۔[1]

نبی اور رسول کے مابین کیا نسبت ہے[2]؟ اس بارے میں تین مختلف رائیں ہیں :۔

(۱) یہ دونوں مساوی ہیں یعنی ہر نبی رسول ہے اور ہر رسول نبی ہے، علامہ تفتازانی نے شرح عقائد

---

[1] جامع الرموز، ص ۵ (طبع نول کشور)

[2] جو کچھ ذہن میں حاصل ہوتا ہو مفہوم ہے اس کی دو قسمیں ہیں جزئی اور کلی جزئی وہ مفہوم ہے جس کے ایک ذات سے زیادہ پر صادق ہونے کو عقل منع رکھے جیسے مفہوم موسیٰ و عیسیٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام اور کلی وہ مفہوم ہے جس کے ایک ذات سے زیادہ پر صادق ہونے کو عقل روا رکھے جیسے مفہوم نبی اور رسول کا۔

جو دو کلی ہیں ان میں نسبت چار ہی طرح کی متصور ہو سکتی ہے کیونکہ یا تو دونوں میں سے ہر ایک کلی دوسری کلی کے ہر فرد پر صادق آئے گی جیسے انسان اور ناطق کہ انسان ناطق کے ہر فرد پر صادق آتا ہے اور ناطق انسان کے ہر فرد پر ایسی دو کلیوں کو "متساوئین" کہتے ہیں اور ان کی نسبت کو "تساوی" یا دونوں میں سے ہر ایک دوسری کے کسی فرد پر صادق نہ آئے گی جیسے انسان اور گھوڑا، کہ نہ انسان گھوڑے کے کسی فرد پر صادق آتا ہے نہ گھوڑا انسان کے کسی فرد پر ایسی دو کلیوں کو "متباینین" کہتے ہیں اور ان کی نسبت کو تباین یا دونوں میں سے ایک تو دوسری کے ہر فرد پر صادق آئے گی اور دوسری پہلی کے ہر فرد پر صادق نہ آئے گی بلکہ صرف بعض افراد پر جیسے حیوان اور انسان کہ حیوان تو انسان کے ہر فرد پر صادق آتا ہے اور انسان حیوان کے صرف بعض افراد پر، ایسی دو کلیوں میں سے اول کو اعم کہتے ہیں اور دوسری کو اخص، اور ان کی نسبت کو عموم خصوص مطلق، مثال مذکور میں حیوان اعم ہے اور انسان اخص اور یا ان دونوں میں سے ہر ایک دوسری کے صرف بعض افراد پر صادق آئے گی جیسے حیوان اور سپید کہ حیوان سپید کے صرف بعض افراد پر صادق آتا ہے اور سپید حیوان کے صرف بعض افراد پر چنانچہ بطخ پر دونوں صادق ہیں اور ہاتھی پر صرف حیوان صادق ہے اور ہاتھی دانت پر صرف سپید، ایسی دو کلیوں کو اعم اخص من وجہ کہتے ہیں اور ان کی نسبت کو عموم و خصوص من وجہ۔

نسفی اور شرح مقاصد میں اسی کو اختیار کیا ہے اور امام ابن ہمام نے المسائرہ میں اس کو محققین کی طرف منسوب کیا ہے، فرماتے ہیں:-

"واما علی ما ذکرہ المحققون من ان النبی انسان بعثہ اللہ لتبلیغ ما اوحی الیہ وکذا الرسول فلا فرق[1] (لیکن محققین نے جو ذکر کیا ہے کہ نبی وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اسلئے مبعوث فرمایا ہو کہ جو کچھ اس کی طرف وحی کی ہے اس کی تبلیغ کردے اور اسی طرح سے رسول، اس بنا پر کوئی فرق نہیں ہے۔")

لیکن آیہ شریفہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ الاٰیۃ (اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نہ نبی) اس قول کی تردید کر رہی ہے کیونکہ عطف مغایرت پر دلالت کرتا ہے اور احد المتساویین کی نفی متساوی آخر کی نفی کو مستلزم ہے، پس اگر ان کے مابین تساوی مانی جائے تو ولا نبی کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ نبی تو رسول ہی کے ذکر میں آگیا اب علیحدہ ذکر کی کیا حاجت؟

(۲) یہ دونوں متبائنین ہیں، رسول وہ ہے جو جدید شریعت لے کر آئے اور نبی وہ ہے جو جدید شریعت لے کر نہ آئے پس کوئی رسول نبی نہیں اور کوئی نبی رسول نہیں، لیکن یہ محض غلط ہے کیونکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید میں صاف تصریح ہے وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا (اور تھا رسول نبی) اور اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں وارد ہوا ہے۔

(۳) ان دونوں کے مابین عموم خصوص مطلق ہے اکثر علماء کی یہی رائے ہے، اب بعض تو اس طرف گئے ہیں کہ رسول اعم ہے اور نبی اخص کیونکہ رسول فرشتہ بھی ہوتا ہے اور انسان بھی، ارشاد ہے اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (اللہ تعالیٰ چھانٹ لیتا ہے فرشتوں میں پیغام پہنچانے والے اور آدمیوں میں) اور نبی صرف انسان ہی ہوتا ہے فرشتہ نہیں، پس ہر رسول نبی ہوا لیکن ہر نبی رسول نہیں کیونکہ بعض رسول فرشتے ہوتے ہیں اور جمہور کا یہ قول ہے کہ نبی اعم ہے اور رسول اخص[2] پس ہر رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں مگر اس صورت میں نبی اور رسول میں فرق کیا ہوگا اور ان دونوں کی شرعی تعریف کیا ہو گی؟ اس سلسلہ میں سخت

[1] المسائرہ مع شرح المسامرہ، ص ۹۴ (طبع انصاری دہلی ۱۳۲۰ھ)

[2] واضح رہے کہ اس بحث کے سلسلہ میں ہمارے پیش نظر نبراس شرح شرح عقائد مصنفہ علامہ عبدالعزیز بن احمد فرہاری، ص ۹، (طبع ہاشمی میرٹھ)

اختلافِ اقوال ہے جو درج ذیل ہے، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے جمہور کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے:

"جس کو اللہ سے وحی آئی وہ نبی ہے اور ان میں جو خاص ہیں امت رکھتے ہیں یا کتاب، وہ رسول ہیں۔" [۱]

قاضی ناصر الدین علامہ عبداللہ بن عمر البیضاوی لکھتے ہیں:-

"رسول وہ ہے جس کو اللہ نے شریعتِ جدیدہ دیکر مبعوث فرمایا ہو تاکہ وہ لوگوں کو اس کی طرف دعوت دے اور نبی اس کو بھی عام ہے اور اس کو بھی کہ جس کو شرعِ سابق کے برقرار رکھنے کے لئے بھیجا ہو جیسے وہ انبیاء بنی اسرائیل جو حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے مابین ہوئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے علماء کو ان انبیاء سے اسی بناء پر تشبیہ دی ہے، پس نبی، رسول سے اعم ہے اور اس پر یہ چیز بھی دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انبیاء کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار، عرض کیا گیا ان میں رسول کتنے ہیں؟ فرمایا تین سو تیرہ کا جم غفیر، اور بعض کا قول ہے کہ رسول وہ ہے کہ معجزہ اور کتاب جو اس پر نازل کی گئی ہو، دونوں کا جامع ہو اور جو نبی ہی ہو، رسول نہ ہو، وہ ہے جس کے پاس کتاب نہ ہو اور بعض کہتے ہیں، رسول وہ ہے جس کے پاس فرشتہ وحی لیکر آئے اور نبی اس کو بھی کہا جاتا ہے اور نیز اس کو بھی جس کی طرف خواب میں وحی کی جائے۔" [۲]

محدث ملا علی قاری، المنہج الازہر شرح الفقہ الاکبر میں فرماتے ہیں:-

"زیادہ تر مشہور فرق جو ان دونوں میں منقول ہے یہ ہے کہ نبی رسول سے اعم ہے کیونکہ رسول وہ ہے جو تبلیغ پر مامور ہو اور نبی وہ ہے جس کی طرف وحی کی جائے خواہ وہ تبلیغ پر مامور ہو یا نہ ہو۔" [۳]

شیخ ابنِ ہمام نے المسایرہ میں اس فرق کو بعض اہلِ ظواہر و اصحابِ حدیث کی طرف منسوب کیا ہے [۴]

---

[۱] موضح القرآن تفسیر سورۂ مریم

[۲] تفسیر انوار التنزیل، ج ۲، ص ۶۴

[۳] شرح فقہ اکبر، ص ۵۸ (طبع مصر)

[۴] المسایرہ، ص ۹۴

شیخ اکبر محی الدین بن عربی بھی فتوحاتِ مکیہ میں اسی کے قائل ہیں[1] اور علامہ جلال الدین دوانی نے بھی تفسیر جلالین میں اسی کو اختیار کیا ہے[2] شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے کتاب النبوات میں اس سلسلہ میں ایک نفیس بحث سپردِ قلم فرمائی ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے، فرماتے ہیں :-

"نبی وہ ہے جس کو اللہ بتلاتا ہے اور جو کچھ اللہ بتلاتا ہے اس کو بتاتا ہے اب اگر اسی کے ساتھ وہ اس شخص کی طرف بھی بھیجا گیا کہ جو حکمِ الٰہی کا مخالف ہے تاکہ اس کو اللہ کے پیغام کی تبلیغ کرے تو وہ رسول ہے لیکن جس صورت میں کہ وہ پہلی ہی شریعت پر عامل ہے اور کسی کی طرف اس کو بھیجا نہیں گیا کہ جسے وہ اللہ کی طرف سے پیغام پہنچائے تو وہ "نبی" ہوگا، رسول نہیں، اللہ فرماتا ہے وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ‌ (اور ہم نے جو رسول بھیجا تجھ سے پہلے یا نبی سو جب لگا خیال باندھنے شیطان نے ملا دیا اس کے خیال میں)"ارسال" کا ذکر فرمایا کہ جو ہر دو نوع کو عام ہے ان میں سے ایک کو بایں طور خاص کیا ہے کہ وہ رسول ہے اور یہی وہ رسول مطلق ہے جو اللہ کے مخالفوں کی طرف تبلیغِ رسالت پر مامور ہے جیسے حضرتِ نوح علیہ السلام، صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ وہ پہلے رسول ہیں جو اہلِ زمین کی طرف مبعوث ہوئے اور ان سے پہلے جو تھے، انبیاء تھے جیسے حضرتِ شیث اور حضرتِ ادریس علیہما السلام اور ان دونوں سے بھی پہلے حضرتِ آدم علیہ السلام جو نبی مکلم تھے (یعنی ان سے حق تعالیٰ نے کلام فرمایا تھا) حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ حضرتِ آدم اور حضرتِ نوح علیہما السلام کے مابین دس قرن گزرے ہیں جو سب کے سب اسلام پر تھے ان انبیاء پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی تھی جس پر یہ خود بھی عمل پیرا ہوتے تھے، اور ان مومنوں کو بھی حکم فرماتے تھے جو ان کے پاس تھے کیونکہ وہ سب ان پر ایمان رکھتے تھے، ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ایک شریعت والے ان تمام باتوں کو مانتے ہیں کہ جن کی علماء رسول کی طرف سے تبلیغ کرتے ہیں اور یہی حال

---

[1] فتوحاتِ مکیہ باب ۱۴، ص ۱۶۹

[2] تفسیر جلالین سورۂ حج

انبیاء بنی اسرائیل کا ہے کہ وہ شریعت تورات کے
مطابق حکم کرتے تھے اور گو ان میں سے کسی کی
طرف ایک معین واقعہ میں خاص وحی بھی کی
جاتی تھی تاہم شریعت تورات میں انکی مثال
اسی عالم کی سی ہے جس کو اللہ عزوجل کسی قضیہ
میں ایسے معنی سمجھا دیں جو مطابق قرآن ہوں
جیسے کہ اللہ عزوجل نے حضرت سلیمان علیہ السلام
کو اس قضیہ کا حکم سمجھایا کہ جس میں انہوں نے
اور حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ کیا تھا
پس انبیاء کو تو اللہ تعالیٰ بتلاتا اور اپنے امر و
نہی اور خبر سے ان کو مطلع فرماتا ہے اور وہ ان
لوگوں کو کہ جو ان پر ایمان لاتے ہیں اللہ عزوجل
نے جو کچھ خبر دی ہے اور امر و نہی سے مطلع فرمایا
ہے بتلاتے ہیں، پھر اگرچہ کفار کی طرف بھی رسول
ہوئے تو ان کو توحید الٰہی اور اس وحدہ لاشریک لہ
کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں نیز یہ ضروری
ہے کہ رسولوں کی ایک قوم تکذیب کرے
اللہ عزوجل فرماتا ہے كَذٰلِكَ مَآ أَتَى
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا قَالُوْا
سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُوْنٌ (اسی طرح ان سے پہلے
لوگوں کے پاس جو رسول آیا تو یہی کہا کہ
جادوگر ہے یا دیوانہ) اور ارشاد ہے مَا يُقَالُ
لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ
(تجھ سے وہی کہیں گے جو کہہ دیا ہے سب رسولوں
سے تجھ سے پہلے) وجہ یہ ہے کہ رسول مخالفوں
ہی کی طرف بھیجے جاتے ہیں اس لئے ان کی
ایک جماعت ان کو جھٹلاتی ہے، ارشاد
ہے وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا
نُّوْحِيْ إِلَيْهِمْ مِّنْ أَهْلِ الْقُرٰى ۗ أَفَلَمْ
يَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ
خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۗ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ حَتّٰى
إِذَا اسْتَيْأَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ
قَدْ كُذِبُوْا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ
نَّشَاءُ ۖ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ
الْمُجْرِمِيْنَ ۝ (اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے
یہی مرد تھے کہ حکم بھیجتے تھے ہم ان کو بستیوں
کے رہنے والے سو کیا یہ لوگ نہیں پھرے
ملک میں کہ دیکھ لیتے کیسا ہوا انجام ان کا جو
ان سے پہلے تھے اور پچھلا گھر تو بہتر ہے پرہیز
کرنیوالوں کو، کیا اب بھی تم نہیں سمجھتے یہانتک
کہ جب نا امید ہونے لگے رسول اور

خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا تھا پہنچی ان کو مدد ہماری، پھر بچا دیا جن کو ہم نے چاہا اور پھیری نہیں جاتی آفت ہماری قوم گنہگار سے) اور فرمایا اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگانی میں اور جب کھڑے ہونگے گواہ)

ارشاد ربانی وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اس امر کی دلیل ہے کہ نبی بھی مرسل ہی ہوتا ہے لیکن اطلاق کے وقت وہ رسول سے موسوم نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ کسی قوم کی طرف ایسی باتیں لے کر نہیں بھیجا گیا کہ جن سے وہ واقف نہ ہوں بلکہ اہل ایمان کو ان باتوں کا حکم دیتا تھا کہ جن کے حق ہونے کو وہ جانتے ہیں جو نوعیت کہ ایک عالم کی ہوتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے ارشاد فرمایا ہے العلماء ورثۃ الانبیاء (علماء انبیاء کے وارث ہیں)۔

نیز رسول کی شرط یہ بھی نہیں ہے کہ وہ نئی شریعت ہی لے کر آئے کیوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام باوجود رسول ہونے کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر تھے۔ نیز حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام دونوں کے دونوں رسول تھے اور شریعت تورات پر تھے، حق تعالیٰ مومن آل فرعون کی زبانی فرماتے ہیں وَلَقَدْ جَآءَكُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا (اور تمہارے پاس آچکا ہے یوسف اس سے پہلے کھلی باتیں لے کر پھر تم رہے دھوکے ہی میں ان چیزوں سے جو وہ لایا یہاں تک کہ جب مر گیا کہنے لگے ہرگز نہ بھیجے گا اللہ اس کے بعد کوئی رسول) اور فرمایا اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ كَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِیْسٰى وَاَیُّوْبَ وَیُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَیْمٰنَ وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَیْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَیْكَ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِیْمًا (ہم نے وحی بھیجی

تیری طرف جیسے وحی بھیجی نوح پر اور ان نبیوں پر جو اس کے بعد ہوئے اور وحی بھیجی ابراہیم پر اور اسمٰعیل پر اور اسحٰق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر اور عیسٰے پر اور ایوب پر اور یونس پر اور ہارون پر اور سلیمان پر اور ہم نے دی داؤد کو زبور اور بھیجے ایسے رسول جن کا احوال ہم نے سنایا تجھ کو اس سے پہلے اور ایسے رسول جن کا احوال نہیں سنایا تجھ کو اور باتیں کیں اللہ نے موسٰی سے بول کر۔

اور ارسال اسم عام ہے جو ارسالِ ملائکہ ارسالِ ریاح، ارسالِ شیاطین اور ارسالِ نار، سب پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَاسٌ (چھوٹتے ہیں تم پر شعلے آگ کے صاف اور دھواں ملے) اور ارشاد ہے جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا أُولِي أَجْنِحَةٍ (جس نے ٹھہرائے فرشتے پیغام لانے والے جن کے پر ہیں) یہاں سب فرشتوں کو رسول قرار دیا گیا ہے اور ملک لغت میں اس کو کہتے ہیں جو الوکہ یعنی رسالت کا حامل ہو اور دوسری جگہ فرمایا اللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ (اللہ چھانٹ لیتا ہے فرشتوں میں پیغام پہنچانے والے اور آدمیوں میں) اور یہ وہ ہیں جن کو وحی دے کر بھیجتا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ (اور کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اشارہ سے یا پردے کے پیچھے یا بھیجے کوئی پیغام لانے والا پھر پہنچا دے اس کے حکم سے جو وہ چاہے)

اور فرمایا هُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ (وہی ہے کہ چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والی مینہ سے پہلے) اور ارشاد فرمایا إِنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا (ہم نے چھوڑ رکھے ہیں شیطان منکروں پر اچھالتے ہیں ان کو ابھار کر) لیکن لفظ رسول جب کہ اللہ کی طرف مضاف ہو اور رسول اللہ کہا جائے تو اس سے وہی سمجھا جائے گا جو اللہ کی طرف سے پیغام لے کر آئے خواہ فرشتہ ہو خواہ بشر ہو چنانچہ ارشاد ہے اللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ اور فرشتے کہتے ہیں

يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ (اے لوط ہم بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے وہ ہرگز نہ پہنچ سکیں گے تجھ تک) اور عام فرشتوں اور ہواؤں اور جنوں کا ارسال کسی فعل کی انجام دہی کے لئے ہوتا ہے تبلیغِ رسالت کے لئے نہیں، اللہ فرماتا ہے اُذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ؕ (یاد کرو احسان اللہ کا جب چڑھ آئیں تم پر فوجیں پھر ہم نے بھیجدی ان پر ہوا اور وہ فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں اور ہے اللہ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھنے والا) پس اللہ کے جو رسول اللہ کی طرف سے امر و نہی کی تبلیغ کرتے ہیں عندالاطلاق یہی اللہ کے رسول ہیں۔" [1]

غرض امامِ موصوف کے نزدیک جس کو اللہ کی طرف سے وحی آئے اور وہ مومنین ہی کو احکام الٰہی کی تعلیم دے وہ نبی ہے اور جو اس کی دعوت کا فردل کے لئے بھی عام ہو تو رسول ہے امام موصوف نے طبقاتِ انبیاء کے سلسلہ میں بھی

ایک اہم فرق واضح کیا ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہے، فرماتے ہیں:-

"(جس طرح اولیاء اللہ میں دو طبقے ہیں سابقین مقربین اور اصحابِ یمین مقتصدین) اسی کی نظیر انبیاء علیہم السلام میں 'عبد رسول' اور 'نبی ملک' کی تقسیم ہے، حق سبحانہ تعالیٰ نے حضرتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں کے درمیان اختیار عطا فرمایا تھا کہ خواہ 'عبد رسول' بنیں خواہ 'نبی ملک' آپ نے "عبد رسول" بننا اختیار فرمایا پس "نبی ملک" تو جیسے داؤد علیہ السلام اور ان کے امثال ہیں، اللہ تعالیٰ حضرتِ سلیمان پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قصے میں ارشاد فرماتا ہے قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ۙ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ۙ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (اس نے عرض

[1] ملاحظہ ہو کتاب النبوات، ص ۱۷۲ و ۱۷۳ و ۱۷۴ (طبع منیریہ مصر ۱۳۴۶ھ)

کیا کہ اے میرے رب مجھے بخش دے اور مجھ کو عطا فرما ایسی بادشاہی کہ کسی کو سزاوار نہ ہو میرے بعد بیشک، تو بہت دینے والا ہے تو ہم نے اس کا تابع بنا دیا ہوا کو کہ چلتی تھی اس کے حکم سے نرم نرم جہاں پہنچنا چاہتا اور شیطان سارے عمارت بنانے والے اور غوطے لگانے والے اور کتنے اور بندھے ہوئے بیڑیوں میں یہ ہے ہماری عطا پس احسان کر یا رکھ چھوڑ کچھ حساب نہیں، پس "نبی ملک" پر جو کچھ فرض کیا گیا وہ اس کو انجام دیتا ہے اور جس کو اللہ نے اس پر حرام کر دیا اسے ترک کر دیتا ہے اور ولایت و مال میں جس طرح پسند کرتا اور مناسب سمجھتا ہے تصرف کرتا ہے بغیر اس کے کہ اس پر کچھ گناہ ہو۔

لیکن "عبد رسول" بغیر اپنے رب کے حکم کے کسی کو نہیں دیتا اور نہ نہیں کرتا کہ جسے چاہے عطا کر دے اور جسے چاہے محروم رکھے بلکہ جس کو عطا کرنے کا رب حکم دے اسے عطا کرتا اور جس کی تولیت کا امر کرے اسے والی بناتا ہے پس اس کے سارے کے سارے کام اللہ تعالیٰ کی عبادات ہیں چنانچہ صحیح

بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا انی واللہ لا اعطی احدا ولا امنع احدا انما انا قاسم اضع حیث امرت میں اللہ کی قسم نہ کسی کو عطا کرتا ہوں اور نہ کسی سے روکتا ہوں میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں جہاں مجھے حکم دیا گیا ہے رکھ دیتا ہوں۔

اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اموال شرعیہ کو اللہ اور رسول کی طرف منسوب کرتا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (کہہ دو کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا) اور مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ (جو کچھ دلایا، اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں والوں سے سو اللہ اور رسول کے لئے) اور وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ (اور جان رکھو کہ جو غنیمت لاؤ کچھ چیز سو اللہ کے واسطے اس میں سے پانچواں حصہ اور رسول کے واسطے)

اور اسی لئے اقوال علماء میں ظاہر تر یہی قول

ہے کہ یہ اموال ولی الامر کے اجتہاد کے مطابق وہاں خرچ کئے جائیں جہاں اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہو چنانچہ امام مالک اور دیگر سلف کا یہی مذہب ہے اور امام احمد سے بھی یہی مشہور ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے تین حصے کر دیئے جائیں چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ اسی کے قائل ہیں۔

مقصود یہاں یہ ہے کہ "عبد رسول" "نبی ملک" سے افضل ہے چنانچہ ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام افضل ہیں، حضرت یوسف حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام سے کہ مقربین سابقین ابرار اصحاب الیمین سے افضل ہیں۔" [1]

امام ابن تیمیہ نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ:-

" اولیاء اللہ میں سب سے افضل مرسلین ہیں اور مرسلین میں سب سے افضل اولوالعزم ہیں، نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اور ان اولوالعزم میں سب سے افضل محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین امام المتقین، سید ولد آدم اور امام الانبیاء ہیں" [1]

اور محدث ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ:-

" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جدِ امجد ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام افضل ہیں اور (بقیہ تینوں حضرات میں) ظاہر یہ ہے کہ نوح علیہ السلام افضل ہیں، پھر موسیٰ علیہ السلام پھر عیسیٰ علیہ السلام اور ہمارے شیخ المشائخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ان تینوں میں کون افضل ہے اس کے متعلق میں کسی روایت پر واقف نہیں ہو سکا"۔ [2]

انبیاء و رسل کی تعداد کے بارے میں جو روایتیں آئی ہیں ان پر تفصیلی بحث لفظ "انبیاء" کے ضمن میں گزر چکی ہے اور چونکہ ان روایتوں کو قطعیت کا درجہ حاصل نہیں، اس لئے علماء کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ ان کی تعداد کا مسئلہ ظنی ہے اعتقادی نہیں۔

جن میں بھی رسول ہوئے ہیں یا نہیں؟ علماء اس میں مختلف ہیں، ضحاک سے جب اس کے متعلق سوال ہوا تو کہنے لگے ہاں کیا اللہ کو یہ فرماتے ہوئے نہیں سنا یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ (اے جماعت جنوں کی اور آدمیوں

[1] الفرقان بین اولیاء الرحمٰن و اولیاء الشیطان، ص ۴۳ (طبع احمدی لاہور)

[2] المنح الازہر شرح الفقہ الاکبر ص ۱۰۵

کی؟ کیا نہ آئے تھے تمہارے پاس پیغمبر تمہیں میں سے)
یعنی انسانوں میں سے پیغمبر اور جنوں میں سے پیغمبر۔
کلبی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جن وانس دونوں میں رسول مبعوث ہوتے تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن وانس سب کی طرف مبعوث ہوئے۔ [1]

علامہ ابن حزم کہتے ہیں حدیث میں آیا ہے
وکان النبی یبعث فی قومہ۔ (اور نبی اپنی قوم میں مبعوث ہوتا تھا) اور جن قومِ انس میں سے نہیں لہٰذا ثابت ہوا کہ جن کے لئے بھی جن ہی میں انبیاء ہوئے ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ بجز ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ ان کی بعثت جن وانس کے لئے بالاتفاق عام ہے، انسانوں میں سے کوئی نبی جن کی طرف مبعوث نہیں ہوا۔ [1]

اور اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ جن میں کوئی رسول نہیں ہوا، صرف انسانوں میں رسول ہوئے ہیں، حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں:۔
"جمہور ضحاک کے استدلال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "رسلِ انس" وہ رسول ہیں جو انسانوں کی طرف اللہ کی جانب سے بھیجے گئے ہیں اور "رسلِ جن" کو اللہ نے زمین پر منتشر فرمایا کہ وہ "رسلِ انس" کی باتوں کو سنکر اپنی قوم کو تبلیغ کریں، اسی لئے ان کا کہنے والا کہتا ہے اِنَّا سَمِعْنَا کِتَابًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی الآیۃ (ہم نے سنی ایک کتاب جو اتری ہے، موسیٰ کے بعد)"۔ [2]

امام بغوی فرماتے ہیں:۔
"مجاہد کہتے ہیں کہ انسانوں میں رسول ہوئے ہیں اور جنوں میں رسول نذیر اور انہوں نے تلاوت کیا وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ (پھر گئے اپنی قوم کی طرف ڈرانے ہوئے) منذرین وہ ہیں جو پیغمبروں کی باتیں سنکر جو کچھ سنا جنوں میں جا کر اس کی تبلیغ کرتے ہیں اور جن میں پیغمبر نہیں ہوتے، اس صورت میں ارشادِ الٰہی رُسُلٌ مِّنْكُمْ میں "کُمْ" کی ضمیر ایک صنف یعنی صرف انس کی طرف راجع ہوگی جس طرح کہ ارشاد ہے یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ (نکلتا ہے ان سے موتی اور مونگا) حالانکہ کھاری سے نکلتا ہے شیریں سے نہیں اور فرمایا وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا (اور رکھا چاند ان میں اجالا)

[1] معالم التنزیل امام بغوی، ج ۲ ص ۱۵۲
[2] فتح الباری، ج ۶، ص ۲۴۵

حالانکہ وہ صرف ایک ہی آسمان میں ہے[۱]"۔

واضح رہے کہ قرآن مجید میں رسول سے کہیں فرشتہ مراد ہے اور کہیں نبی اس لئے حسب موقع و محل معنے لئے جائیں گے۔ نیز لفظ رسول کا اطلاق واحد اور جمع دونوں کے لئے ہوتا ہے، ارشاد ہے لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (آیا ہے تمہارے پاس رسول تم میں کا) اور اَنَا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (ہم پیغام لائے ہیں جہان کے صاحب کا) رَسُوْلٌ کی جمع رُسُلٌ ہے۔

۱/۱۱،۱۲ ۔ ۲/۱،۱۰ ۔ ۳/۸،۱۲،۱۳،۱۷ ۔ ۴/۵،۶،۷،۹،۱۰ ۔ ۵/۳،۵،۶،۸،۱۴ ۔ ۶/۲،۳،۱۰،۱۴ ۔ ۷/۱،۲،۳،۴ ۔ ۸/۱۵،۱۶ ۔ ۹/۲،۹،۱۰،۱۵،۱۷ ۔ ۱۰/۱،۸،۱۴،۱۷ ۔ ۱۱/۱،۴،۵،۱۰ ۔ ۱۲/۱۷ ۔ ۱۳/۱۲،۱۳ ۔ ۱۴/۱،۲ ۔ ۱۶/۵،۱۴ ۔ ۱۷/۲،۴،۱۷ ۔ ۱۸/۱۳،۱۴،۱۵،۱۶ ۔ ۱۹/۱،۶،۸،۱۱،۱۲،۱۳،۱۴ ۔ ۲۰/۱۴ ۔ ۲۱/۱۹ ۔ ۲۲/۲،۴ ۔ ۲۳/۱ ۔ ۲۴/۱۳ ۔ ۲۵/۹،۱۱،۱۴ ۔ ۲۶/۸،۱۰،۱۲،۱۸ ۔ ۲۷/۲،۱۷ ۔ ۲۸/۲،۴،۷،۹، ۔ ۲۸/۱۲،۱۶ ۔ ۲۹/۵،۶،۱۲،۱۳ ۔ ۳۰/۶،۱۶،۲۳ ۔

رُسُوْلَہٗ ۱/۱۵ ۔ ۲/۲ ۔ ۳/۱۳ ۔ ۴/۸ ۔ ۵/۸ ۔ ۱۴/۱۱ ۔ ۱۵/۲،۱۰،۱۱ ۔ ۱۶/۷،۱۷ ۔ ۱۸/۱۳ ۔ ۱۹/۲ ۔ ۲۰/۸،۹ ۔ ۲۲/۵ ۔ ۲۴/۹ ۔ ۲۵/۶ ۔ ۲۸/۱۱،۱۸ ۔ ۲۹/۱۳ ۔

رُسُوْلَا: دو بھیجے ہوئے، دو رسول، رَسُوْلٌ کا تثنیہ اصل میں رَسُوْلَانِ تھا، اضافت کے سبب نون تثنیہ حذف ہوگیا۔ ۱۶/۱۱ ۔

رَسُوْلُكُمْ: تمہارا پیغمبر، تمہارا رسول، رَسُوْلٌ مضاف كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۱/۱۲ ۔ ۹/۱۶ ۔

رَسُوْلُنَا: ہمارا پیغمبر، ہمارا رسول، رَسُوْلٌ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۶/۷ ۔ ۷/۲ ۔ ۲۸/۱۶ ۔

رَسُوْلُہٗ: اس کا پیغمبر، اس کا پیغمبر، رَسُوْلٌ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ،

۳/۶ ۔ ۴/۱،۱۳ ۔ ۵/۱۱،۱۷ ۔ ۶/۹،۱۲ ۔ ۹/۱۰،۱۵،۱۶،۱۷ ۔ ۱۰/۲،۷،۸، ۔ ۱۰/۹،۱۰،۱۱،۱۳،۱۴،۱۵،۱۶،۱۷،۱۸ ۔ ۱۱/۱،۲ ۔ ۱۵/۱۲،۱۳،۱۷ ۔ ۲۱/۱۸،۱۹،۲۰ ۔ ۲۲/۱،۲،۴،۶ ۔ ۲۶/۹،۱۰،۱۱،۱۲،۱۳،۱۴ ۔ ۲۷/۱۷،۲۰ ۔ ۲۸/۱،۲،۳،۴،۹،۱۰،۱۳،۱۵ ۔ ۲۹/۱۲ ۔

رَسُوْلُهَا: اس کا پیغمبر، اس کا رسول، رَسُوْلٌ مضاف هَا ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۵/۳ ۔

رَسُوْلُهُمْ: ان کا پیغمبر، ان کا رسول، رَسُوْلٌ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۱۱/۱۰ ۔ ۱۸/۴ ۔ ۲۴/۶ ۔

رَسُوْلِیْ: میرا پیغمبر، میرا رسول، رَسُوْلٌ مضاف

---

[۱] فتح الباری، ج ۶، ص ۲۴۵

[۲] معالم التنزیل، ج ۲، ص ۲۵۲

ی ضمیر واحد متکلم، مضاف الیہ، ۲پ ۔

فصل الشین المعجمۃ

رَشَادٌ: نیکی، راستی، بھلائی رَشَدَ یَرْشُدُ کا مصدر ہے، اس کے معنی راہِ راست اختیار کرنے کے ہیں، ۲۴/۱۰۹ ۔

رُشْدٌ: ہدایت، صلاحیت، راہ یابی، بھلائی، راستی، ہوشیاری، حسنِ تدبیر، رَشَدَ یَرْشُدُ کا مصدر ہے، ہدایت کی جگہ استعمال ہوتا ہے، آیہ شریفہ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (پھر اگر دیکھو ان میں ہوشیاری تو حوالے کر دو ان کے مال) میں "رُشد" سے مراد صلاحیت ہے دین میں اور مال کے تصرف میں، صلاحِ دینی سے مراد یہ ہے کہ ان فواحش و معاصی سے مجتنب رہے جو عدالت کو ساقط کر دیتے ہیں اور مال میں صلاح کا یہ مطلب ہے کہ فضول خرچ نہ ہو یعنی ایسی جگہ مال خرچ نہ کرے کہ جہاں دنیا کی کوئی خوبی اور آخرت کا کوئی ثواب نہ ہو، نیز مال کا صرف کرنا جانتا ہو کہ لین دین میں غبن نہ اٹھائے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر یتیموں سے رُشد نہ دیکھا جائے تو ان کو مال سپرد نہ کیا جائے۔ امام شافعی، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چونکہ اٹھارہ برس سنِ بلوغ کی آخری حد ہیں اس لئے سات برس زائد یعنی پچیس برس کے سن تک اور انتظار کیا جائے کیونکہ سات برس کی مدت تغیرِ احوال کے لئے معتبر ہے، طفل کو اس مدت میں تمیز ہو جاتی ہے اور اس پر نماز کا حکم کیا جاتا ہے پس اس قدر انتظار کر کے اس کا مال اس کے حوالے کر دیا جائیگا اگرچہ اس سے رشد نہ دیکھا جائے اور مفہوم سے استدلال کرنا ہمارے نزدیک ناتمام ہے اور اگر تسلیم بھی کیا جائے تو آیت میں لفظِ رشد نکرہ ہے پس ادنیٰ رشد جس پر بولا جاتا ہے وہ مراد ہوگا اور اس سن پر اس قدر پایا جاتا ہے، ۳/۲، ۹/۷، ۲۹/۱۱ ۔

رُشْدًا ۴/۱۲، ۱۵/۲۱ ۔

رَشَدًا: راستی، بھلائی، نیکی، راہ یابی، رَشَدَ یَرْشُدُ کا مصدر ہے اس کے معنی راہ راست پانے کے ہیں، امام راغب لکھتے ہیں:

"بعض علماء کا بیان ہے کہ رَشَدَ یَرْشُدُ سے اخص ہے کیونکہ رُشد امورِ دنیویہ اور اخرویہ دونوں میں استعمال ہوتا ہے اور رَشَد صرف

امور اخروی میں بولا جاتا ہے اور رَاشِدٌ اور رَشِیْدٌ دونوں کے لئے آتے ہیں ارشاد ہے اُولٰٓئِکَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ (وہ لوگ ہی ہیں نیک چال پر) اور مَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ (نہیں بات فرعون کی نیک چال رکھتی)

۲۹/۱۲،۱۱ ، ۱۵/۱۳،۱۶ -

رُشْدَهٗ: اس کی راہ یابی، اس کی نیک راہ، اس کی ہدایت، رُشْدَ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، ۱۷/۵ -

رَشِیْدٌ: نیک چال والا، بھلائی والا، شائستہ، رُشْدٌ سے بروزن فَعِیْلٌ بمعنی فاعل ہے، ۱۲/۹،۸،۷ -

فصل الصّاد المهملة

رَصَدًا: چوکیدار، نگہبان گھات، رَصَدَ یَرْصُدُ کا مصدر ہے جس کے معنی نگاہ رکھنے اور گھات لگانے کے ہیں، واضح رہے کہ مصدر مذکور اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں کے معنی میں مستعمل ہے نیز واحد تثنیہ اور جمع سب کے لئے آتا ہے قرآن مجید میں جہاں لفظ رَصَد کا استعمال ہوا ہے ان سب معانی کا احتمال ہے۔ ۲۹/۱۲،۱۱ -

فصل الضّاد المعجمة

رَضَاعَةَ: دودھ پلانا، شیرخوارگی، مصدر ہے اور اس کا فعل باب ضَرَبَ، سَمِعَ اور فَتَحَ تینوں سے مستعمل ہے، لغت میں اس کے معنی مطلقاً بالپستان سے دودھ پینے کے ہیں اور شرعاً بچہ کا حقیقۃً یا حکماً وقت مخصوص میں عورت کے خالص یا ملے ہوئے دودھ کو جبکہ دودھ غالب ہو، پینے کا نام ہے[۱] حکماً پینے کا مطلب حلق میں ڈالنا یا ناک کے ذریعہ پیٹ میں اتارنا ہے، ۲/۱۴ ، ۲۸/۱۵ -

رَضُوْا: وہ راضی ہوئے، وہ خوش ہوئے، انہوں نے پسند کیا، رِضًی سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، راغب لکھتے ہیں:-

"بندے کا اللہ سے راضی ہونا یہ ہے کہ جو کچھ اس پر قضاء الٰہی جاری ہو وہ اسے مکروہ نہ سمجھے اور اللہ کا بندہ سے راضی ہونا یہ کہ اس کو اپنے حکم کا فرمانبردار اور اپنی نہی سے پرہیزگار دیکھے"

(ملاحظہ ہو تَرْضٰی) ۲/۶ ، ۱۰/۱۸،۱۷،۱۳ ، ۱۱/۴،۲ ، ۲۸/۳ ، ۳۰/۲۳ -

[۱] جامع الرموز، ص ۲۱۷ (طبع نولکشور)

رِضْوَانُ : رضامندی، خوشنودی، مرضی، رضا، رَضِیَ یَرْضٰی کا مصدر ہے "رضا کثیر" یعنی بڑی رضامندی اور نہایت خوشنودی کو "رِضْوان" کہتے ہیں اور چونکہ سب سے بڑی رضا اللہ کی رضا ہے اس لئے قرآنِ مجید میں "رضوان" کا لفظ جہاں بھی استعمال ہوا ہے، رضاء الٰہی کے لئے مخصوص ہے،

پ ۳/۱۰، ۴/۸، ۹/۹، ۱۵/۱۰، ۲/۱۱، ۱۹/۲۷، ۲۰/۲۸ -

رِضْوَانًا پ ۶/۵، ۲۶/۱۲، ۲۸/۴ -

رِضْوَانَہٗ : اس کی رضا، اس کی خوشنودی، رِضْوَانَ مضاف ۂ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ

پ ۶/۷، ۲۶ -

رَضِیَ : وہ راضی ہوا، وہ خوش ہوا، اس سے پسند کیا، رَضِیَ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب

(ملاحظہ ہو تَرْضٰی) پ ۶/۶، ۱۱/۲، ۱۶/۱۵، ۲۶/۱۱، ۲۸/۳، ۳۰/۱۳ -

رَضِیًّا : پسندیدہ، من مانتا، رَضِیَ سے صفت مشبہ کا صیغہ، فَعِیْلٌ بمعنی مَفْعُوْلٌ ہے، پ ۱۶/۴ -

رَضِیْتُ : میں راضی ہوا، میں خوش ہوا، میں نے پسند کیا، رَضِیَ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم (ملاحظہ ہو تَرْضٰی) پ ۶/۵ -

رَضِیْتُمْ : تم راضی ہوئے، تم خوش ہوئے، تم نے پسند کیا رَضِیَ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ ۱۰/۱۲، ۱۷ -

فصل الطاء المہملۃ

رَطْبٍ : ہرا، تر، یابِسٌ کی ضد ہے جس کے معنی سوکھے اور خشک کے ہیں اور رُطُوْبَۃٌ سے جس کے معنی تر ہونے کے ہیں، صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے، آیتِ شریفہ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (اور نہ ہرا اور نہ سوکھا جو نہیں کھلی کتاب میں) کی تفسیر میں علامہ خازن بغدادی لکھتے ہیں :-

"ابنِ عباس (رضی اللہ عنہما) کا بیان ہے کہ رطب پانی اور یابس صحرا ہے اور عطار کہتے ہیں کہ اگنے والی اور نہ اُگنے والی چیزیں مراد ہیں، اور بعض کا قول ہے کہ رطب سے زندہ اور یابس سے مردہ مراد ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ہر شے سے عبارت ہے کیونکہ جمیع اشیاء یا رطب یا یابس" لہ پ ۷/۱۲

رُطَبًا : تازہ، خرما، تازہ کھجوریں، پکی کھجوریں، رُطَبَۃٌ واحد اور رِطَابٌ اور اَرْطَابٌ جمع الجمع، پ ۱۶/۵ -

لہ تفسیر لباب التاویل فی معانی التنزیل، ج ۲، ص ۱۱۶ -

فصل العین المہملۃ

رِعَآءُ: چرواہے، رَاعِی کی جمع جس کے معنی چرواہے کے ہیں، رَاعِی رَعْیٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو اِرْعَوْا) ۲۰/۶ ۔

رِعَایَتِھَا: اس کی نگاہ رکھنا، اس کو نباہنا، اس کی نگہداشت کرنا، رِعَایَۃٌ رَعٰی یَرْعٰی کا مصدر ہے بمعنی حفاظت اور نگرانی کرنے کے، مضاف ہے ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، ۲۷/۲۰ ۔

رُعْبٌ: رعب، ہیبت، دھاک، دہشت، خوف، ڈر، رَعَبَ یَرْعَبُ کا مصدر ہے، راغب نے اس کے معنی خوف سے بھرپور ہونے کے سبب منقطع ہو جانے کے لکھے ہیں، ۷/۴ ۹/۱۶ ۲۱/۱۹ ۲۸/۴ ۔

رُعْبًا، ۱۵/۱۵ ۔

رَعْدٌ: کڑک، گرج، گرجنے والا، یہ اصل میں مصدر ہے بمعنی کڑکنے اور گرجنے کے، اس کا فعل باب نَصَرَ و فَتَحَ سے آتا ہے اور ابر کی کڑک اور گرج کے لئے بطور اسم مستعمل ہے امام بغوی نے معالم التنزیل میں تصریح کی ہے کہ اکثر مفسرین کے نزدیک رَعْد اس فرشتہ کا نام ہے جو ابر کو ہانکتا اور چلاتا ہے[1] جامع ترمذی میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس سلسلہ میں ایک روایت منقول ہے کہ یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ بتائیے رَعْد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ایک فرشتہ ہے جو ابر پر متعین ہے[2] ۱/۲ ۱۳/۸ ۔

رَعَوْھَا: انہوں نے اس کو نباہا، انہوں نے اس کی رعایت کی، انہوں نے اس کی نگہداشت کی، رَعَوْا رِعَایَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب، ۲۷/۲۰ ۔

فصل الغین المعجمۃ

رَغَبًا: رغبت، توقع، رَغِبَ یَرْغَبُ کا مصدر ہے، امام راغب لکھتے ہیں:-

"رَغْبَۃٌ، رَغَبٌ اور رُغْبٰی کے معنی ارادہ یعنی خواہش میں وسعت کے ہیں، اللہ فرماتا ہے وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَھَبًا (اور پکارتے تھے ہم کو توقع اور ڈر سے) پس جب رَغِبَ فِیْہِ اور رَغِبَ اِلَیْہِ کہا گیا تو یہ اس شے پر حرص کو چاہتا ہے ارشاد الٰہی ہے اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رَاغِبُوْنَ (ہم اپنے رب سے آرزو رکھتے ہیں)

[1] معالم التنزیل، ج ۴، ص

[2] الاتقان، ج ۲، ص ۱۴۱

اور جب رَغِبَ عَنْہُ کہا گیا تو یہ اس سے بے رغبتی اور بیزاری کا مقتضی ہے جیسے اللہ کا قول ہے وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّۃِ اِبْرٰھِیْمَ (اور کون پسند نہ رکھے دین ابراہیم کا) اور اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِھَتِیْ (کیا تو پھرا ہوا ہے میرے معبودوں سے)" [۱]۔

رَغَدًا: بافراغت، وسیع، خوب اچھی طرح، یہ اصل میں سَمِعَ کا مصدر ہے بمعنی بہت نعمت ہونے کے اور صفتِ مشبہ ہو کر مستعمل ہے نیز رَاغِد کی جمع بھی ہے جیسے خَدَمٌ خَادِمٌ کی، آیتِ شریفہ فَکُلُوْا مِنْھَا حَیْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا (اور کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو محظوظ ہو کر) میں رَغَدًا بمعنی صفت بھی ہو سکتا ہے اور جمع بھی بمعنی رَاغِدِیْنَ کے، [۱] [۲]۔

فصل الفاء

رُفَاتًا: بوسیدہ، گلا ہوا، چورا، جو چیز خشک گھاس کی طرح بوسیدہ ہو کر چورا چورا ہو جائے، رُفَات، کہلاتی ہے، رَفْتٌ سے مشتق ہے جس کے معنی چورا چورا کرنے اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کے ہیں، [۱]

رَفَثَ: عورتوں سے اختلاط کرنا، عورتوں سے بے پردہ ہونا، عورتوں کی طرف رغبت کرنا، رَفَثَ یَرْفُثُ کا مصدر ہے، اس کے معنی فحش بات کہنے اور جماع کرنے کے ہیں، قاضی بیضاوی "رفث" کے معنی بیان کرتے ہیں:۔

ھو الافصاح بما یجب ان یکنی عنہ — جس چیز کو کنایہ سے کہنا واجب ہے اس کو کھول کر کہنا"

ان کا بیان ہے کہ جماع سے کنایہ ہے کیونکہ جماع تقریباً رفث سے خالی نہیں ہوتا۔

زجاج نے جو ائمہ لغت میں سے ہیں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

الرفث کلمۃ جامعۃ لکل ما یریدہ الرجال من النساء — رفث ایک ایسا کلمہ ہے جو ہر اس چیز پر شامل ہے جس کی مرد عورتوں سے خواہش کرتے ہیں۔

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:۔

" رفث وہ کلام ہے جو جماع اور دواعی جماع یعنی جماع پر برانگیختہ کرنے والی اشیاء کے ذکر پر مشتمل ہو کہ جن کا بیان کرنا قبیح سمجھا جاتا ہے

---

[۱] تفسیر انوار التنزیل، ج ۱، ص ۵ (طبع مصر ۱۳۲۰ھ) [۲] تفسیر معالم التنزیل، ج ۱، ص ۱۳۶ (طبع مصر ۱۳۳۱ھ) حافظ ابن حجر نے بھی زہری سے یہی نقل کیا ہے الرفث اسم جامع لکل ما یرید الرجل من المرأۃ (فتح الباری، ج ۳، ص ۳۰۲)

ارشادِ الٰہی اُحِلَّ لَکُمۡ لَیۡلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمۡ (حلال ہوا تم کو روزے کی رات میں بے پردہ ہونا اپنی عورتوں سے) میں رفث کو یہ بتلاتے ہوئے کہ اس طرف عورتوں کو بلانا اور اس معاملہ میں ان سے گفتگو کرنا جائز ہے، جماع سے کنایہ قرار دیا گیا ہے اور بذریعہ الیٰ تعدیہ اس لئے ہوا کہ یہ افضاء کے معنی پر مشتمل ہے اور آیت فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ (تو بے پردہ ہونا نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا) محتمل ہے کہ جماع کرنے سے ممانعت ہو نیز یہ کہ اس کی گفتگو سے نہی ہو کیونکہ وہ دواعی جماع میں داخل ہے اور احتمالِ اول اصح ہے۔"

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:-

"حق تعالیٰ حیا والے ہیں کریم ہیں، کنایہ سے کام لیتے ہیں، جہاں کہیں قرآن مجید نے مباشرۃ، ملامسۃ، افضاء، دخول اور رفث کا ذکر فرمایا ہے اس سے جماع مراد لیا ہے۔"[۲]

محی السنہ بغوی آیہ شریفہ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:-

"رفث کے بارے میں علما مختلف ہیں ابن مسعود ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم نے اس کو جماع کہا ہے اور یہی قول حسن (البصری) مجاہد عمرو بن دینار، قتادہ، عکرمہ، ربیع اور ابراہیم نخعی کا ہے اور علی بن ابی طلحہ ابن عباس سے راوی ہیں کہ "رفث" کے معنی عورتوں سے صحبت کرنے، بوسہ لینے، اشارے کرنے اور فحش بات کے ذریعہ عورت کو چھیڑنے کے ہیں حصین بن قیس کا بیان ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے اونٹ کی دم پکڑی اسے بلانے لگے اور ہدی گاتے ہوئے کہنے لگے ؎

وھن یمشین بنا ھمیسا
ان نصدق الطیر ننک لمیسا[۳]

میں نے ان سے کہا کہ آپ حالتِ احرام میں رفث میں مبتلا ہیں، کہنے لگے رفث وہ ہے جو

---

[۱] علامہ ابو جعفر بیہقی نے تاج المصادر میں تصریح کی ہے کہ یہ اس اصول کی بنا پر ہے کہ کسی شے کو اسکی نظیر کے قائمقام کر دیا جائے پس جس طرح فضیت کا تعدیہ الیٰ کے ذریعہ کیا جاتا ہے اسی طرح اس کو بھی تعدیہ الیٰ کے ذریعہ ہوا۔ عہ ملاحظہ ہو افضی۔

[۲] معالم التنزیل، ج ۱، ص ۱۳۶ [۳] ہمیس، اونٹ کے قدم اٹھانے کی آواز کا نام ہے اور لمیس محبوبہ کا۔

عورتوں کے سامنے ہو، طاؤس کہتے ہیں رفث عورتوں سے جماع کی چھیڑ چھاڑ اور ان کے سامنے اس کا ذکر ہے، عطار کا قول ہے کہ مرد کا حالت احرام میں عورت سے یہ کہنا کہ جب تو احرام اتاریگی تو میں تجھ سے صحبت کروں گا "رفث" ہے اور بعض کا قول ہے کہ رفث کے معنی فحش اور بیہودہ بات کے ہیں[1]"

حافظ ابن حجر عسقلانی حدیث من حج للّٰہ فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدتہ امہ (جس نے اللہ کے واسطے حج کیا پھر نہ عورت سے صحبت کی نہ صحبت کی بات کی اور نہ گناہ کیا تو اسطرح واپس ہوتا ہے کہ جیسں دان ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا) کی شرح میں لکھتے ہیں :-

" آیت میں جمہور کے نزدیک رفث سے جماع مراد ہے اور جو ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں رفث سے اس سے زیادہ عام مراد ہے اور اسی کی طرف قرطبی مائل ہیں اور یہی اس حدیث سے مراد ہے جو صیام کے بارے میں وارد ہے فاذا کان صوم احدکم فلا یرفث (جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو بیہودہ کلام نہ کرے[2]" $\frac{۲}{۹،۷}$ ۔

رِفْدٌ : بخشش، عطا، انعام، مدد اَرْفَادٌ اور رُفُوْدٌ جمع، $\frac{۱۲}{۹}$ ۔

رَفْرَفٌ : قالین، چاندنیاں، تکیے، علامہ زمخشری الفائق میں لکھتے ہیں :-

" الرفرف ما کان من الدیباج وغیرہ رقیقا حسن الصبغۃ۔ رفرف دیباج وغیرہ کا باریک خوش رنگ کپڑا ہے۔

علامہ موصوف نے اس کی جامع تعریف کی ہے اور چونکہ اس کپڑے کے گدے، تکیے، چاندنیاں، خیمے اور فرش فروش تیار ہوتے ہیں اس لئے ان سب معانی میں اس کا استعمال ہوتا ہے چنانچہ امام بغوی رقمطراز ہیں :-

" سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ رفرف جنت کے ہرے بھرے باغیچے ہیں، ابن عباس سے بھی یہی مروی ہے، اس کا واحد رفرفہ ہے اور جمع الجمع رفارف، اور بعض کہتے ہیں درفرش کو رفرف بتاتے ہیں حسن (بصری) مقاتل اور

---

[1] معالم التنزیل، ج ۱، ص ۱۵۳

[2] فتح الباری، ج ۳، ص ۳۰۲ و ۳۰۳ (طبع میریہ ۱۳۰۰ھ)

[3] الفائق فی غریب الحدیث، ج ۱، ص ۲۴۶ (طبع دائرۃ المعارف)

قرطبی کا بھی قول ہے۔ عوفی، ابن عباس سے ادی ہیں کہ رفرف فرشتوں اور گدوں کا زائد حصہ ہے (غالباً جھالر یا کپڑے کا کنارہ مراد ہے جو تخت کے چاروں طرف لٹکا رہتا ہے) ضحاک اور قتادہ کا بیان ہے کہ یہ فرش کے اوپر کی سبز چاندنیاں ہیں، ابن کیسان کہتے ہیں کہ یہ گل تکیے (جن پر رخسار سے رکھتے ہیں) ہیں، ابن عیینہ نہالچے بتاتے ہیں اور ان کے علاوہ دیگر علماء کی تصریح ہے کہ عرب کے نزدیک ہر بڑے عرض کا کپڑا رفرف ہے[1]"

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

"رفرف بکھرے ہوئے پتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو عَلٰی رَفْرَفٍ خُضْرٍ (سبز چاندنیوں پر) فرمایا سو یہ ایک خاص قسم کے کپڑے ہیں جن کو (سبزی میں) باغات سے تشبیہ دی گئی ہے اور بعض کا قول ہے کہ رفرف میخوں اور طنابوں کے علاوہ خیمہ اور شامیانہ کے وہ کنارے ہیں جو زمین پر لٹکتے رہتے ہیں اور حسن (البصری) سے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ گل تکیے ہیں۔" ۲۷/۱۳۔

رَفَعَ: اس نے بلند کیا، اس نے اونچا کیا، اس نے پڑھایا (فتح) رَفْعٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَرْفَعُ) ۳/۲، ۵/۱۳، ۱۳/۴۔

رُفِعَتْ: وہ بلند کی گئی، رَفْعٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب، عربی میں لفظ سماء (آسمان) مؤنث مستعمل ہوتا ہے۔ ۳۰/۱۳۔

رَفَعْنَا: ہم نے بلند کیا، ہم نے اونچا کیا، ہم نے اٹھایا، رَفَعَ ماضی کا صیغہ جمع متکلم ۱/۸، ۱۱، ۶/۲، ۲۵/۹، ۳۰/۱۹۔

رَفَعْنٰهُ: ہم نے اس کو بلند کیا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے۔ ۹/۱۲۔

رَفَعَهُ: اس کو اٹھا لیا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، یہاں رفع سے رفع حقیقی جسمانی مراد ہے کیونکہ آیت میں اس کا تعدیہ بذریعہ اِلٰی ہے نیز سیاق اس معنی کو بتلا رہا ہے، اس معنی کا انکار بجز مکابرہ اور جہالت کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا (ملاحظہ ہو رَفَعَ و رَافِعُكَ) ۶/۲۔

رَفَعَهَا: اس کو بلند کیا، اس کو اونچا کیا، اس میں ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، ۲۷/۱۱۔

رَفِيْعٌ: بلند کرنے والا، بلند ہونے والا، رَفْعٌ سے بروزن فَعِيْلٌ بمعنے فاعل یعنی رَافِعٌ بھی ہو سکتا

[1] معالم التنزیل، ج ۷، ص ۱۲

ہے بمعنی بلند ہونے والے اور بلند کرنے والے کے اور بمعنی مفعول یعنی مرفوع بھی بمعنی بلند کئے ہوئے کے رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ اسماءِ حسنیٰ میں سے ہے اس کے دونوں معنی ہوسکتے ہیں، بلند مرتبوں والے کے بھی اور درجوں کے بلند کرنے والے کے بھی، ۲۴ ۔

رَفِيْقًا: رفیق، رِفَاقَۃٌ سے جس کے معنی رفیق ہونے اور بلطف پیش آنے کے ہیں بروزن فَعِيْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے رُفَقَاءُ جمع، خازن بغدادی لکھتے ہیں :۔

" رفیق کے معنی صاحب (ساتھی) کے ہیں، صاحب کا نام رفیق اس لئے پڑا کہ ہم اس سے اور اس کی صحبت سے نفع اندوز ہوتے ہیں اور رفیق حالانکہ جمع کی صفت واقع ہے مگر اس کو واحد لایا گیا کیونکہ عرب اسے واحد اور جمع دونوں میں استعمال کرتے ہیں "۔[1] ۵ / ۶

فصل القاف

رَقٍّ: کاغذ، ورق، جھلی۔ راغب لکھتے ہیں :۔

" کاغذ کی طرح جس میں لکھا جائے اس کا نام رق ہے، قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ رق وہ جھلی ہے جس میں لکھا جاتا ہے "۔[2] رُقُوْقٌ جمع، ۲۷ / ۳ ۔

رِقَابٌ: گردنیں، رَقَبَۃٌ کی جمع ہے، ۲ / ۱۲، ۲۶ / ۵ ۔

رَقَبَۃٌ: گردن، جان، غلام، رقبۃ اصل میں گردن کا نام ہے پھر جملہ بدن انسانی کے لئے اس کا استعمال ہونے لگا اور عرف میں یہ غلاموں کا نام پڑ گیا جس طرح کہ الفاظ رأس اور ظہر کا استعمال سواریوں کے لئے کیا جانے لگا۔ ۵ / ۱، ۷ / ۲، ۲۵ / ۱، ۳۰ / ۱۵ ۔

رُقُوْدٌ: خفتہ، سونے والے، رَاقِدٌ کی جمع ہے جیسے سَاجِدٌ کی سُجُوْدٌ، راقد رقود سے، جس کے معنی سونے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے، ۱۵ / ۱۵ ۔

رَقِيْبٌ: نگہبان، خبر رکھنے والا، محافظ، مطلع، منتظر، راہ دیکھنے والا، رُقُوْبٌ سے جس کے معنی نگاہ رکھنے اور نگرانی کرنے کے ہیں، بروزن فَعِيْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ، راغب لکھتے ہیں :۔

" رقیب حافظ یعنی نگران کو کہتے ہیں یا تو اس لئے

---

[1] لباب التاویل، ج ۱، ص ۴۰۵ [2] تفسیر انوار التنزیل، ج ۲، ص ۲۸۵، امام بغوی نے بھی یہی لکھا ہے ملاحظہ ہو معالم التنزیل، ج ۶، ص ۲۰۶

کہ وہ شخص محفوظ کی گردن کی حفاظت کرتا ہے،
اور یا اس لئے کہ وہ اپنی گردن اٹھائے رہتا ہے"
نیز رقیب، حق تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے
جب یہ ذات باری کی صفت واقع ہو تو اس
کے معنی ہیں :-
هو الذی لا یغفل "رقیب" وہ ذات ہے جو اپنی
عما خلق فیلحقہ مخلوق سے غافل نہیں ہوتی اسے
نقصا و یدخل نقصان پہنچے یا اس سے غفلت
علیہ خلل من قبل کی بنا پر اس میں خلل واقع
غفلتہ عنہ۔ ہو جائے۔
یہ امام حلیمی کا بیان ہے، زجاج کہتے ہیں :-
"رقیب وہ نگران ہے جس سے کوئی چیز غائب
نہ ہو، ارشادِ الٰہی ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا
لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (نہیں بولتا کوئی بات
مگر نزدیک اس کے نگہبان ہیں تیار) اسی سے
ماخوذ ہے"
امام بیہقی نے ان دونوں اقوال کو کتاب الاسماء و
الصفات میں نقل کیا ہے[1] پ ۱۲/۸ پ ۲۶/۱۶ ۔
رَقِيْبًا پ ۱۱/۱۲ ۔
رُقِيِّكَ : تیرا چڑھنا، رَقِيَ يَرْقَى کا مصدر

ہے اس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں، مضاف ہے
ک ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، پ ۱۵/۱۰ ۔
رَقِيْمٌ : نوشتہ، کتبہ، لکھا ہوا، ایک شہر
کا نام جو ملک شام کے اطراف میں بجانب شمال واقع تھا
امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں :-
"کہا گیا ہے کہ رقیم مقام کا نام ہے اور بعض کا قول
ہے کہ یہ (یعنی اصحاب الکہف والرقیم) اس پتھر
کی طرف منسوب ہیں جس پر ان کے نام تحریر
تھے"
امام محی السنۃ ابو محمد حسین فراء بغوی معالم التنزیل میں
فرماتے ہیں :-
"رقیم کے بارے میں مفسرین مختلف ہیں۔
سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ یہ وہ تختی ہے جس میں
"اصحاب کہف" کے نام اور ان کے حالات
لکھے گئے (بغوی کہتے ہیں) یہ سب اقوال میں
ظاہر تر ہے، پھر اس تختی کو لوگوں نے کہف،
کے دروازہ پر نصب کر دیا، یہ تختی سیسہ کی تھی
اور بعض کا قول ہے کہ پتھر کی تھی، اس
صورت میں رقیم بمعنی مرقوم
یعنی مکتوب (نوشتہ) ہے،

[1] ملاحظہ ہو کتاب الاسماء والصفات، ص ۵۹ (طبع انوار احمدی، الہ آباد)

اور رقم کے معنے کتابت کے ہیں اور ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے مروی ہے کہ انہوں نے اسے وادی کا نام بتایا ہے جس میں اصحاب الکہف تھے، اس صورت میں یہ رقمۃ الوادی سے ماخوذ ہے جس کے معنی وادی کے کنارہ اور جانب کے ہیں اور کعب احبار کا بیان ہے کہ یہ اس بستی کا نام ہے جہاں سے اصحاب کہف نکلے تھے اور بعض کا قول ہے کہ اس پہاڑ کا نام ہے جس میں کہف تھا۔[1]

واضح رہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس سلسلہ میں تین اقوال مروی ہیں، ایک تو یہی جس کو امام بغوی نے ذکر کیا اور ابن ابی حاتم بطریق عوفی ان سے راوی ہیں کہ رقیم، فلسطین سے ورے عقبان وایلہ کے درمیان ایک وادی ہے۔[2] دوسرا وہ جس کو عبد بن حمید نے بطریق سعید بن جبیر ان سے روایت کیا ہے کہ رقیم سیسہ کی تختی تھی، جس میں ان کے حکمراں نے ان لوگوں کے نام لکھ کر اس کو اپنے خزانہ میں داخل کرلیا تھا، امام بخاری نے بھی اس روایت کو اپنی صحیح میں تعلیقاً ذکر کیا ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس روایت کی اسناد کو بخاری کی شرط پر صحیح بتایا ہے، تیسرا وہ جس کو ابن مردویہ نے بطریق عکرمہ ان سے نقل کیا ہے کہ میں رقیم سے واقف نہ تھا پھر میں نے اس کے متعلق دریافت کیا تو مجھے بتایا گیا کہ یہ وہ بستی تھی جس سے وہ لوگ نکلے تھے، حافظ ابن حجر اس روایت کی اسناد کو ضعیف بتاتے ہیں۔[3]

طبری نے قتادہ اور عطیہ عوفی سے روایت کیا ہے کہ رقیم اس وادی کا نام ہے جس میں کہف واقع تھا، ابو عبیدہ کا بھی یہی قول ہے، ابن ابی حاتم حضرت انس رضی اللہ عنہ اور سعید بن جبیر سے راوی ہیں کہ رقیم کتے کا نام ہے[4] اور علامہ سیوطی نے الاتقان میں ابن ابی حاتم ہی کے حوالہ سے انہی سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ یہ ایک وادی ہے[5]، واللہ اعلم۔

واضح رہے کہ اس بارے میں صحیح تر قول حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اول ہے، انہوں نے جو اس کا جائے وقوع فلسطین سے ورے عقبہ وایلہ کے درمیان بیان

[1] معالم التنزیل، ج ۴، ص ۱۵۶ برحاشیہ خازن
[3] ملاحظہ ہو فتح الباری، ج ۸، ص ۳۰۸
[2] الاتقان، ج ۲، ص ۱۴۲ (طبع مصر)
[4] ایضاً، ج ۶، ص ۳۶۵ [5] الاتقان، ج ۲، ص ۱۴۲ طبع

فرمایا ہے "موجودہ اکتشافاتِ اثریہ نے اس کی حرف بحرف تصدیق کی ہے" ہم سابق میں اصحاب الکہف والرقیم کی بحث میں لکھ چکے ہیں کہ رقیم اس شہر کا نام ہے جہاں یہ واقعہ پیش آیا مفسرین سلف کی اکثریت اسی طرف گئی ہے اور چونکہ کہف یعنی غار اسی رقیم میں واقع تھا اس لئے قرآن مجید نے ان لوگوں کا ذکر "اصحاب الکہف والرقیم" کے الفاظ میں کیا ہے"
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، کعب احبار، قتادہ عطیہ عوفی اور ابو عبیدہ کی تصریحات ابھی آپ کی نظر سے گزریں کہ وہ سب اس کو ایک مقام کا نام بتاتے ہیں، فرق اتنا ہے کہ کوئی اسے بستی اور شہر کا نام قرار دیتا ہے اور کوئی وادی کا، لیکن درحقیقت یہ کوئی فرق نہیں کیونکہ شہر اور اس کی وادی یعنی حوالی شہر سب ایک ہی نام سے موسوم ہوتے ہیں مگر چونکہ اس شہر کا نام بدل کر بعد میں دوسرا رکھ دیا گیا اور اس کا اصلی نام مشہور نہ رہا اس لئے بعض اہل تفسیر کا ذہن اس جانب منتقل نہ ہو سکا کہ یہ کسی شہر کا نام ہے اور انہوں نے رقیم سے اس کے لغوی معنی نوشتہ اور کتبہ کے مراد لئے یا پھر قیاس سے کام لیکر اسے اصحاب کہف کا کتا سمجھ لیا۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی فرماتے ہیں:۔

"الرقیم" اس کو عبرانی میں "سلاع" اور یونانی میں "پٹرا" کہتے ہیں، یہ شمالی عرب میں پہلے مدیانی حکومت کے ماتحت ایک دار الامارۃ تھا پھر نبطی عربوں کا دار الحکومت ہوا، رومیوں کے عہد میں بھی اس کو خاص اہمیت ملی"۔ [1]

اور مولانا ابو الکلام آزاد، ترجمان القرآن میں رقمطراز ہیں:۔

"قرآن نے کہف کے ساتھ الرقیم کا لفظ بھی بولا ہے اور بعض ائمہ تابعین نے اس کا یہی مطلب سمجھا تھا کہ یہ ایک شہر کا نام ہے لیکن چونکہ اس نام کا کوئی شہر عام طور پر مشہور نہ تھا اس لئے اکثر مفسرین اس طرف چلے گئے کہ یہاں رقیم کے معنی کتابت کے ہیں یعنی ان کے غار پر کوئی کتبہ لگایا تھا اس لئے کتبہ والے مشہور ہو گئے۔

لیکن اگر انہوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ رقیم وہی لفظ ہے جسے تورات میں راقیم کہا گیا ہے اور یہ فی الحقیقت ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر پٹرا کے نام سے

[1] ارض القرآن، ج ۱، ص ۴۷ (طبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۴۳ھ)

مشہور ہوا اور عرب اسے "بطرا" کہنے لگے۔

عالمگیر جنگ کے بعد آثار قدیمہ کی تحقیقات کے جو نئے نئے گوشے کھلے ہیں ان میں ایک "پیٹرا" بھی ہے اور اس کے انکشافات نے بحث و نظر کا ایک نیا میدان مہیا کر دیا ہے۔

جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں تو دو پہاڑی سلسلے متوازی شروع ہو جاتے ہیں اور سطح زمین بلندی کی طرف اٹھنے لگتی ہے یہ علاقہ نبطی قبائل کا علاقہ تھا اور اسی کی ایک پہاڑی سطح پر راقیم نامی شہر آباد تھا، دوسری صدی عیسوی میں جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کر لیا تو یہاں کے دوسرے شہروں کی طرح راقیم نے بھی ایک رومی نوآبادی کی حیثیت اختیار کر لی اور یہی زمانہ ہے جب پیٹرا کے نام سے اس کے عظیم الشان مندروں اور تھیٹروں کی شہرت دور دور تک پہنچی، ۱۰۶ء میں جب مسلمانوں نے یہ علاقہ فتح کیا تو راقیم کا نام بہت کم زبانوں پر رہا تھا، یہ رومیوں کا پیٹرا اور عربوں کا بطرا تھا۔

جنگ کے بعد سے اس علاقہ کی از سر نو اثری پیمائش کی جا رہی ہے اور نئی نئی باتیں روشنی میں آ رہی ہیں، ازاں جملہ اس علاقہ کے عجیب و غریب غار ہیں جو دور دور تک چلے گئے ہیں اور نہایت وسیع ہیں، نیز اپنی نوعیت میں ایسے واقع ہوئے ہیں کہ دن کی روشنی کسی طرح بھی ان کے اندر نہیں پہنچ سکتی، ایک غار ایسا بھی ملا ہے جس کے دہانہ کے پاس قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بے شمار ستونوں کی کرسیاں شناخت کی گئی ہیں خیال کیا گیا ہے کہ کوئی معبد ہو گا جو یہاں تعمیر کیا گیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا اور قرآن نے صاف صاف اس کا نام الرقیم بتلا دیا ہے اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ رقیم کے معنی میں تکلفات کئے جائیں اور بغیر کسی بنیاد کے اسے کتبہ پر محمول کیا جائے۔

علاوہ بریں دوسرے قرائن بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

قرآن نے جس طرح اس واقعہ کا ذکر کیا ہے

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی عرب میں شہرت تھی، لوگ اس بارے میں بحثیں کیا کرتے تھے اور اسے ایک نہایت ہی عجیب و غریب بات تصور کرتے تھے، اب یہ ظاہر ہے کہ مشرکین عرب کے وسائلِ معلومات محدود تھے، بہت کم امکان ہے کہ دور کی بحثیں ان کے علم میں آئی ہوں، پس ضروری ہے کہ یہ قریب حجاز ہی کی کوئی بات ہو اور ان لوگوں کی زبانی سنی جاسکے جن سے عربوں کا ملنا جلنا رہتا ہو ایسے لوگ کون ہو سکتے تھے؟ اگر اسے پیٹرا کا واقعہ قرار دیا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے، اول تو خود یہ مقام عرب سے قریب تھا یعنی عرب کی سرحد سے ساٹھ ستر میل کے فاصلہ پر، ثانیاً نبطیوں کی وہاں آبادی تھی اور نبطیوں کے تجارتی قافلے برابر حجاز آتے جاتے تھے، یقیناً نبطیوں میں اس واقعہ کی شہرت ہوگی اور ان ہی سے عربوں نے سنا ہوگا، خود قریش مکہ کے تجارتی قافلے بھی ہر سال شام جایا کرتے تھے اور سفر کا ذریعہ وہی شاہراہ تھی جو رومیوں نے ساحل خلیج سے لے کر ساحل مارمورا تک تعمیر کردی تھی[1] "پیٹرا" اسی شاہراہ پر واقع تھا بلکہ اس نواح کی سب سے پہلی تجارتی منڈی تھی اس لئے اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ ان کے علم میں آگیا ہو"[2]

(مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اَصْحٰبُ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ) ۱۵/۱۳ -

فصل الکاف

رِكَاب: اونٹ سواری، رَكِبَ سے اسم ہے، قاضی بیضاوی نے تصریح کی ہے کہ "رِكَاب" اونٹ کی سواری ہے جس طرح راکب کا استعمال شتر سوار کے لئے غالب ہے، اسی طرح اس کا استعمال اونٹ کے معنی میں غالب ہے[3]، اس کا واحد رَاحِلَةٌ ہے (علی غیر لفظہ) اور رُكُبٌ، رَكَائِبُ اور رِكَابَات جمع ہے (ملاحظہ ہو رَكِبَ) ۲۵/۳ -

[1] جنگ کے بعد اس شاہراہ کا سراغ لگایا گیا تو پوری طرح نمایاں ہوگئی، اب یہ اپنے اصلی خط پر دوبارہ تعمیر کی جارہی ہے اور عقبہ سے عمان تک تعمیر ہو چکی ہے، آجکل جہاں عقبہ ہے وہاں "ترسیس" آباد تھا جہاں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے جہاز ہندوستان جایا کرتے تھے اور بحر احمر کے تجارتی بیڑے کا مرکز تھا (حاشیہ ترجمان القرآن)

[2] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۳۹۳، ۳۹۴ (طبع مدینہ پریس بجنور)

[3] انوار التنزیل، ج ۲ ص ۳۱۲ (طبع مصر)

رُکَامًا: تو بر تو، تہ بہ تہ، رَکْمٌ سے جس کے معنی تہ برتہ اکٹھا کرنے کے ہیں، اسم ہے، ۱۵/۱۲ ۔

رَکْبُ: کارواں، قافلہ، سوار، رَاکِبٌ کی جمع جس کے معنی سوار کے ہیں، رَاکِبٌ رُکُوْبٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے، عرف میں اس کا استعمال شتر سوار کے لئے مخصوص ہے، عرب کا قافلہ چونکہ بیشتر شتر سواروں پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے کارواں کے معنی میں بھی مستعمل ہے، ۱۰/۱ ۔

رَکِبَا: وہ دونوں سوار ہوئے، رُکُوْبٌ سے ماضی کا صیغہ تثنیہ مذکر غائب (ملاحظہ ہو رَکْبٌ) ۱۵/۲۲ ۔

رُکْبَانًا: سوار، رَاکِبٌ کی جمع ہے، یہاں عام سوار مراد ہیں، شتر سوار مخصوص نہیں، ۲/۱۵ ۔

رَکَّبَکَ: اس نے تجھے جوڑ دیا، اس نے تیری ترکیب دی، رَکَّبَ تَرْکِیْبٌ سے جس کے معنی ترکیب دینے، ملانے اور جوڑ دینے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، ۳۰/۸ ۔

رَکِبُوْا: وہ سوار ہوئے، رُکُوْبٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو رَکْبٌ) ۲۱/۳ ۔

رِکْزًا: بھنک، کھٹکا، پوشیدہ آواز، اسم ہے، ۱۶/۹ ۔

رُکَّعٌ: رکوع کرنے والے، رَاکِعٌ کی جمع (ملاحظہ ہو رَاکِعًا) ۱۴/۱۱، ۲۶/۱۲ رُکَّعًا ۔

رُکْنٌ: آسرا، زور، قوت، کسی شے کی وہ جانب جس کا آسرا لیا جائے "رکن" کہلاتی ہے، استعارۃً زور و قوت کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے، یہاں رکن سے مراد محکم قلعہ یا زور دار تعبیہ ہے، ۱۲/۷ ۔

رُکْنِہٖ: اس کی قوت، اس کا زور، رُکْنِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۱/۲۷ ۔

رُکُوْبُھُمْ: ان کا سوار ہونا، رُکُوْبُ مضاف، ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، (ملاحظہ ہو رَکْبٌ) ۲۳/۴ ۔

فصل المیم

رِمَاحُکُمْ: تمہارے نیزے، رِمَاحُ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، رِمَاحٌ رُمْحٌ کی جمع ہے جس کے معنی نیزے کے ہیں، ۷/۳ ۔

رَمَادٍ: راکھ، خاکستر، اسم ہے، اَرْمِدَۃٌ جمع، ۱۳/۱۵

رُمَّانٌ: انار، رُمَّانَۃٌ مؤنث، ۱۸/۷ ۔ ۸/۴، ۲۷/۱۳ ۔

رَمْزًا: اشارہ، ایماء، رُمُوْزٌ جمع، امام راغب لکھتے ہیں:۔

"رمز کے معنی ہیں لبوں سے اشارہ کرنے، مخفی

آواز اور ابرو کے ذریعہ ایما ہو کے نیز ہر وہ بات جو اشارہ کی طرح ہو اسے "رمز" سے تعبیر کیا گیا ہے جس طرح کہ شکایت کی تعبیر "غمز" سے کی گئی ہے ۳/۱۲

رَمَضَان: رمضان شہو مبارک مہینہ کا نام جو قمری سال کا نواں مہینہ ہے جس میں روزے رکھے جاتے ہیں، ابو الخیر طالقانی نے اپنی کتاب خطائر القدس میں اس ماہ کے ساٹھ نام ذکر کئے ہیں[۱] مجاہد کا قول ہے کہ "رمضان" اسماء الٰہی میں سے ہے جس طرح "شہر اللہ" کہتے ہیں، اسی طرح "شہر رمضان" کہا جاتا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ "رمضان" مہینہ کا نام ہے[۲]، قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:۔

"رمضان، رَمِضَ کا مصدر ہے جو جلنے اور سوختہ ہونے کے لئے آتا ہے پھر اس کی طرف شہر کی اضافت کی گئی اور اسے علم قرار دیا گیا اور بنا بر علمیت و الف نون غیر منصرف ہوا جس طرح کہ "ابن دایہ" میں جو کوئے کا نام ہے، لفظ "دایہ" بر بنا ر علمیت و تانیث غیر منصرف ہے اور اس ماہ کو "رمضان" سے یا تو اس لئے موسوم کیا کہ اس ماہ میں بھوک پیاس کی سوزش سے سوختہ ہوتے تھے یا اس لئے کہ گناہ اس میں جل جاتے ہیں اور یا اس لئے کہ جب ان لوگوں نے قدیم زبان سے مہینوں کے نام منتقل کئے تو یہ مہینہ گرمی کی سخت تمازت کے زمانہ میں واقع ہوا[۳]"۔ ۲/۷

رَمٰی: اس نے پھینکا، رَمْیٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو رَمْیٌ) ۹/۱۲

رَمَیْتَ: تو نے پھینکا، رَمْیٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ۹/۱۶

رَمِیْمٌ: استخوانِ بوسیدہ، گلی ہوئی ہڈی، رِمَّۃٌ سے جس کے معنی ہڈیوں کے بوسیدہ ہو جانے کے ہیں، صفتِ مشبہ کا صیغہ، اَرِمَّاءٌ اور رِمَامٌ جمع، ۳۶/۲۳، ۲۷

فصل الواو

رَوَاحُهَا: اس کی شام کی سیر، اس کی شام کی منزل رَوَاحٌ، رَاحَ یَرُوْحُ کا مصدر ہے جس کے معنی شام کرنے اور شام کے وقت چلنے کے ہیں،

راغب نے لکھا ہے کہ رَوَاحٌ کے معنی سہولت اور آسانی کے ہیں اور بطور استعارہ اس کا استعمال نصف النہار کے بعد سے اس وقت کے لئے

[۱] فتح الباری ج ۴ ص ۸۷۔ [۲] معالم التنزیل ج ۱ ص ۳۰ بر حاشیۂ خازن [۳] انوار التنزیل ج ۱ ص ۴۲۔

ہوتا ہے جس میں انسان چلتا ہے بہرحال یہ غُدُوٌّ اور صَبَاحٌ کا مقابل ہے اور اس کا استعمال سرِ شام یا زوال سے لے کر رات تک کے لئے ہوتا ہے یہاں رواح سے شام کی منزل یعنی زوال سے لے کر غروبِ آفتاب تک چلنا مراد ہے ۲۸/۸۔

رَوَاسِیَ: بوجھ، پہاڑ، رَاسِیَۃٌ کی جمع، "رواسی" کا استعمال ٹھہرے ہوئے پہاڑوں کے لئے ہوتا ہے، (ملاحظہ ہو رَاسِیَاتٍ) ۱۳/۷، ۴۲/۸، ۱۴/۳، ۲/۱، ۲/۱۰، ۲۲/۱۰، ۲۲/۱۵، ۲۹/۲۱۔

رَوَاكِدَ: ایستادہ، ٹھہری ہوئیں، تھمی ہوئیں، رَاكِدٌ کی جمع جو رُکُودٌ سے ہے جس کے معنی اپنی جگہ پر برقرار رہنے اور اپنے مقام پر ٹھہر جانے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے۔ رُکُود کا استعمال عام طور پر کشتی، ہوا، پانی، نماز اور آفتاب کے لئے ہوتا ہے ۲۵/۵۔

رَوْحٌ: فیض، رحمت، راحت۔ مصدر ہے اس کا فعل نَصَرَ اور سَمِعَ سے آتا ہے۔ راغب نے اصل کے معنی تنفس یعنی سانس لینے کے بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ رَوْحٌ سے وسعت کا تصور پیدا کیا گیا چنانچہ کہا گیا قصعۃ روحاء یعنی وسیع پیالہ اور ارشادِ الٰہی ہے لَا تَيْأَسُوا مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ (رحمت نا امید ہو اللہ کے فیض سے) یعنی اللہ کی کشائش اور رحمت سے کیونکہ یہ بھی رَوْحٌ کا ایک جزو ہے، بات یہ ہے کہ چونکہ تنفس باعثِ فرحت و راحت اور سببِ رحمت ہے اور اسی کے ذریعہ خوشبو کا احساس ہوتا ہے اس لئے فرحت، تازگی، آسائش، خوشبو، نسیم کی خنکی اور خوش آئند ہوا کے لئے اس کا استعمال عام ہے چنانچہ امام بغوی نے مجاہد سے راحت کے اور سعید بن جبیر سے فرحت کے اور ضحاک سے مغفرت و رحمت کے معنی نقل کئے ہیں[1] اور بیہقی شعب الایمان میں مجاہد سے رَوْحٌ کے معنی جنت اور ہوا کے خوش آئند کے روایت کرتے ہیں[2] ۱۳/۴، ۲۷/۱۶۔

رُوْحٌ: روح، جان، بھید کی بات، فیضِ غیبی، وحی، قرآن، فرشتہ۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:-

رَوْحٌ اور رُوحٌ اصل میں ایک ہیں اور روح کو نفس یعنی سانس کا نام قرار دیا گیا ہے، شاعر آگ کے بارے میں کہتا ہے ؎

فقلت لہ ارفعها إليك وأحيها
بروحك واجعلها لها قيتة قدرا

میں نے اس سے کہا کہ اس آگ کو اپنی طرف

[1] ملاحظہ ہو معالم التنزیل، ج ۷، ص ۲۳
[2] فتح الباری، ج ۶، ص ۲۲۸

اٹھا کر اپنے سانس سے اس کو زندہ کر دے اور اس کی مقررہ غذا اسے بہم پہنچا دے۔

یہ اس بنا پر ہے کہ سانس بھی روح ہی کا ایک جزء ہے، یہ تسمیہ ایسا ہی ہے جس طرح ہر کہ نوع کو اسم جنس سے موسوم کر دینا جیسے انسان کو حیوان کہہ دینا، نیز روح کو اس جزء کا بھی نام قرار دیا گیا جس کے ذریعہ زندگی، حرکت، منفعتوں کا حصول اور مضرتوں کا دفاع حاصل ہوتا ہے ارشادِ الٰہی وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (اور تجھ سے پوچھتے ہیں روح کو، تو کہہ! روح ہے میرے رب کے حکم سے) اور نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي (اور پھونک دوں اس میں اپنی جان سے) میں اسی روح کا مذکور ہے اور اپنی ذات کی طرف اس کی نسبت باعتبار ملکیت ہے اور اس نسبت سے تخصیص اس کی شرافت و عظمت کے لئے ہے جس طرح ارشاد ہے وَطَهِّرْ بَيْتِيَ (اور میرے گھر کو پاک رکھ) اور يٰعِبَادِيَ (اے میرے بندو) نیز اشراف ملائکہ ارواح سے موسوم کئے گئے جیسے يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ (جس دن کھڑا ہو فرشتہ روح نامی اور سب فرشتے صف باندھ کر) اور

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ (چڑھیں گے فرشتے اور روح) یعنی جبریل اور نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ (اس کو روح الامین لیکر اترا ہے) جبریل اس نام سے موسوم ہیں، اور قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ (تو کہہ اس کو اتارا ہے پاک فرشتے نے) اور أَيَّدْنٰهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ (اور ہم نے زور دیا اس کو روح پاک سے) میں ان کا نام "روح القدس" لیا اور ارشادِ الٰہی وَرُوحٌ مِّنْهُ (اور روح ہے اس کے ہاں کی) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام "روح" سے موسوم ہوئے کیونکہ وہ مردوں کو جلاتے تھے اور آیت شریفہ وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا (اور اسی طرح ہم نے وحی کی تمہاری طرف قرآن کی اپنے حکم سے) میں قرآن کا نام "روح" رکھا گیا کیونکہ قرآن اس حیاتِ اخروی کا سبب ہے جس کا بیان آیت وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (اور پچھلا گھر جو ہے سو وہی ہے زندگانی) میں ہے۔"

شیخ جلال الدین سیوطی تحریر فرماتے ہیں :-

"لفظِ روح متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے:

(۱) امر وَرُوحٌ مِّنْهُ (اور اس کا امر ہے) (۲) وحی يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوحِ (اتارتا ہے فرشتے وحی لیکر)

(۳) قرآن، اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (ہم نے وحی کی تیری طرف قرآن کی اپنے حکم سے)

(۴) رحمت وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (اور ان کی مدد کی اپنی رحمت سے) (۵) حیات فَرَوْحٌ[1] وَّرَيْحَانٌ (پس زندگی ہے اور روزی ہے) (۶)

جبریل فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا (پھر بھیجا ہم نے اس کی طرف اپنا فرشتہ) نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (اس کو فرشتہ معتبر لے کر اترتا ہے) (۷) ایک عظیم المرتبت فرشتہ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ (جس دن کھڑا ہو فرشتہ روح نامی) (۸) ایک خاص فرشتوں کا لشکر تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا (اترتے ہیں فرشتے اور ان کا خاص لشکر اس میں) (۹) روح بدن وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ (اور تجھ سے پوچھتے ہیں جان کے تعلق[2])

امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی کتاب الاسماء والصفات میں بعض مفسرین سے ناقل ہیں:-

روح کبھی بمعنی رحمت آتی ہے فرمایا اللہ عزوجل نے وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ یعنی اپنی رحمت سے ان کو تقویت دی، اور ارشاد ہے فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا پھر اس میں ہم نے اپنی روح پھونک دی) یعنی اپنی رحمت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ کہا جاتا ہے یعنی جو ان پر ایمان لائے ان کے لئے رحمت الٰہی ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کبھی "روح" بمعنی وحی ہوتی ہے اللہ عزوجل فرماتا ہے يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (اتارتا ہے وحی اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں) اور فرمایا وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (اور اسی طرح وحی کی ہم نے تیری طرف روح کی اپنی طرف سے) نیز ارشاد ہے يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ (اتارتا ہے فرشتے وحی لیکر اپنے حکم سے) کہ یہاں (روح سے) وحی مراد ہے اور وحی "روح" سے اس لئے موسوم ہے کہ وہ (مرگ) جہالت کی حیات ہے اور اسی لئے حضرت مسیح عیسیٰ بن مریم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا نام "روح" ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ ان کے متبعین کو ہدایت فرما کر کفر وضلالت (کی موت) سے زندگی بخشتا ہے، اور فرمایا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا یعنی وہ ہمارے ایک کُنْ کے کہہ دینے سے بغیر باپ کے بشر بن گیا، نیز حضرت جبریل

[1] بعض قراء نے روح بالضم پڑھا ہے

[2] ملاحظہ ہو الاتقان۔ ج ۲ ص ۱۴۳ (طبع مصر)

علیہ السلام کو روح سے موسوم کیا گیا، ارشاد ہے قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ، نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ، أَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ، فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا کہ سب جگہ جبریل علیہ السلام مراد ہیں اور فرمایا تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا (اترتے ہیں فرشتے اور روح اس میں) بعض کا قول ہے کہ اس سے جبریل علیہ السلام مراد ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ وہ فرشتہ معظم مراد ہے جو آیہ شریفہ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا میں مراد ہے" ص ۲۶۴

آیت شریفہ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي کی تفسیر میں امام بیہقی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ یہ ایک فرشتہ ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ یہ فرشتوں میں ایسا فرشتہ ہے جس کے ستر ہزار منہ ہیں، ہر منہ میں ستر ہزار زبانیں ہیں، ہر زبان کی ستر ہزار بولیاں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا رہتا ہے، حق تعالیٰ ہر تسبیح سے ایک فرشتہ پیدا کرتے ہیں جو قیامت تک فرشتوں کے ہمراہ اڑتا رہتا ہے[2] امام خطابی فرماتے ہیں :-

"ارواح میں سے جس روح کے متعلق سوال ہوا اس کے بارے میں علماء مختلف ہیں، بعض کہتے ہیں یہاں جبریل علیہ السلام مراد ہیں اور بعض کا قول ہے کہ وہ فرشتوں میں ایک خاص صفت کا فرشتہ ہے جس کے متعلق ان کا بیان ہے کہ وہ عظیم الخلقت ہے اور اکثر اہل تاویل اس طرف گئے ہیں کہ سوال اس روح کے متعلق کیا تھا جس سے حیاتِ جسم وابستہ ہے اور ان میں اہلِ نظر کا یہ بیان ہے کہ روح کی کیفیت کو دریافت کیا تھا کہ کس طرح بدن میں چلتی ہے اور جسم میں اس کے امتزاج اور حیات کے اس سے وابستہ ہونے کی صورت ہے"

امام قرطبی لکھتے ہیں :-

"راجح یہی ہے کہ انہوں نے روحِ انسانی کے متعلق سوال کیا تھا کیونکہ یہود حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے روح اللہ ہونے کے قائل نہیں، اور اس سے ناواقف نہیں کہ جبریل ایک فرشتہ ہے اور ملائکہ ارواح ہیں[3]"

علامہ ابن قیم نے کتاب الروح میں اس کو ترجیح دی ہے جس کا آیت شریفہ يَوْمَ يَقُومُ

---

[1] الاسماء والصفات ص ۲۶۵ [2] الاسماء والصفات، ص ۲۶۵ [3] فتح الباری، ج ۸، ص ۳۰۴

الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا میں مذکور ہے ان کا بیان ہے کہ ارواحِ بنی آدم کو قرآن میں نفس کے علاوہ اور کسی نام سے موسوم نہیں کیا گیا لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ یہ چیز ان کے مدعا پر دلالت نہیں کرتی بلکہ راجح قول اول ہی ہے کیونکہ طبری بطریق عوفی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس قصہ میں راوی ہیں کہ انہوں نے روح کے متعلق کہا تھا اسے جسم میں کس طرح عذاب کیا جائیگا[1] یہ واضح رہے کہ تورات اور انجیل میں "روح" کا لفظ فرشتہ کے لئے آیا ہے اور قرآن مجید میں اس کا استعمال جیسا کہ سابق میں گزرا مختلف معانی میں ہوا ہے اب یہاں "الروح" سے مراد جسم انسانی کی روح ہو یا فرشتہ یا وحی، جواب کی جامعیت ہر ایک پر حاوی ہے کہ جو کچھ تمہیں بتلایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کا حکم کام کر رہا ہے اس سے زیادہ بتلانے کی تمہاری تنگنائے علم میں وسعت نہیں کہ مَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (تمہیں جو کچھ علم دیا گیا ہے وہ تھوڑا)

آیہ کریمہ یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا کی تفسیر میں ابن ابی حاتم بطریق علی بن ابی طلحہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ یہ ایک فرشتہ ہے جو خلقت کے اعتبار سے سب فرشتوں سے بڑا ہے[2] اور بیہقی بطریق عطیہ عوفی ابن عباس سے اس کی تفسیر میں یہ راوی ہیں کہ مراد یہ ہے کہ جب انسانوں کی روحیں فرشتوں کے ساتھ کھڑی ہونگی، یہ دونوں صورتوں کے پھونکے جانے کے درمیان روحوں کو جسموں کی طرف لوٹائے جانے سے پہلے ہوگا اور ابو صالح سے اسی آیت کی تفسیر میں یہ روایت کیا ہے کہ روح انسانوں کی طرح ایک مخلوق ہے پر وہ انسان نہیں ہیں، ان کے ہاتھ اور پاؤں ہیں نیز مجاہد سے ناقل ہیں کہ روح انسانوں کے مانند ایک مخلوق ہے اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بطریق مجاہد روایت کی ہے کہ روح اللہ کا ایک امر اور اس کی ایک مخلوق ہے ان کی صورتیں انسانوں کی صورتوں پر ہیں آسمان سے جب کوئی فرشتہ اترتا ہے تو اس کے ساتھ ایک روح ہوتی ہے[3]

روح "کیا چیز ہے اور اسکی حقیقت کیا ہے اس بارے میں بڑا اختلاف رہا ہے کہا جاتا ہے کہ اس اختلاف کی تعداد سو اقوال تک جا پہنچتی ہے، سلف نے اس قسم

[1] فتح الباری ج ۸ ص ۳۰۴ [2] الاتقان ج ۲ ص ۱۴۱ [3] الاسماء والصفات ص ۲۶۵، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس اخیر روایت کو ابن اسحٰق کی تفسیر سے نقل کر کے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔ [4] فتح الباری ج ۸ ص ۳۰۵

کی باتوں میں بحث کرنے سے سکوت اختیار کیا ہے،
حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں :-

وثبت عن ابن عباس — حضرت ابن عباس سے یہ ثابت
انہ کان لا یفسر — ہے کہ روح کی تفسیر نہیں کرتے تھے
الروح ای لا یعین — یعنی یہ متعین نہیں کرتے تھے کہ
المراد بہ لہ — یہی مراد ہے۔

عبداللہ بن بریدہ جو ثقات تابعین میں سے ہیں
کہتے ہیں کہ اللہ نے روح پر نہ کسی ملک مقرب کو مطلع
فرمایا نہ کسی نبی مرسل کو۔ لہ

عارف ربانی شیخ عبدالوہاب شعرانی نے اپنی
نفیس کتاب الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الاکابر
میں جس میں انہوں نے ارباب کشف اور اہل کلام
کے عقائد میں مطابقت کی کوشش کی ہے اور
جیسا کہ خود ان کا بیان ہے اس موضوع پر ان سے
پہلے کسی نے قلم نہیں اٹھایا، "روح" پر ایک
مستقل بحث سپرد قلم فرمائی ہے جس کا اقتباس
ہدیۂ ناظرین ہے۔

تریسٹھویں بحث اس امر کے بیان میں کہ ساری
روحیں مخلوق ہیں اور جیسا کہ وارد ہے اللہ تعالیٰ
کے امر (حکم) سے ہیں اور جس نے بھی اپنی
عقل سے اس کی حقیقت کے پہچاننے پر غور کیا ہے
وہ اس بارے میں یقین پر نہیں ہے بلکہ جو کچھ
ہے اس کا ظنی تخمینہ ہے :-

اور ہم کو یہ نہیں ملا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
اس کی حقیقت پر کلام فرمایا ہو باوجودیکہ آپ سے اس
کے متعلق سوال ہوا تھا پس ہم بھی ادباً اس سے
باز رہتے ہیں۔

"روح" کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا
کہ وہ موجود ہے جیسا کہ ابوالقاسم جنید وغیرہ نے
کہا ہے چنانچہ جنید رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں :-

الروح شیء استأثر — روح ایک ایسی شے ہے جس کا
اللہ تعالیٰ بعلمہ — علم اللہ تعالیٰ کی ذات کے
ولم یطلع علیہ — ساتھ مخصوص ہے اور اس نے
احدا من خلقہ — اپنی مخلوق میں سے کسی کو اس پر
فلا یجوز لاحد — مطلع نہیں فرمایا لہٰذا اس کے
البحث عنہ باکثر — متعلق کسی کو اس سے زیادہ بحث کرنا
من انہ موجود۔ — جائز نہیں کہ وہ موجود ہے۔

اکثر مفسرین جیسے ثعلبی اور ابن عطیہ بھی اسی طرف گئے
ہیں اور جمہور متکلمین کا بیان یہ ہے کہ روح ایک جسم
لطیف ہے جو بدن میں اسی طرح گھسی ہوئی ہے جس طرح

لہ فتح الباری ج ۸ ص [illegible]

لہ معالم التنزیل ج ۴ ص ۱۴۸ (طبع مصر)

کہ شاخ سبز میں پانی ہوتا ہے اور بہت سے متکلمین کا قول ہے کہ وہ عرض ہے یعنی ایسی حیات کہ جس کے وجود سے بدن انسانی زندہ ہے قاضی ابوبکر باقلانی اسی طرف مائل ہیں اور احادیث میں جو روح کے اترنے چڑھنے اور برزخ میں چلنے پھرنے کا ذکر آتا ہے وہ قول اول پر دلالت کرتا ہے، یہ سہروردی کا بیان ہے اور یہ اجسام کی صفت ہے اعراض کی نہیں کیونکہ عرض ان اوصاف سے موصوف نہیں ہوتا اور بہت سے صوفیہ نے کہا ہے کہ روح نہ جسم ہے نہ عرض بلکہ جوہر[1] مجرد قائم الذات اور غیر متمیز ہے بدن کی تدبیر و تحریک کے لئے اس کا بدن سے خاص تعلق ہے وہ نہ بدن میں داخل ہے نہ اس سے خارج، فلاسفہ کی یہی رائے ہے اور یہ ایک گھڑی ہوئی بات ہے۔

اور مجھے جو بات ظاہر ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ بالفرض اگر بندہ کو حقیقت روح پر مطلع بھی کر دیا جائے تو وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتا کہ اس کو ایسی عبارت میں بیان کر سکے کہ جو سننے والے کو اسکی حقیقت کی معرفت تک پہنچا دے کیونکہ حق تعالیٰ نے اسکو ہمارے لئے ایسے مرتبہ میں رکھا ہے جو ہمیں عاجز کر دیتا ہے تاکہ ہم میں سے کوئی اپنے دل میں یہ کہہ اٹھے کہ جب ہم اپنی ذات کی حقیقت کے پہچاننے سے عاجز ہیں تو ذات الٰہی کی معرفت میں کس قدر عاجز بلکہ عاجز تر ہوں گے لہٰذا ہمیں ذات الٰہی کے بارے میں غور و خوض نہ کرنا چاہیے کیونکہ جب ہم اپنی روح ہی کی معرفت سے عاجز ہیں حالانکہ وہ مخلوق ہے اور سب چیزوں سے زیادہ ہم سے قریب ہے تو اپنے خالق کو کیسے پہچان لیں گے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کلام میں وارد ہے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا) بعض عرفا نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے چونکہ کسی کو بھی اپنے نفس کی معرفت کبھی ممکن نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے نفس کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ ہمارے اور اس کی معرفت ذات کے درمیان ایک عاجز کر دینے والا مقام ہے گویا حق تعالیٰ یوں فرما رہے ہیں کہ جب انسان اپنے نفس کی معرفت سے بھی قاصر ہے باوجودیکہ وہ مخلوق ہے اور سب چیزوں میں انسان سے زیادہ قریب ہے تو اس ذات کی معرفت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے جس کی نہ شبیہ ہے نہ نظیر اور نہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ کسی حد میں جمع ہو سکتا ہے نہ کسی حقیقت میں،

[1] جوہر وہ ہے جو بذات خود قائم ہو جیسے کپڑا اور عرض وہ ہے جو بذات خود قائم نہیں ہوتا بلکہ اس کا قیام بواسطہ جوہر ہوتا ہے جیسے رنگ۔

کمال بن ابی شریف نے اپنے حاشیہ میں کہا ہے
کہ اگر یہ کہا جائے کہ لوگوں نے روح کی معرفت میں
کیوں خوض کیا حالانکہ شارع نے اس بارے
میں خاموشی اختیار کی ہے تو اس کا جواب دو طرح
پر ہے، اول یہ کہ تفصیلی جواب اس لئے ترک کر دیا
گیا کہ یہود باہم یہ کہتے تھے کہ اگر اس کے متعلق جواب
نہیں دیا تو وہ سچے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علاماتِ نبوت میں
داخل تھی، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا روح
کے متعلق جواب نہ دینا، ان کی کتابوں میں جو یہ وصف
مذکور تھا اس کی تصدیق کے لئے تھا، دوم یہ کہ
سوال محض تنگ کرنے اور تغلیط و بدگوئی کیلئے تھا
اور جب سوال اس طرح پر ہو تو اس کا جواب
ضروری نہیں کیونکہ الروح ایک ایسا امر ہے جو
روحِ انسانی، جبریل اور ایک اور فرشتہ کے درمیان
جس کو الروح کہا جاتا ہے مشترک ہے نیز فرشتوں کی
ایک خاص صنف اور قرآن اور عیسیٰ بن مریم (علیہ
السلام) کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے لہٰذا اگر
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں میں سے کوئی ایک
بات بھی جواب میں فرماتے تو یہود عبرت گیری
اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت کے لئے ضرور
کہہ اٹھتے کہ ہماری تو یہ مراد نہ تھی، یہی سبب ہے کہ
جواب اجمالی طور پر اس طرح آیا کہ روح کے ہر معنی پر
صادق ہے (یہاں تک اہلِ اصول کا کلام ختم ہو گیا)
شیخ محی الدین[1] لواقح الانوار میں فرماتے ہیں "روح
اللہ کا امر سے یوں ہوئی کہ وہ بغیر کسی واسطہ کے حق
تعالیٰ کے فرمانے سے وجود میں آئی ہے، اس نے روح
سے فرمایا کونی (ہو جا) وہ ہوگئی جیسا کہ حضرت عیسیٰ
علیہ السلام کے بارے میں کہا ہے کہ وہ روح اللہ ہیں
کیونکہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کے پھونکنے سے (جیسا پھونکنا
کہ اس کے جلال کے لائق ہے) وجود میں آئے ہیں اللہ
فرماتا ہے اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ
اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ
(سوائے اس کے نہیں کہ مسیح جو ہے عیسیٰ، مریم کا بیٹا رسول
ہے اللہ کا اور اس کا کلام جو ڈال دیا مریم کی طرف
اور روح ہے اس کے ہاں کی) اور غزالی اس
طرف گئے ہیں کہ ارشادِ خداوندی قُلِ الرُّوْحُ مِنْ
اَمْرِ رَبِّيْ کے معنی من عیبہ کے ہیں یعنی روح اس کے
غیب سے ہے کیونکہ عالمِ امر عالمِ غیب ہے اور عالمِ
خلق عالمِ شہادت ہے۔ ابنِ عربی کہتے ہیں ہمارے

[1] ابن عربی مراد ہیں، یہاں سے اہلِ کشف کا کلام شروع ہو جاتا ہے۔

نزدیک معاملہ اس کے برخلاف ہے جو غزالی نے کہا ہے کیونکہ ہم کہتے ہیں حق تعالیٰ جس کو بلا واسطہ ایجاد فرمائیں وہ عالمِ امر سے ہے یعنی جس سے وہ کُنْ فرمائیں اور وہ ہوجائے اس کا بس حق تعالیٰ ہی کی طرف ایک رُخ ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جس کو وہ بالواسطہ ایجاد فرمائیں وہ عالمِ خلق سے ہے اور اس کے دو رُخ ہوتے ہیں، ایک حق تعالیٰ کی طرف اور دوسرا اس سبب کی طرف جس سے وہ وجود میں آیا ہے پس کبھی تو حق تعالیٰ اسے خاص رُخ سے دعوت دیتے ہیں اور کبھی تفصیلات، اور بالغ حکمتوں کی بنا پر اس رُخ سے دعوت دیتے ہیں جو سبب کا ہے۔

اور فتوحاتِ مکیہ کے بہتّرویں باب میں فرماتے ہیں، روح اس لئے امرِ رب جل وعلا سے ہے کہ وہ خلق سے وجود میں نہیں آئی بلکہ اسکو اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ ایجاد فرمایا ہے اور اس کی حقیقت پر بجز ان اصفیاء کے جن کو حق تعالیٰ چاہے اور کوئی مطلع نہیں ہوتا۔

اور باب ۲۹۹ میں فرمایا ہے کہ روح کیلئے کیسے نہیں کہ وہ اپنے جوہرِ ذات میں نو یادتی قبول کرے بلکہ وہ فرد ہے اور اگر عاقل بالذات نہ ہوتی تو اخذِ میثاق کے وقت اپنے خالق کی ربوبیت کا اقرار نہ کرتی کیونکہ حق تعالیٰ اسی سے خطاب فرمانے میں جس میں ان کے خطاب کی عقل ہو اور فی نفسہٖ انسان کی یہی حقیقت ہے، شیخ نے اس بارے میں بہت طول سے کام لیا ہے اور پھر فرمایا ہے کہ معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے روح کو کامل، بالغ، عاقل، توحیدِ الٰہی کا عارف اور اپنی ربوبیت کا معترف پیدا کیا ہے اور یہی وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو بنایا ہے چنانچہ حدیث کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ (ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی بنا لیتے ہیں یا نصرانی کر لیتے ہیں یا مجوسی کر ڈالتے ہیں) میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے، یہاں اغلب یعنی ماں باپ کے وجود کا ذکر کیا اور جو بھی بچہ کی پرورش کرتا ہے وہ بمنزلہ ماں باپ ہی ہے۔

نیز شیخ باب ۳۲۶ میں رقمطراز ہیں، واضح رہے کہ سارے عالم میں جو بھی کسی صورت سے مقید ہے اس کے لئے ایک روحِ الٰہی ہے جو اس کو لازم ہے اور اسی سے وہ اللہ عز وجل کی تسبیح کرتا ہے پس بعض ارواح تو ایسی ہیں جو اس صورت کی مدبرہ ہیں کیونکہ صورت ارواح کی تدبیر کو قبول کرتی ہے اور یہ وہ ہر صورت ہے

جو ظاہری زندگی اور موت سے متصف ہے اور اگر ظاہری زندگی اور موت سے متصف نہیں تو اس کی روح روحِ تیسیر ہے روحِ تدبیر نہیں شیخ نے اس پر طویل بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے ان ارواح میں ان صورتوں کی ارواح سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا کوئی عارف نہیں کہ جو تدبیر سے بے تعلق ہیں یہ ارواح جماد ہیں اور ان سے رتبہ میں کم ارواحِ نبات ہیں اور ان سے کم مرتبہ ارواح حیوان ہیں اور سرکش انسانوں کی روحیں ان سے بھی گئی گزری ہیں لیکن صالحین میں حسب تفاوت طبقات انبیاء، اولیاء اور مومنین کی ارواح سے معرفت میں اعلیٰ کوئی نہیں کہ یہ اختصاصِ الٰہی ہے[1]"

علماء راسخین میں ایک مشہور بزرگ ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو کشف و کلام دونوں وادیوں سے یکساں آشنا ہیں، موصوف نے اس سلسلہ میں حجاب حقیقت کے درجند پردے اٹھائے ہیں بحث یقیناً تشنہ رہیگی، اگر موصوف کے گراں قدر افادہ سے قطع نظر کر لی جائے، موصوف نے اپنی بے نظیر کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں ایک مستقل عنوان" باب حقیقۃ الروح" کے نام سے قائم کیا ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے :-

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (اور تجھ سے پوچھتے ہیں روح کو تو کہہ روح ہے میرے رب کے حکم سے اور تم کو جو علم دیا گیا ہے وہ تھوڑا سا ہے اور اعمش نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے وَمَا أُوتُوا مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (اور ان کو جو علم دیا گیا ہے وہ تھوڑا سا ہے) پڑھا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خطاب ان یہود سے ہے جنہوں نے روح کے متعلق سوال کیا تھا اور جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے، آیت اس بارے میں نص نہیں ہے کہ امتِ مرحومہ میں روح کی حقیقت کا کسی کو علم نہیں اور یہ بھی نہیں ہے کہ شریعت جس سے خاموش ہو اس کی معرفت کبھی ممکن ہی نہ ہو بلکہ لبا اوقات شریعت کسی چیز سے اس لئے سکوت اختیار کرتی ہے کہ اس کی معرفت دقیق ہوتی ہے اور گو بعض کے لئے اس کی معرفت ممکن ہو مگر جمہور امت میں اس کے دریافت کی صلاحیت

[1] الیواقیت والجواہر، ج ۲، ص ۱۲۲، ۱۲۳ (طبع میمنیہ مصر ۱۳۱۷ھ)

نہیں ہوتی۔

واضح ہے کہ سب سے پہلے روح کی جس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ حیوان کے لئے مبدأ الحیات ہے کہ اس کے اندر روح پھونکنے سے وہ زندہ اور اس سے مفارقت ہو جانے پر مردہ ہو جاتا ہے پھر جب بغور اس میں تامل کیا جائے تو یہ کھلتا ہے بدن میں ایک بخار لطیف ہے جو قلب کے اندر خلاصۂ اخلاط سے پیدا ہوتا ہے جو قویٰ و حار ومحرک اور مدبرۂ غذا کا حامل ہوتا ہے، طب کا حکم اسی پر جاری ہوتا ہے اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ رقت، غلظت، صفائی اور کدورت غرض اس بخار کے تمام احوال کا قویٰ میں اور ان تمام افعال میں جو قویٰ سے سرزد ہوتے ہیں ایک خاص اثر ہوتا ہے اور جو آفت کہ کسی عضو پیا دراس عضو کے مناسب بخار کی تولید پر طاری ہوتی ہے وہ اس بخار کو فاسد اور اس کے افعال میں تشویش پیدا کر دیتی ہے، اس بخار کا وجود حیات کو مستلزم ہے اور اس کا تحلیل ہو جانا موت ہے، پس پہلی نظر میں تو یہی "روح" ہے اور نظرِ غائر کے اعتبار سے یہ روح کا طبقہ سفلی ہے، بدن میں اسکی مثال ایسی ہی ہے جیسے گلاب کے پھول میں گلاب کا عرق یا کوئلے کے اندر آگ پھر جب اور غور سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ روح اس روح حقیقی کی سواری اور اس کے تعلق کا مادہ ہے کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں بچہ جوان ہو رہا ہے، بوڑھا ہو رہا ہے اس کے بدن کے اخلاط اور وہ روح جس کی تولید ان ہی اخلاط سے ہوتی ہے ہزار دفعہ سے زیادہ بدل جاتی ہے، وہ کبھی چھوٹا ہے اور کبھی بڑا، کبھی سیاہ ہو جاتا ہے اور کبھی سپید، کبھی جاہل ہوتا ہے اور کبھی عالم، اسی طرح اور اوصاف ہیں، جو بدلتے رہتے ہیں اور شخص وہ کا وہ ہے اور اگر اس سلسلہ میں کسی بات میں مناقشہ کیا جائے تو ہمیشہ یہ حق حاصل ہے کہ ہم ان تغیرات اور طفل یہ ہو بہو فرض کریں اور کہیں کہ ان اوصاف کے بعینہٖ باقی رہنے کا ہم کو یقین حاصل نہیں اور اس طفل کے باقی رہنے کا یقین ہے پس وہ طفل ان اوصاف سے علیحدہ ہے اور وہ شئے جس کے ذریعہ وہ وہ ہے نہ یہ روح ہے نہ یہ بدن اور نہ یہ مشخصات جو بظاہر معلوم ہوتے اور دکھائی دیتے ہیں بلکہ روح حقیقت میں

ایک حقیقت فردانیہ اور نقطۂ نورانیہ ہے جس کا
طوران تمام تغیر پذیر متغائرہ اطوار سے کہ جن
میں بعض جواہر ہیں اور بعض اعراض ہیں بڑھ
چڑھ کر ہے وہ جس طرح کبیر کے ساتھ ہے کسی
طرح صغیر کے ساتھ ہے اور جس طرح سپید کے
ساتھ ہے اسی طرح سیاہ کے ساتھ ہے اور اسی
طرح دیگر متقابل اشیاء کے ساتھ، اس کو اولاً
تو روحِ ہوائی کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے
اور ثانیاً بدن کے ساتھ اس حیثیت سے کہ
بدن نسمہ (روح ہوائی) کی سواری ہے، اور وہ
عالمِ قدس کا ایک روزن ہے جس سے روح ہوائی
پر وہ تمام باتیں نازل ہوتی رہتی ہیں جنکی اس
میں استعداد ہوتی ہے پس امورِ متغیرہ میں جو
کچھ تغیر واقع ہوا وہ استعدادات ارضیہ کی بنا
پر ہوا جس طرح کہ آفتاب کی دھوپ ہے کہ کپڑے
کو سپید کرتی اور دھوبی کو سیاہ کر دیتی ہے۔

اور ہمارے نزدیک وجدانِ صحیح سے یہ متحقق
ہو چکا ہے کہ بدن کے روح ہوائی کو پیدا کرنے
کی استعداد کو کھو دینے کے سبب بدن سے
روح ہوائی کے جدا ہو جانے کا نام موت ہے
روحِ ہوائی سے روحِ قدسی کے جدا ہو جانے کا
نام موت نہیں ہے چنانچہ امراض مہلکہ میں جب
روح ہوائی تحلیل ہونے لگتی ہے تو حکمتِ الٰہی
میں یہ ضروری ہے کہ روحِ الٰہی کا اس قدر
حصہ باقی رہے کہ روحِ الٰہی کا ارتباط اس سے
قائم رہ سکے جس طرح کہ شیشی سے تم ہوا کو چوسنے
لگو تو ہوا اس میں سے خارج ہوتی رہیگی یہاں
تک کہ اس حد پر جا پہنچے گی کہ اس کے بعد خالی
نہ ہو سکے اب یا تو چوسنے کی تم میں طاقت نہ
رہے گی یا شیشی پھٹ جائیگی یہ سب کچھ اس راز
کی بنا پر ہے جو ہوا کی طبیعت سے پیدا ہے،
اسی طرح روحِ ہوائی میں ایک راز ہے اور
اس کی ایک حد ہے کہ ان دونوں سے معاملہ
متجاوز نہیں ہو سکتا پھر جب انسان مر گیا روحِ
ہوائی کی نشأۃ ثانیہ ہوئی، اب روح الٰہی کا
فیض مابقی حسِ مشترک میں ایک خاص قوت
پیدا کرے گا جو عالمِ مثال (یعنی وہ قوتِ متوسط
جو مجرد و محسوس کے درمیان افلاک میں شئے
واحد کی طرح منتشر ہے) کی مدد سے سننے،
دیکھنے اور بولنے کے لئے کافی ہو گی اور
بسا اوقات روح ہوائی اس وقت عالمِ مثال
کی مدد سے لباس نورانی یا ظلماتی کے لئے تیار

ہوجاتی ہے اور یہیں سے عالمِ برزخ کے عجائبات ظاہر ہونے لگتے ہیں پھر جب صور پھونکا گیا یعنی باری صورہ کی طرف سے اسی طرح کا فیضِ عام آیا جیسا کہ ابتداءِ آفرینش میں ہوا تھا جب کہ روحیں جسموں میں پھونکی گئیں اور عالمِ موالید کی تاسیس عمل میں آئی تھی تو روحِ الٰہی کا فیض اس کا موجب ہوا کہ لباس جسمانی یا ایسے لباس میں کہ جو عالمِ مثال و عالمِ اجسام کے بین بین ہو ملبوس ہو اور اب وہ تمام باتیں پوری ہونگی جن کے متعلق صادق و مصدوق علیہ افضل الصلوات وایمن التحیات نے مطلع فرمایا ہے اور چونکہ روحِ ہوائی روحِ الٰہی اور بدن ارضی کے درمیان برزخ متوسط ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک رُخ اس طرف ہو اور ایک رُخ اس طرف، اب جو رُخ کہ عالمِ قدس کی طرف مائل ہے وہ ملکیت ہے اور جو زمین کی طرف مائل ہے وہ بہیمیت ہے۔

حقیقتِ روح کے متعلق ہم ان ہی مقدمات پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ اس علم میں اس کو تسلیم کر لیا جائے اور اس پر تفریعات قائم کی جائیں قبل اس کے کہ کسی سے اعلیٰ علم میں حجاب منکشف ہو، واللہ اعلم" [۱]

شاہ صاحب نے آخیر میں جس علم کا حوالہ دیا ہے وہ "علمِ حقائق" ہے، الطاف القدس فی لطائف النفس علمِ لطائف میں شاہ صاحب کا ایک بے نظیر رسالہ ہے، اس کی فصلِ دوم میں شاہ صاحب نے حقیقتِ روح پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے، حجۃ اللہ البالغہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ اسکی تلخیص ہے، بحث روح سے پہلے بطور تمہید رقمطراز ہیں:۔

بیانِ حقیقتِ ایں لطائف و خواصِ آں موقوف بر بیانِ حقیقتِ روح ست و آں مسئلۂ علمِ حقائق ست نہ از علم سلوک و شارع صلوات اللہ علیہ وسلامہ ہیچ رمزے از علمِ حقائق اظہار نہ فرمود و بجز علمِ سلوک و تہذیب نفس تبلیغ ننمود مگر مشہودات چند کہ ہیچ طوائف عرب و عجم از اں اجنبی نیست و فرقہ نیست کہ آں علم در روز بانش نیست پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایں علوم مشہورہ را اجمالاً بیا دالیشاں داد و از خوض در تفصیل و تصویر آں زجر شدید فرمود ہمیں ست سنتِ

[۱] حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۱۴، ۱۵ (طبع خیریہ مصر ۱۳۲۲ھ)

انبیاء اللہ اجمعین نہ پنداری کہ حل ایں علوم مقدورِ
بشر نیست نہ بلکہ اظہار ایں علوم موافقِ مصلحتِ
جمہور مخاطباں نیست ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

اولیٰ واحریٰ در حق ما مردم نیز ہمیں است کہ ازیں
تن زنیم و دیدہ را نادیدہ سازیم لیکن اختلافِ
صوفیہ دریں مسئلہ بسیار شد و طبائعِ ایشاں
مشوش شدند و علمِ لطائف بریں مسئلہ مبتنی شد
پس ضرورت پیش آمد والضرورۃ تبیح المحذورات[1]"

مزید تفصیل کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کافی ہے،
حافظ ابن مندہ اور علامہ ابن القیم نے روح کے متعلق مستقل
کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں روح پر روایات واحادیث
کی روشنی میں بحث کی ہے، دونوں کی تصنیف کا نام
کتاب الروح ہے۔ ابنِ مندہ کی تصنیف اس وقت
نایاب ہے، حافظ ابنِ حجر نے فتح الباری میں اس کا
حوالہ دیا ہے[2] اور ابن القیم کی کتاب عرصہ ہوا کہ
مصر سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

۶/۳، ۱۴/۱۷، ۱۵/۱۰، ۱۹/۱۵، ۲۴/۷، ۲۸/۳، ۱۹/۷، ۳۰/۲۲ -

رُوْحًا ۲۵/۶ -

رُوْحُ الْقُدُسِ: روحِ پاک، جانِ پاک، پاک
فرشتہ، موصوف کی اضافت صفت کی طرف ہے جیسے
حاتمُ الجُودِ اور رَجُلُ صِدْقٍ ہے امام البغوی آیہ
اَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کی تفسیر کرتے
ہوئے لکھتے ہیں:۔

"روح القدس کے بارے میں علماء مختلف ہیں
ربیع وغیرہ کا بیان ہے کہ وہ روح مراد ہے جو
حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام میں پھونکی تھی اور قدس
اللہ ہے، حق تعالیٰ نے اس کی اضافت اپنی
ذات کی طرف تکریم وتخصیص کے لئے کی ہے
یعنی وہ روح جو اللہ نے ان میں پھونکی جیسے
بیت اللہ اور ناقۃ اللہ ہے چنانچہ ارشاد ہے
فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (پھر ہم نے اس میں
اپنی روح کو پھونک دیا) اور رُوْحٌ مِّنْهُ (اور
روح ہے ان کے ہاں کی) اور بعض کا قول ہے
کہ قدس سے طہارت مراد لی ہے یعنی روح طاہرہ
ان کی روح کو قدس سے اس لئے موسوم کیا کہ
وہ نہ مردوں کی پشت میں ہے نہ عورتوں کے
رحم میں بلکہ اللہ کے امر میں سے ایک امر تھی،
قتادہ، سُدّی اور ضحاک کا قول ہے کہ

[1] الطاف القدس فی لطائف النفس، ص ۵، ۶ (طبع احمدی دہلی ۱۳۰۹ھ)　[2] فتح الباری ج، ص ۳۰۶

"روح القدس" جبریل علیہ السلام ہیں بعض نے کہا ہے کہ وہ قدس یعنی طہارت سے اس لئے موسوم ہوئے کہ انہوں نے کبھی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا اور حسن کہتے ہیں کہ قدس اللہ اور اس کی روح جبریل ہیں، اللہ فرماتا ہے قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (تو کہہ اس کو اتارا ہے پاک فرشتہ نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید جبریل علیہ السلام کے ذریعہ اس طرح کی گئی کہ ان کا حکم تھا جہاں وہ جائیں انکے ساتھ رہیں یہاں تک کہ ان کو آسمان پر اٹھالیا گیا اور بعض کا قول ہے کہ جبریل علیہ السلام کو جو روح سے موسوم کیا گیا وہ ان کی لطافت کے سبب اور وحی سے ان کے تعلق کی بنا پر کیا گیا کہ جو دلوں کی زندگانی کا باعث ہے اور ابن عباس اور سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ روح القدس اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم تھا جس سے حضرت عیسےٰ علیہ السلام مردوں کو جلاتے اور لوگوں کو عجائبات دکھلاتے تھے اور بعض کا قول ہے کہ وہ انجیل ہے جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے روح بنایا گیا تھا جس طرح سے کہ قرآن کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے روح کردیا گیا تھا کیونکہ وہ قلوب کی زندگانی کا سبب ہے اللہ فرماتا ہے وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا (اور اسی طرح ہم نے تیری طرف وحی کی قرآن کی اپنے حکم سے"۔ [1]

ابن ابی حاتم نے باسناد ثقات حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور طبری نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا ہے کہ روح القدس جبریل ہیں، ابو عبیدہ اور بہت علماء کا اس پر یقین ہے[2] امام بخاری نے بھی سورۃ النحل کی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ واضح رہے کہ آیہ کریمہ قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ میں تو بالاتفاق روح القدس سے جبریل علیہ السلام ہی مراد ہیں اور أَيَّدْتُكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ اور أَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ میں اگرچہ اختلاف اقوال ہے مگر صحیح اور راجح یہی ہے کہ یہاں بھی جبریل علیہ السلام ہی مراد ہیں۔

اا بہ بہ بـ۲۰ ۔

رُوحَنَا: ہماری روح، ہمارا فرشتہ، رُوحٌ مضاف نا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ۔ قرآن مجید میں یہ الفاظ تین جگہ آئے ہیں جہاں رُوحَنَا ہے وہاں اصح یہ ہے

[1] معالم التنزیل ج ۱ ص ۶۸، ۶۹

[2] فتح الباری ج ۸ ص ۲۹۱

کہ جبریل علیہ السلام مراد ہیں اور جہاں مِنْ رُّوْحِنَا ہے وہاں اصح یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح مراد ہے۔ ۱۶/۵ ۱۷/۵ ۲۱/۶ ۔

رُوْحِهٖ: اس کی روح، رُوْحٌ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ آیہ کریمہ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (اور پھونکی اس میں اپنی جان میں سے) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:۔

"اپنی جان میں سے یعنی جو مخلوق ہے اسی کا مال ہے مگر جس کو عزت دی اس کو اپنا کہا جیسے فرمایا اِنَّ عِبَادِيْ سو انسان کی جان غیب سے آئی ہے مٹی پانی سے نہیں بنی اسکو اپنی کہا اور یہ نہ سمجھے کہ اللہ کی جان، جان ہو تو بدن میں ہو، بدن ہو تو ترکیب بھی ہو، ذات پاک کہاں رہی؟" ۲۱/۱۲ ۔

رُوْحِيْ: میری روح، میری جان، رُوْحٌ مضاف، ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب زیر آیت وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (اور پھونک دوں اس میں اپنی جان سے) سورۂ حجر میں فرماتے ہیں:۔

"اپنی جان یعنی خاص جس میں نمونہ ہے اللہ کی صفات کا علم اور تدبیر اور یاد حق کی اور لگاؤ اللہ سے"

اور سورۂ ص میں تحت آیہ مذکورہ فرماتے ہیں:۔

"اپنی ایک جان" یعنی آب و خاک کی نہیں بنی، غیب سے آئی"

امام بیہقی فرماتے ہیں:۔

"جس روح میں سے آدم علیہ السلام کے اندر پھونکا گیا وہ اللہ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے جس سے حق تعالیٰ نے اجسام کی زندگانی کو قرار دیا ہے اور اپنی ذات کی طرف اس کی اضافت بسبب خلق و ملکیت ہے اس بنا پر نہیں کہ ہے کہ روح اس کا جزو ہے یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ ارشاد عزوجل ہے وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (اور مسخر کیا تمہارے واسطے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کی طرف سے ہے یعنی سب اسی کی مخلوق ہے[۱]" ۲۹/۱۴ ۷۲/۳۸ ۲۳/۱۲ ۔

رُءُوْسُ: اصل، سر، رَأْسٌ کی جمع ہے، ۳/۲۹ ۲۳ ۔

رُءُوْسِكُمْ تمہارے سر، رُءُوْسٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، ۶/۶ ۸/۲ ۲۶/۱۲ ۔

[۱] کتاب الاسماء والصفات، ص ۲۶۲

رُءُوْسِهِمْ: ان کے سر، رُءُوس مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۳/۱۹، ۱۵/۵، ۱۷/۵، ۱۷/۹، ۲۱/۱۳، ۲۸/۱۵۔

رَوْضٰتِ: باغات، سبزہ زار، رَوْضَةٌ کی جمع، ۲۵/۵۔

رَوْضَةٍ: باغ، سبزہ زار، اس کی جمع رِیَاضٌ بھی آتی ہے۔ ۲۱/۵۔

رَوْعُ: خوف، ڈر، رَاعَ يَرُوْعُ کا مصدر ہے، ۱۲/۷۔

رَءُوْفٌ: مہربان، شفقت کرنے والا، رَأْفَةٌ سے بروزن فَعُوْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ، اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ہے، امام حلیمی فرماتے ہیں:۔
"اس کے معنیٰ ہیں اپنے بندوں سے نرم برتاؤ کرنیوالا، کیونکہ حق تعالیٰ نے ان پر ایسی عبادتیں مقرر نہیں فرمائیں جن کی وہ بسبب اپاہج ہونے یا بیماری یا ضعف کے باعث طاقت نہیں رکھتے بلکہ جن عبادات کی ان میں طاقت تھی ان سے بھی بدرجہا زیادہ کم عبادات کا مکلف فرمایا اور ساتھ ہی شدت قوت کے زمانے میں اپنے فرائض کو سخت فرمایا اور ضعف و قوت کی کمی کے وقت ان کو ہلکا کر دیا، مقیم کو ان باتوں پر پکڑا جن پر مسافر کو نہ پکڑا اور تندرست کی ان امور پر گرفت کی جن پر بیمار کی گرفت نہ کی، یہ سب کچھ رافت و رحمت ہے"۔

امام خطابی نے رحمت و رافت کا فرق بیان کیا ہے:
"رحمت تو کسی مصلحت کی بنا پر کبھی ناپسندیدگی بھی ہوتی ہے لیکن رافت ناپسندیدگی میں تقریباً نہیں ہوتی"۔ [۱]

ملاحظہ ہو رَأْفَةٌ ۲/۹، ۱/۱۳، ۲/۱۱، ۱۱/۲، ۵/۱۱، ۷، ۱۳/۱۲، ۱۷/۱۶، ۱۸/۸، ۲۷/۱۷، ۲۸/۱۴۔

رُوْمٌ: قوم روم، رومی، کبھی تو اس لفظ کا استعمال قوم روم کے لئے ہوتا ہے اور کبھی رُوْمِی کی جمع کے لئے جس طرح کہ عجم ہے، ۲۱/۴۔

رُوَيْدًا: تھوڑی سی مہلت، اسم فعل ہے، ابن خالویہ کہتے ہیں، یہ اصل میں اِرْوَادٌ ہے، رُوَيْدٌ اِرْوَادٌ کی تصغیر ہے رُوَيْدًا کے معنی مہلت دینے اور ٹھہرنے کے ہیں، کہا جاتا ہے اِمْشِ مَشْيًا رُوَيْدًا یعنی آہستہ چل، جلدی نہ کر، [۲]
اور سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ رُوَيْدٌ اسم ہے ہمیشہ مصغر اور مامور بہ ہو کر بولا جاتا ہے، یہ

[۱] الاسماء والصفات امام بیہقی، ص ۴۲ [۲] اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم، ص ۵۳ (طبع دار الکتب المصریۃ قاہرہ ۱۳۶۰ھ)

رَوْدٌ کی تصغیر ہے جس کے معنی مہلت کے ہیں[1]

۳۰ ۔
۱۱

فصل الهاء

رِهٰنٌ : گرد، رہن، رِهْنٌ کی جمع ہے بمعنی مَرْهُونٌ، ۳ ۔

رَهْبٌ : ڈر، رَهِبَ یَرْهَبُ کا مصدر ہے جس کے معنی ڈرنے کے ہیں بعض کا قول ہے کہ حمیری زبان میں رهب آستین کو کہتے ہیں، اصمعی کا بیان ہے کہ میں نے ایک اعرابی کو کہتے ہوئے سنا اَعْطِنِیْ مافی رهبك (جو تیری آستین میں ہے مجھے دیدے) اس صورت میں آیت وَاضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ کے معنی ہوں گے اپنے ہاتھ کو آستین سے نکال کر اپنی طرف ملاؤ[2] اسی طرح مقاتل کہتے ہیں کہ میں لفظ رهب کی تفسیر کی تلاش میں نکلا تو مجھ سے ایک اعرابیہ کی ملاقات ہوئی میں کھکھا رہا تھا اس نے کہا اے اللہ کے بندے مجھ پر صدقہ کر، میں نے دونوں لپ بھر کر اسے دینا چاہا تو وہ کہنے لگی هٰهُنَا فِیْ رهبی (یہاں ڈال میری آستین میں) لیکن پہلے معنے زیادہ صحیح ہیں[3] ۲۰ ۔

رَهَبًا : خوف، ڈر، رَهِبَ یَرْهَبُ کا مصدر ہے، ۱۷ ۔

رُهْبَانٌ : زاہدانِ اہلِ کتاب، اہلِ کتاب کے درویش۔ لغوی لکھتے ہیں :-

" رهبان عابدانِ صومعہ نشین ہیں، اس کا واحد رَاهِبٌ ہے جیسے فَارِسٌ و فُرْسَانٌ اور رَاكِبٌ اور رُكْبَانٌ ہیں اور کبھی رُهْبَانٌ واحد ہوتا ہے اور اس کی جمع رَهَابِیْنُ ہے جیسے قُرْبَانٌ قَرَابِیْنُ" [4]

راغب کہتے ہیں، رهبان واحد اور جمع دونوں ہوتا ہے جو اس کو واحد قرار دیتے ہیں وہ اس کی جمع رَهَابِیْنُ بناتے ہیں اور رَهَابِنَةٌ جمع کے لئے زیادہ مناسب ہے، ۱۰ ۔
۱۱

رُهْبَانًا ۱۵ ۔

رُهْبَانَهُمْ : ان کے درویش، رُهْبَان مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۱۰ ۔
۱۱

رَهْبَانِیَّةً : دنیا چھوڑنا، گوشہ نشینی، راغب لکھتے ہیں :-

الرهبانیۃ غلو فرطِ خوف سے عبادت کی فی تحمل التعبد بجا آوری میں غلو کرنے کا نام

[1] الاتقان، ج ا، ص ۱۶۳ [2] معالم التنزیل ج ۵، ص ۱۴۳ [3] مفردات راغب [4] معالم التنزیل ج ، ص

من فرط الرھبۃ رہبانیت ہے۔

علامہ محمود بن عمر زمخشری کہتے ہیں :-

"راہبوں کا فعل رہبانیت ہے، پیا پے بغیر افطار روزے رکھنا، ٹاٹ پہننا، گوشت نہ کھانا وغیرہ وغیرہ، اس کی اصل رہبت سے ہے"۔ ؎۱

حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلوی، رہبانیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"یہ فقیری اور تارکِ دنیا بننا نصاریٰ نے رسم نکالی، جنگل میں تکیہ بنا کر بیٹھتے نہ جورو رکھتے نہ بیٹا، نہ کماتے نہ جوڑتے محض عبادت میں رہتے، خلق سے نہ ملتے اللہ نے بندوں پر یہ حکم نہیں رکھا"۔ ؎۲

سننِ ابی داؤد میں حضرتِ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ اللہ تم پر سختی کرے گا، بلاشبہ ایک قوم (راہبوں کی جماعت مراد ہے) نے اپنی جانوں پر سختی کی تو اللہ نے ان پر سختی کی چنانچہ یہ گرجاؤں اور دَیروں میں ان ہی کے بقایا ہیں وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ (ایک دنیا چھوڑنا انہوں نے نیا نکالا ہم نے ان پر نہیں لکھا تھا) ؎۳ مسندِ امام احمد بن حنبل میں حضرتِ ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم ایک سریہ (چھوٹی لڑائی) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نکلے پس ایک شخص کا گزر ایک ایسے غار پر ہوا جہاں کچھ پانی اور سبزہ تھا، اس نے اپنے دل میں کہا کہ یہاں پر اقامت گزیں ہو کر دنیا سے کنارہ کش ہو جاؤں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں اجازت طلب کی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے یہودیت یا نصرانیت دے کر نہیں بھیجا گیا، میں تو حنیفیتِ سمحہ (جو تمام کجرویوں سے ہٹ کر توحید کی طرف جھکی ہوئی اور آسان ہے) لے کر مبعوث ہوا ہوں، قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اللہ کی راہ میں ایک صبح نکلنا یا ایک شام نکلنا دنیا اور مافیہا سے بڑھ کر ہے اور تم میں سے کسی ایک کا صف میں قائم رہنا اس کی ساٹھ سالہ نماز سے بڑھ کر ہے ؎۴ بغوی نے اپنی اسناد سے حضرتِ عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ

؎۱ الفائق فی غریب الحدیث ج ۱، ص ۲۶۹ (طبع دائرۃ المعارف، حیدر آباد دکن)
؎۲ موضح القرآن، سورہ حدید، تفسیر آیۃ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا
؎۳ مشکوٰۃ المصابیح، ص ۳۱ (طبع مجتبائی دہلی) ؎۴ ایضاً، ص ۲۲۴

سے نقل کیا ہے کہ جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رہبانیت کی اجازت مانگی تو آپ نے ارشاد فرمایا:

ترهبُ امتی الجلوس فی المساجد و انتظار الصلوٰة۔[1] میری امت کی رہبانیت مسجد میں بیٹھنا اور نماز کا انتظار کرنا۔

واضح رہے کہ حدیث لا رهبانية فی الاسلام جو زبان زدِ خاص وعام ہے، حافظ ابنِ حجر عسقلانی اس کے متعلق فتح الباری شرح صحیح البخاری میں رقمطراز ہیں:۔

واما حدیث لا رهبانية فی الاسلام فلم اره بهذا اللفظ لکن فی حدیث سعد بن ابی وقاص عند الطبرانی ان الله قد ابدلنا بالرهبانية الحنيفية السمحة۔[2] اور رہی حدیث لا رهبانية فی الاسلام تو میں نے اس کو بایں لفظ نہیں دیکھا لیکن طبرانی میں سعد بن ابی وقاص کی حدیث میں یوں ہے کہ اللہ نے رہبانیت کے بدلہ میں ہم کو آسان حنیفیت عطا کی ہے۔

۲۷/۲۰

رَهْبَةٌ: ڈر، رعب، ایسا خوف جس میں بچاؤ کا خیال اور اضطراب موجود ہو "رہبت" کہلاتا ہے رَهِبَ يَرْهَبُ کا مصدر رہے۔ ۵۹/۱۳

رَهْطٌ: نفر، شخص، قبیلہ، برادری، بھائی بند، راغب اور زمخشری دونوں نے لکھا ہے کہ دس سے کم آدمیوں کی جماعت "رہط" کہلاتی ہے اور بعض کا قول ہے کہ چالیس تک کے لئے "رہط" استعمال ہوتا ہے، بغدادی لکھتے ہیں کہ رہط اور نفر میں فرق یہ ہے کہ رہط کا استعمال تین یا سات سے دس تک کے لئے ہوتا ہے اور نفر کا استعمال تین سے نو تک کے لئے۔[3] قرآن نے اس کا استعمال قوم اور برادری کے معنی میں بھی کیا ہے جس سے اس قوم کی تائید ہوتی ہے کہ چالیس اشخاص تک کی جماعت کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے، زمخشری نے لکھا ہے کہ اس کی جمع اَرَاهِطُ آتی ہے جیسے کہ سیبویہ کے نزدیک باطل کی جمع میں اباطیل آتا ہے اور دوسروں کا بیان ہے کہ رہط کی جمع اَرْهُطٌ آئیگی اور استشہاد میں پیش کیا ہے ؎ وفاضوا منتضح فی ارهط پھر ارهط کی جمع اراهط ہوگی۔[4] ۱۹/۱۹

[1] معالم التنزیل ج ۲ ص ۷۰، [2] فتح الباری ج ۹ ص ۹۶ [3] انوار التنزیل ج ۲ ص ۱۲۰ (طبع مصر) [4] الفائق ج ۱ ص ۲۰۷

رَھۡطُكَ: تیرا قبیلہ، تیری برادری، تیرے بھائی بند، رَھۡطُ مضاف، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ۔ ۱۱/۹۲۔

رَھۡطِیۡ: میرا قبیلہ، میری برادری، میرے بھائی بند، رَھۡطِ مضاف، یْ ضمیر واحد متکلم، مضاف الیہ، ۱۱/۹۲۔

رَھَقًا: سرکشی، تکبر، سر چڑھنا، ستم، زیادتی، زبردستی، رَھِقَ یَرۡھَقُ کا مصدر ہے۔ اصل میں اس کے معنی ایک شے کے دوسری شے پر زبردستی چھا جانے کے ہیں اور چونکہ اس کا لازمی نتیجہ ہے تباہی اس لئے تباہ ہونے کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، مبرد نے تصریح کی ہے کہ جب کسی شخص کے متعلق کہا جائے فیہ رھق تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں عقل کی کمی ہے جس کی بنا پر وہ شر میں گھرا ہوا ہے اور برائی ہر طرف سے اس پر چھا رہی ہے[1]۔ آیہ شریفہ فَزَادُوۡھُمۡ رَھَقًا (پھر ان کو بڑا سر چڑھنا) میں سرکشی اور تکبر مراد ہے اور فَلَا یَخَافُ بَخۡسًا وَّلَا رَھَقًا (سو وہ نہ ڈرے گا نقصان سے زبردستی سے) میں تباہی کے معنی مراد ہیں کیونکہ دوسرے کی زبردستی کا نتیجہ اپنی تباہی ہے۔ ۷۲/۱۱۔

رَھۡوًا: خشک، تھما ہوا، راغب لکھتے ہیں "رھو کے معنی ہیں ساکن یعنی تھمے ہوئے اور ٹھہرے ہوئے کے اور بعض نے کہا ہے کہ راہ کی وسعت مراد ہے اور یہی صحیح ہے" یہ رَھَا یَرۡھُوۡ کا مصدر ہے جس کے معنی دریا کے تھمنے کے آتے ہیں، امام بخاری سورہ حٰم الدخان کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "مجاہد نے کہا ہے رھو خشک راستہ ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رھو کے معنی ساکن کے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

"مجاہد کے قول کو فریابی نے اپنے طریق سے وابیت کیا ہے اور اتنا زیادہ کیا ہے کہ اسی ہیئت پر جو کہ ضرب کے دن تھی (یعنی اللہ یہ فرماتا ہے کہ) سمندر کو یہ حکم نہ دو کہ وہ اصلی حالت پر رجوع کرے بلکہ اس وقت تک کے لئے چھوڑ دو کہ (لشکر فرعون) کا آخری (سپاہی) تک داخل ہو جائے اور عبد بن حمید نے دوسرے طریق سے مجاہد سے رھوا کے معنی منفرجا یعنی وسیع اور کشادہ کے نقل کئے ہیں اور عبد الرزاق معمر سے وہ قتادہ سے راوی ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے رخ کیا کہ سمندر پر ضرب لگائیں تاکہ وہ باہم مل جائے اور انہیں ڈر ہوا کہ مبادا فرعون اپنی فوجوں سے

[1] الفائق، ج ۱، ص ۲۵۷

ان کا تعاقب کرے تو ان سے کہا گیا اُتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا (سمندر کو خشک ہی رہنے دو) یہ فرماتے ہیں کہ جیسا خشک راستہ بن گیا ہے، رہنے دو، کیونکہ یہ لشکر غرق ہونے والا ہے۔"

اور دوسرا قول ابوعبیدہ کا ہے انہوں نے وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا کی تفسیر ساکناً سے کی ہے کہا جاتا ہے جاءت الخیل رهوا یعنی ساکنۃ گھوڑے تھمے ہوئے آئے اور ارہ علی نفسك (اپنے اوپر نرمی کر) اور عیش راہ (سکون کی زندگی)"[1] ۲۵/۱۴

رَهِيْنٌ: گرو، گرفتار، پھنسا ہوا، رِهْنٌ سے جس کے معنی گرو ہونے کے ہیں، بروزن فَعِيْلٌ بمعنی مرہون ہے، ۲۷/۲۔

رَهِيْنَةٌ: گرو، راغب لکھتے ہیں:۔

"رهینة کے متعلق بعض کا قول ہے کہ فعیل ہے بمعنی فاعل یعنی ثابتة مقیمة ثابت رہنے والی، قیام کرنے والی اور بعض کا قول ہے کہ بمعنی مفعول ہے یعنی ہر جان اپنے گزشتہ اعمال کی پاداش میں رکی ہوئی ہے۔"

بیضاوی لکھتے ہیں:۔

"کہ یہ مصدر ہے جیسے شکیمة اور مثل رهن کے مفعول کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور اگر صفت ہو تو رهین کہا جاتا۔"[1] ۲۹/۱۶۔

فصل الیاء المثناۃ

رِءْيًا: نمود، منظر، قرآنِ کریم کے رسم الخط میں یہ ہمزہ ساکن کے ساتھ بغیر مرکز کے خلافِ قیاس لکھا جاتا ہے رُؤْيَةٌ سے مشتق ہے بروزن فِعْلٌ جیسے طحن اور خبز میں جو چیز نظر آئے اس کا نام رِءْيٌ ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے طبری نے بطریق علی بن ابی طلحہ اور ابن ابی حاتم نے بطریق ابی ظبیان منظر ہی کے معنی نقل کئے ہیں، نیز ابن ابی حاتم نے ابورزین سے کپڑوں کے اور عبدالرزاق نے بروایت معمر قتادہ سے اور ابن ابی حاتم نے حسن بصری سے صورتوں کے معنی روایت کئے ہیں[2]، یہ دونوں مرادی معنی ہیں۔ ۱۶/۸۔

رِئَاءَ: دکھاوا، دکھانا، خودنمائی، باب مفاعلت کا مصدر ہے، اس کے معنی ہیں دوسرے کو دکھانے کے لئے کسی کام کا کرنا، یہ لفظ تمام قرآن شریف میں

[1] انوار التنزیل، ج ۲، ص ۳۴۷

[2] فتح الباری، ج ۸، ص ۳۲۴، ۳۲۵

ہمزہ کے ساتھ جو ی کے مرکز پر ہوتی ہے لکھا جاتا ہے
اور یار کے نیچے نقطے نہیں دیے جاتے ۔[1]
[۳]

رُؤیا: خواب، قرآن مجید میں یہ لفظ بغیر واؤ کے
صرف ہمزہ کے ساتھ بغیر مرکز ہمزہ کے لکھا جاتا ہے، رَأَی یَرَی
کا مصدر ہے جس کے معنی خواب دیکھنے کے ہیں نیز یہ وزن
فعلی خواب کا اسم بھی ہے، بیضاوی لکھتے ہیں:۔
"رؤیا رؤیۃ ہی کی طرح ہے مگر وہ خواب میں دیکھنے
کے لئے مخصوص ہے ان دونوں میں تانیث کے دو
حرفوں کا فرق ہے جیسے کہ قُربۃ اور قُربٰی ہے"[1]
واحدی نے تصریح کی ہے کہ یہ اصل میں مصدر ہے جیسے
یسریٰ پھر جب یہ اس چیز کا نام قرار پایا جو سونے والے
کے تخیل میں ہوتا ہے تو اسما کی بجائے استعمال کیا گیا۔
علامہ قرطبی معہم شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ بعض علماء کا
بیان ہے "رویا" کبھی بمعنی رؤیت بھی آتا ہے جیسے اللہ
تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ
إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ[2] (اور رؤیا جو ہم نے تجھے دکھائی تو
اسی لئے دکھلائی کہ لوگوں کے لئے ایک آزمائش ہو)
مگر یہ حریری سے اور لوگوں کی اتباع میں اس سے انکار

کیا ہے ان کا بیان ہے کہ "رویا" خواب کیلئے کہا
جاتا ہے اور بیداری میں جو ہو اس کو "رؤیۃ" کہتے ہیں
لیکن متنبی ان لوگوں میں سے ہے جس نے "رویا" کا
استعمال بیداری کیلئے کیا ہے چنانچہ کہتا ہے ع
ورؤیاک احلی فی العیون من الغمض[4]
(نیم باز آنکھوں کی بہ نسبت تو تیرا (نگاہ بھر کر) دیکھنا
آنکھوں کو زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے) نیز ترجمان القرآن
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما آیہ مذکورہ کی
تفسیر میں فرماتے ہیں ھی رؤیا عین اریھا رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ اسری بہ[5] (یہ آنکھ
کا دیکھنا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شب اسری
میں دکھایا گیا) حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں احتمال
ہے کہ اس کو رؤیا سے موسوم کرنے میں یہ حکمت ہو کہ
امور غیب چونکہ رؤیت شہادت کے مخالف ہیں اس
لئے وہ عالم مثال کے مشابہ قرار دئے گئے۔[6] [۱۲/۱۱ ۱۶]
[۱۳ ۵ ۳ ۲۲ ۲۶ ۶ ۱۲] ۔

ریاح: ہوائیں، ریح کی جمع، واضح رہے کہ قرآن
مجید میں جہاں "ارسال ریح" کا تذکرہ ہے اگر بلفظ جمع ہے
یعنی ریاح کا لفظ استعمال ہوا ہے تو وہاں عام طور

---

[1] انوار التنزیل، ج ۱، ص ۳۰۴ [2] [3] فتح الباری، ج ۱۲، ۳۰۹ [4] ایضاً ج ۸، ص ۳۰۲ (طبع میریہ مصر ۱۳۰۱ھ)
[5] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنۃ للناس
[6] فتح الباری، ج ۱۲، ص ۳۰۹ (طبع میریہ مصر)

پید رحمت کی ہوائیں مراد ہیں اور اگر ریح یعنی واحد کا لفظ استعمال ہوا ہے تو عذاب کے معنی مراد ہیں، امام سیوطی اتقان میں قرآن مجید کے قاعدہ افراد و جمع کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

" اور اسی قاعدہ سے ریح ہے کہ وہ جمع ہو کر بھی مذکور ہے اور مفرد ہو کر بھی، پس جہاں وہ سیاقِ رحمت میں ذکر کی گئی ہے، جمع ہو کر مستعمل ہوئی ہے اور جہاں سیاقِ عذاب میں آئی ہے مفرد لائی گئی ہے ابن ابی حاتم وغیرہ نے حضرتِ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ قرآنِ مجید میں ریاح میں سے ہر شے رحمت اور ریح میں سے ہر شے عذاب ہے اور اسی لئے حدیث میں وارد ہے اللھم اجعلھا ریاحا ولا تجعلھا ریحا (اے اللہ اس کو ریاح کر، ریح نہ بنا) اور اس کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ رحمت کی ہواؤں کی صفتیں، ہیئتیں اور منفعتیں مختلف ہیں اور جب بھی ان میں سے کوئی ہوا چلتی ہے تو ان کے مقابل سے ایسی چیز ابھار دی جاتی ہے جو اس کی تیزی کو توڑ کر رکھ دے اور پھر ان دونوں کے درمیان سے ایسی ہوائے لطیف اٹھتی ہے جو حیوان و نبات دونوں کو نفع دیتی ہے پس رحمت میں تو کئی ہوائیں ہوئیں اور عذاب کے اندر ہوا ایک ہی رخ پر آتی ہے، نہ ان کا کوئی روکنے والا ہوتا ہے نہ دفع کرنے والا البتہ سورۂ یونس میں جو ارشادِ الٰہی وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ (اور لوگوں کو خوش آئند ہوا کے ساتھ لے کر چلیں) ہے، وہ اس قاعدہ سے خارج ہے جس کی دو وجہیں ہیں، ایک تو لفظی اور وہ جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ آیا اس کو آندھی کی ہوا نے ہے کے مقابلہ میں آتا ہے اور بعض اوقات ایک شے مقابلہ میں جائز ہوتی ہے اور استقلالاً ناجائز جیسے وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ اور دوسری معنوی اور وہ یہ ہے کہ یہاں رحمتِ تمام، وحدتِ ریح سے حاصل ہو گی نہ کہ اختلافِ ریاح سے کیونکہ کشتی ایک ہی ہوا سے، جو ایک ہی رخ کی ہو، چلتی ہے اور جو اس پر مختلف ہوائیں چلیں تو تباہی کا سبب ہوں پس یہاں ایک ہی ہوا مطلوب ہے اور اسی لئے اس معنی کی طیب کے وصف سے تاکید کی گئی ہے اور اسی پر ارشادِ الٰہی جاری ہوا ہے إِن يَشَأْ يُسْكِنِ الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ (اور اگر چاہے تھام دے ہوا کو تو رہ جائیں سارے دن ٹھہرے) اور ابن المنیر کا بیان ہے کہ یہ قاعدہ ہی یہ ہے کیونکہ ہوا کا تھم جانا

کشتی بانوں کے لئے سختی اور عذاب ہے" ؁۱

٢/٢، ١٤/١٤، ٢/٢، ٨/١٥، ٣/١٩، ١/٢٠، ٨/٢١، ١٤/٢٢، ١٧/٢٥ -

رَیْبٌ: شک، شبہ، گمان، رَابَ یَرِیْبُ کا مصدر ہے اس کے معنی شک، ور گمان میں ڈالنے کے ہیں،

راغب اصفہانی لکھتے ہیں:-

الریب ان تتوھم	ریب یہ ہے کہ کسی شے کے
بالشئ امرا ما	متعلق آپ کو ایک بات کا
فینکشف عما	وہم ہو اور وہ شے آپ کے وہم
تتوھمہ -	سے الگ ظاہر ہو

غرض "ریب" کا استعمال اس شک یا گمان کے متعلق ہوتا ہے جس کی حقیقت بعد میں اس کے برخلاف منکشف ہو جائے اور چونکہ زمانہ کی گردشوں کے تعین اوقات میں بھی شک ہوتا ہے کہ خدا جانے کب گردش کا وقت آجائے اس لئے جب زمانہ کے ساتھ ریب کا لفظ مستعمل ہو گا تو گردش کے معنی ہونگے ارشاد ہے نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (ہم راہ دیکھتے ہیں اس پر زمانہ کی گردشوں کی) ٢/١، ٩ر١١/٣، ٨/٥، ٨/٧، ٩/١١

١١ر١٤/٥، ٨/١٧، ١٤/٢١، ١١/٢٤، ٢ر١٩ر٢٠/٢٥، ٤/٢٧ -

رِیْبَةٌ: شبہ، شک، ریب سے اسم ہے، رِیَبٌ جمع، ٢/١١

رَیْبِهِمْ: ان کا شک، ریب مضاف ھم ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ١٣/٢ -

رِیَاحٌ: ہوا، بو، ہوائے متحرک جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر ہے ریح کہلاتی ہے، رِیْحٌ اصل میں رِوْحٌ تھا، دلیل یہ کہ اس کی تصغیر رُوَیْحَۃٌ آتی ہے لیکن ماقبل کے مکسور ہونے کی بنا پر واو کو ی سے بدل لیا گیا ہے، اصل کے اعتبار سے اس کی جمع اَرْوَاحٌ اور کسرہ ماقبل کے اعتبار سے رِیَاحٌ آتی ہے۔ ریح کی چار قسمیں ہیں (۱) شمال (شمالی ہوا) یہ شام کی طرف سے چلتی ہے، موسم گرما میں گرم ہوتی اور خاک اڑاتی ہے (۲) جنوب (جنوبی ہوا) جو اس کے مقابل ہے یہی ریح یمانی ہے (۳) صبا (پروا ہوا) مشرق کی طرف سے چلتی ہے اسی کو قبول بھی کہتے ہیں (۴) دبور (پچھوا ہوا) مغرب کی سمت سے چلتی ہے۔ ریح کا استعمال بیشتر تو مؤنث ہی ہو کر ہے مگر کبھی کبھی مذکر بھی بولا جاتا ہے۔ یہ ابو زید نے نقل کیا ہے اور ابن الانباری کا بیان ہے کہ ریح بلا کسی علامت کے مؤنث ہے اور بجز ایک اعصار (بگولا) کے کہ وہ تو البتہ مذکر ہے، اس کے اور تمام اسماء بھی اسی کی طرح سے ہیں۔ ؁۲

؁۱ الاتقان ج ص ۲۷۳ (طبع احمدی ۱۲۸۰ھ) ؁۲ ملاحظہ ہو المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر از احمد بن محمد فیومی ج ۱، الراء مع الواو (طبع خیریہ مصر ۱۳۰۵ھ)

نیز ریح کا استعمال بُو کے معنی میں ہوتا ہے کیونکہ کسی چیز کی بُو جو ناک میں پہنچتی ہے وہ ہوا ہی کے ذریعہ پہنچتی ہے حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانی قرآنِ مجید میں منقول ہے اِنِّی لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ (میں پاتا ہوں بُو یوسف کی) اور کبھی کبھی بطور استعارہ غلبہ کے لئے بھی ریح کا استعمال ہوتا ہے ارشاد ہے وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ (اور جاتی رہیگی تمہاری ہوا یعنی غلبہ ختم ہو جائیگا۔

۳/۱۱۷، ۸/۱۱، ۵/۱۴ ،۱۳، ۷/۱۵، ۶/۱۷ ،۱۱، ۸/۲۲، ۱۲/۲۳، ۵/۲۵، ۳/۲۶، ۱/۲۷، ۵/۲۹ ـ رِیْحًا ۸/۲۱ ،۱۸، ۱۲/۲۳، ۸/۲۷ ـ

رَیْحَانٌ: خوشبودار پھول، روزی، احمد فیومی

المصباح المنیر میں لکھتے ہیں :-

"ریحان ہر اگنے والی خوشبودار شے ہے لیکن عام لوگوں میں جب یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو مخصوص نبات کی طرف پلٹتا ہے نیز اس کے متعلق اختلاف ہے بہت سے یہ کہتے ہیں کہ یہ واوی ہے اور اس کی اصل ریوحان ہے بیاء ساکنہ اور پھر واؤ مفتوح لیکن اس میں ادغام کر کے تخفیف کر لی گئی ہے بایں دلیل کہ اس کی تصغیر رویحین پر ہے اور ایک جماعت کا یہ بیان ہے کہ یہ یائی ہے برزن شیطان اور اس میں تغیر نہیں ہوا ہے بایں دلیل کہ اس کی جمع ریاحین پر ہے جیسے شیطان اور شیاطین ہیں"۔ [۱]

امام راغب فرماتے ہیں :-

اور فرمانِ ایزدی فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ میں ریحان تو وہ ہے جس میں رائحہ (بُو) ہوا ور روزی کو بھی کہا گیا ہے، پھر ارشادِ الٰہی وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ میں کھانے کے اناج کو ریحان بتایا جاتا ہے۔ ایک اعرابی سے کہا گیا کہ کہاں چلے؟ جواب دیا اطلب من ریحان اللہ میں اللہ کے رزق کی تلاش میں ہوں"۔

محی السنہ بغوی سورۂ الرحمٰن میں ریحان کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

"اکثر کے قول میں وہ رزق ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ قرآن میں جہاں ریحان ہے، رزق ہی کے معنی ہیں، حسن بصری اور ابن زید کہتے ہیں کہ یہ وہی تمہارا ریحان ہے جسے سونگھا جاتا ہے۔ ضحاک کا قول ہے کہ عصف بھس اور ریحان اس کا پھل ہے"۔ [۲]

---

[۱] ملاحظہ ہو المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر از احمد بن محمد فیومی، ۱/۲۱ - الراء مع الواو (طبع خیریہ مصر ۱۳۵۰ھ)

[۲] تفسیر معالم التنزیل، ج ۴، ص ۱۱۲ (طبع صالحی بمبئی ۱۲۶۹ھ)

اور سورۂ واقعہ میں ارقام فرماتے ہیں :-

" ریحان استراحت ہے اور مجاہد اور سعید بن جبیر نے رزق کہا ہے، مقاتل کہتے ہیں کہ حمیری زبان میں یہی معنی ہیں، بولا جاتا ہے خرجت اطلب من ریحان اللہ یعنی میں اللہ کے رزق کو طلب کرنے نکلا ہوں اور دوسروں کا بیان ہے کہ ریحان سے وہی ریحان مراد ہے جو سونگھا جاتا ہے، ابو العالیہ کا قول ہے کہ مقربین میں کوئی دنیا سے اس وقت تک رخصت نہیں ہوتا جب تک کہ ریحان جنت سے شاخ لاکر اس کو سنگھا نہ دی جائے، اس کے بعد اس کی روح قبض کی جاتی ہے " [1]

علامہ ابن الجوزی نے فنون الافنان میں تصریح کی ہے کہ قرآن میں ہمدان کی زبان میں ریحان بمعنی رزق ہے۔ [2]

۲۷
۱۱ / ۱۹ -

رِيحُكُمْ : تمہاری ہوا، رِیْحٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ۔ امام بغوی نے اس کی تفسیر میں حسبِ ذیل اقوال نقل کئے ہیں :-

" مجاہد کا قول ہے تمہاری نصرت، سدی نے کہا تمہاری جرأت و کوشش، مقاتل کہتے ہیں تمہاری حدت، نضر بن شمیل کا بیان ہے تمہاری قوت،

اخفش فرماتے ہیں تمہاری دولت یعنی حکومت "

اس کے بعد لکھتے ہیں :-

" اور " ریح " اس مقام پر حکم کے نافذ ہونے اور اس کے مقصد کے مطابق جاری ہونے سے کنایہ ہے، جب کسی شخص کا معاملہ اس کی مراد کے مطابق آگے بڑھنے لگے تو عرب والے بولتے ہیں ھبت ریح فلان (فلانے کی ہوا آگئی) قتادہ اور ابن زید نے کہا ہے کہ یہ " ریح نصر " یعنی مدد کی ہوا ہے، کبھی کوئی مدد بغیر اس ہوا کے نہیں ہوئی جس کو حق تعالیٰ اس لئے بھیجتا ہے کہ دشمن کے چہروں پر ضرب لگائے اور اسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نصرت بالصبا و اھلکت عاد بالدبور مجھے پروا کے ذریعہ مدد دی گئی اور عاد پچھوا کے ذریعہ ہلاک کئے گئے، اور نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ میں رہا ہوں تو جب کبھی آپ دن کے ابتدائی حصے میں قتال نہ فرماتے تو انتظار کرتے کہ ہوائیں چلنے لگیں اور نمازوں کا وقت آ لگے اور ایک روایت میں یوں ہے کہ یہاں تک انتظار فرماتے کہ آفتاب

[1] تفسیر معالم التنزیل، ج ۴، ص ۱۲۴

[2] الاتقان از سیوطی، ص ۱۸۹ (طبع احمدی)

ڈھل جائے اور ہوائیں چلنے لگیں اور مدد اترنے لگے۔" سلہ ب۲

رِيْشًا : رونق، لباس، زینت، مال، ریش، اصل میں پرندوں کے پروں کو کہتے ہیں، اس کا واحد رِیْشَۃٌ ہے اور چونکہ پرندوں کی پروں سے رونق ہے اور وہ ان کیلئے ایسے ہی ہیں جیسے انسان کے لئے کپڑے اس لئے بطور استعارہ اس کا استعمال رونق، زیب، زینت اور کپڑوں کے لئے ہوتا ہے نیز رونق اور لباسِ زینت لازمہ ہے، مال کا اس لئے اس کے معنی مال کے بھی آتے ہیں،

خازنِ بغدادی لکھتے ہیں :-

" آیت میں جو لفظِ ریش مذکور ہے اس کے معنی میں علماء مختلف ہیں پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تو مال کے معنی بیان فرماتے ہیں اور یہی قول مجاہد، ضحاک اور سدی کا ہے کیونکہ مال ان چیزوں سے ہے جس کے ذریعہ زینت حاصل کی جاتی ہے چنانچہ جب کوئی شخص مالدار ہو تو کہا جاتا ہے

تریش الرجل (وہ مرد مالدار بن گیا) اور ابن زید کا قول ہے کہ "ریش" جمال ہے اور یہ معنی بھی زینت ہی کی طرف لوٹتے ہیں اور بیان کیا گیا ہے کہ ریاش عربی زبان میں اثاثہ ہے اور وہ کپڑے اور سامان کہ جس کو ظاہر میں پہنایا جاتا یا بچھایا جاتا ہے اور ریش بھی ان کے نزدیک متاع اور اموال کو کہتے ہیں اور لبا اوقات اہل عرب تمام مال چھوڑ کر اس کا استعمال صرف لباس اور کسوت (پہننے کے کپڑے) ہی میں کرتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے انہ لحسن الریش (یعنی اس کے کپڑے عمدہ ہیں) اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ریش اور ریاش کا استعمال فراخی و خوشحالی کے لئے بھی ہوتا ہے۔" سلہ ب۷

رِيْعٍ : ٹیلا، وہ مکان مرتفع جو دور سے ظاہر ہو "ریع" کہلاتا ہے اس کا واحد رِیْعَۃٌ اور جمع رُیُوْعٌ اور اَرْیَاعٌ ہے۔ پ۱۹/۱۱

سلہ معالم التنزیل، ج ۲، ص ۵۲ (طبع بمبئی) سلہ تفسیر لباب التاویل از خازن، ج ۲، ص ۸۱ (طبع میمنیہ مصر ۱۳۱۷ھ)

باب الزاء المعجمة

فصل الالف

زَاجِرَاتِ: ڈانٹنے والیاں، زَجْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، زَاجِرَۃٌ واحد، اکثر مفسرین کے نزدیک یہ فرشتوں کی صفت ہے جو بادل کو ڈانٹ کر ہنکاتے اور شیطانوں کو جھڑکتے رہتے ہیں چونکہ لفظِ ملائکہ مؤنث ہے اس مناسبت سے صفت بھی مؤنث ہوگی اور بعض مفسرین کے نزدیک زاجرات سے وہ نواہی مراد ہیں جن سے قرآن مجید نے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے (ملاحظہ ہو زَجْرًا) - ۲۳/۵ -

زَادٌ: توشہ، خرچ راہ، فی الوقت جسکی احتیاج ہو اس سے زائد ذخیرہ کو "زاد" کہتے ہیں، اَزْوَادٌ جمع، ۲/۹

زَادَتْهُ: اس نے اس کو زیادہ کیا، اس نے اس کو بڑھایا، زَادَتْ زِیَادَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب ہُ ضمیر واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اَزِیْدُ) ۹/۵

زَادَتْهُمْ: اس نے ان کو زیادہ کیا، اس نے ان کو بڑھایا، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۹/۱۵ ۹/۵ -

زَادَكُمْ: اس نے تم کو زیادہ دیا، اس نے تم کو بڑھایا - زَادَ زِیَادَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، ۸/۱۶ -

زَادُوْكُمْ: انہوں نے تم کو زیادہ دیا، انہوں نے تم کو بڑھایا، زَادُوْا زِیَادَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، ۱۰/۱۳ -

زَادُوْهُمْ: انہوں نے ان کو زیادہ دیا، انہوں نے ان کو بڑھایا، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۲۹/۱۱ ۲/۹ -

زَادَهٗ: اس نے اس کو زیادہ دیا، اس نے اس کو بڑھایا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو زَادَكُمْ) ۲/۱۶ -

زَادَهُمْ: اس نے ان کو زیادہ دیا، اس نے ان کو بڑھایا، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۴/۲

۔

زَارِعُوْنَ: کھیتی کرنے والے، زرع سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، زَارِعٌ واحد (ملاحظہ ہو تزرعون)

زَاغَ: وہ بہکا، وہ کج ہوا، (ضرب) زَیْغٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو زیغ)۔

زَاغَتْ: وہ چوک گئی، وہ بہک گئی، وہ پھری، وہ کج ہوئی، زَیْغٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب۔

زَاغُوْا: وہ پھر گئے، وہ کج ہوئے، زَیْغٌ سے کا صیغہ جمع مذکر غائب۔

زَالَتْ وہ زائل ہوئی، زِیَالٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، مَا زَالَتْ (یہی رہی، متواتر رہی) افعالِ ناقصہ میں سے ہے، فاعل کے ساتھ استمرارِ فعل کے معنی ہوں گے (ملاحظہ ہو تزال)۔

زَالَتَا: وہ دونوں ٹل گئیں، وہ دونوں اپنے مقام سے ہٹ گئیں، زَوَالٌ سے ماضی کا صیغہ تثنیہ مؤنث غائب (ملاحظہ ہو تزول)۔

زَانٍ: زنا کرنے والا مرد، زِنٰی سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، اصل میں زَانِیٌ تھا چونکہ اسم منقوص ہے اس لئے رفع اور جرکی حالت میں ی جو حرفِ علت تھی، ساقط ہو جاتی ہے (ملاحظہ ہو زنا)۔

زَانِیْ: زنا کرنے والا مرد، زِنًا سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر۔

زَانِیَةٌ: زنا کرنے والی عورت، زِنًا سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث۔

زَاهِدِیْنَ: بیزار، زُهْدٌ اور زَهَادَةٌ سے جس کے معنی بے رغبت اور بیزار ہونے اور تھوڑے سے پر راضی ہو جانے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، زَاهِدٌ واحد۔

زَاهِقٌ: مٹ جانے والا، مٹ جانے والا، زائل ہو جانیوالا، زَهَقٌ اور زُهُوقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو تزهق)۔

فصل الباء الموحدة

زَبَانِیَةٌ: سیاست کے پیادے، دوزخ کے فرشتے، "زبانیہ" عربی زبان میں سیاست کے پیادے یعنی پولیس کے سپاہی کو کہتے ہیں، فریابی نے مجاہد سے اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرشتگان دوزخ کے معنی نقل کئے ہیں[1]، لغوی لکھتے ہیں یہ زِبْنِیَۃٌ کی جمع ہے جو زَبْنٌ سے

[1] فتح الباری، کتاب التفسیر سورۂ علق۔

ماخوذ ہے جس کے معنی دفع کرنے کے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں زبانیہ جہنم مراد ہیں یہ اس نام سے اس لئے موسوم ہوئے کہ دوزخیوں کو دوزخ کی طرف دھکیلیں گے، جرمی کے نزدیک اس کا واحد زِبنِیَۃ ہے ۳۰/۲۱ ۔

زَبَدٌ: جھاگ، اسم ہے، ۱۳/۱۷ ۔

زَبَدًا ۱۳/۱۷ ۔

زُبَرَ: لوہے کے تختے لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے زُبرۃ کی جمع ہے جیسے کہ غُرفۃ کی جمع غُرَف ہے لوہے کے بڑے ٹکڑے کو زُبرۃ کہتے ہیں ۱۶/۲ ۔

زُبُرِ: کتابیں، اوراق، زُبُورٌ کی جمع، ۱۴/۱۲ ۱۹/۱۵ ۲۲/۱۵ ۲۷/۱ ۔

زُبُرًا: ٹکڑے ٹکڑے، پارہ پارہ، امام راغب لکھتے ہیں، کبھی زُبرۃ بالوں کے گچھے کے لئے بولا جاتا ہے اور مجازاً اس کا استعمال ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کے لئے ہوتا ہے ارشاد ہے، فَتَقَطَّعُوْا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا (پھر پھوٹ کر کر لیا اپنا کام آپس میں ٹکڑے ٹکڑے) علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ یہ زبر الفضۃ والحدید (چاندی اور لوہے کے ٹکڑے) سے مستعار ہے قتادہ اور مجاہد نے زُبُر کے معنے کتابوں کے بیان کئے ہیں ہر فریق نے اپنا دین اس کتاب کو ٹھہرایا جس کو دوسرے نے دین نہ بنایا، اس صورت میں زَبُور کی جمع ہوگا، ۲۳/۴ ۔

زَبُوْرِ: زبور، وہ آسمانی کتاب جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، زَبرٌ سے جس کے معنی لکھنے کے ہیں بروزن فَعُوْلٌ ہے بمعنی مفعول یعنی مکتوب کے جیسے رسول ہے زُبُرٌ جمع ہے ابن درید لغوی نے لکھا ہے کہ اصل میں زَبرٌ چٹان میں کندہ کرنے کو کہتے ہیں اور اہل یمن ہر باب کو زبر بولتے ہیں وہ لوگ شاخ خرما پر لکھا کرتے تھے، علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں :-

"ہر وہ کتاب جس کی کتابت گاڑھی ہو اس کو زبور کہا جاتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ زبور کتب الٰہیہ میں سے ہر وہ کتاب ہے جس پر واقفیت دشوار ہو، ارشاد ہے وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ (اور یہ لکھا ہے پہلوں کی کتابوں میں) اور فرمایا وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ (اور نوشتے اور چمکتی کتاب) اور اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ

---

۱ معالم التنزیل تفسیر سورہ علق ۲ کتاب اعراب ثلاثین سورہ من القرآن العظیم از ابن خالویہ، ص ۱۴۱ ۳ تفسیر کشاف ج ۲ ص ۶۶ (طبع بولاق مصر ۱۲۸۳ھ) ۴ معالم التنزیل امام البغوی، ج ۳، ص ۵۲ (طبع بمبئی ۱۲۹۶ھ)
۵ جمہرۃ اللغۃ، ج ۱، ص ۲۵۴ (طبع دائرۃ المعارف۔

فِی الزُّبُرِ، ہم کو نازل نہیں کی گئی، ورقوں میں اور بعض کا قول ہے کہ زبور اس کتاب کا نام ہے جس میں صرف عقلی حکمتیں ہوں، احکامِ شرعیہ نہ ہوں اور کتاب اس کو کہتے ہیں جو احکام و حکم دونوں پر مشتمل ہو اور اس امر پر یہ چیز بھی دلالت کرتی ہے کہ حضرتِ داؤد علیہ السلام کی زبور میں احکام میں سے کوئی چیز نہیں ہے۔"

امامِ بغوی لکھتے ہیں :-

" زبور وہ کتاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرتِ داؤد علیہ السلام کو تعلیم فرمایا تھا، یہ ایک سو پچاس سورتوں پر مشتمل ہے جو تمام تر دعا و تحمید و تمجید اور حق تعالیٰ کی ثنا میں ہیں ان میں حلال و حرام اور فرائض و حدود نہیں ہیں [1]۔

ابنِ مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا زبور رمضان کی بارہ تاریخ کو نازل ہوئی ہے [2]

یہ واضح رہے کہ موجودہ زبور کے بھی ایک سو پچاس ہی حصے ہیں جن کو اصطلاحِ اہلِ کتاب میں مزمور کہا جاتا ہے مگر یہ وہ اصلی زبور نہیں ہے جو حضرتِ داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی بلکہ محرفین اہلِ کتاب نے اس کو بہت کچھ بدل ڈالا ہے چنانچہ موجودہ زبور خود اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ یہ سب مزمور حضرتِ داؤد علیہ السلام کے نہیں ہیں کیونکہ ان میں اگر بعض پر حضرتِ داؤد علیہ السلام کا نام مذکور ہے تو بعض پر قورح کا جو نغمہ سراؤں کا استاد تھا اور بعض پر شوشینم کے سروں پر آصف کا اور بعض پر گتیت کا اور بعض پر کسی کا نام نہیں ہے نیز بعض مزموروں میں ایسے واقعات کا تذکرہ ہے جو حضرتِ داؤد علیہ السلام کے صدیوں بعد پیش آئے ہیں، ۱۷/۴۔ زَبُوْرًا ۹/۳، ۱۵/۱۶۔

فصل الجیم الموحدہ

زُجَاجَةٍ : شیشہ، زُجَاجٌ جمع، ۱۸/۱۱۔

زَجْرًا : جھڑکنا، ڈانٹنا، زجر کرنا (نصر) زَجَرَ یَزْجُرُ کا مصدر ہے، ۲۳/۱۔

زَجْرَةٌ : جھڑکی، ڈانٹ، تہدید، ۲۳/۵، ۳۰/۳۔

فصل الحاء المہملۃ

زُحْزِحَ : وہ سرکا دیا گیا، وہ ہٹا دیا گیا، وہ دور

---

[1] معالم التنزیل، ج ۳، ص ۱۹۶ (طبع بمبئی ۱۲۶۹ھ)

[2] تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۲۱۶ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ)

کر دیا گیا، زَحْزَحَۃٌ سے جس کے معنے دور کرنے کے ہیں ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے، ۳؍۳۔

زَحْفًا: میدانِ جنگ، گھمسان، لشکرِ کثیر (فتح ۳)

زحف یزحف کا مصدر ہے، راغب اصفہانی لکھتے ہیں :۔

"اصل میں زحف کے معنی پاؤں گھسیٹ کر گھسٹنے کے ہیں جس طرح کہ بچہ چلنے کے قابل ہونے سے پہلے گھسٹتا ہے اور اونٹ تھک کر اپنے پاؤں گھسیٹنے لگتا ہے اور لشکر جب زیادہ ہو تو اس کا چلنا دشوار ہوتا ہے۔"

اور علامہ زمخشری رقمطراز ہیں :۔

"زحف وہ انبوہِ لشکر ہے کہ جو اپنی کثرت کی بنا پر ایسا معلوم ہونے لگے کہ گویا گھسٹ رہا ہے، یہ زحف الصبی سے ہے جس کا استعمال بچہ کے سرین کے بل ذرا ذرا گھسٹنے کے لئے ہوتا ہے اور مصدر ہی اسم ہو کر مستعمل ہے، زحوف جمع ہے"[1] ۹؍۱۶۔

فصل الخاء المعجمہ

زُخْرُفٌ: ملمع، سنہری، سونا، آراستہ، زینت اور کسی شے کے کمالِ حسن کو "زخرف" کہتے ہیں اور اسی اعتبار سے سونے کو "زخرف" کہا جاتا ہے، لیکن قول کے لئے جب اس کا استعمال ہو تو جھوٹ سے آراستہ کرنا اور ملمع کی باتیں کرنے کے معنے ہونگے، ارشاد ہے زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (ملمع کی باتیں فریب کی)، ۸؍۱۵۔ زُخْرُفًا ۲۵؍۱۲۔

زُخْرُفَهَا: اس کی رونق، اس کی چمک، اس کا سنگار، زُخْرُفٌ مضاف، ھا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، ۱۱؍۸۔

فصل الدال المهملة

زِدْ: تو زیادہ کر، زِیَادَۃٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو اَزِیْدُ اور زِیَادَۃٌ) ۲۹؍۱۲۔

زِدْنٰھُمْ: ہم نے ان کو بڑھایا، ہم نے ان کو زیادہ دیا۔ زِدْنَا، زِیَادَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، ۱۴؍۱۸، ۱۵؍۱۴ و ۱۱۔

زِدْنِیْ: مجھے زیادہ دے، مجھے بڑھتی دے، اس میں زِدْ صیغہ امر واحد مذکر حاضر، ن وقایہ اور ی ضمیر واحد متکلم ہے، ۱۶؍۱۵۔

زِدْہُ: اس کو بڑھتی دے، اس کو زیادہ دے، اس

---

[1] تفسیر کشاف، ج ۲، ص ۲۹۹ (طبع بولاق مصر ۱۲۸۱ھ)

میں ہُ ضمیر واحد مذکر حاضر ہے، ۲۳/۱۴ ۔

فصل الراء المہملۃ

زَرَابِیُّ: مخمل کے بنے ہوئے، زِرْبٌ کی جمع ہے کہ ایک قسم کا آراستہ کپڑا ہے اور ایک موضع کی طرف منسوب ہے، قرآنِ مجید میں اس کا استعمال بطورِ تشبیہ و استعارہ ہوا ہے، مجدالدین فیروزآبادی قاموس میں لکھتے ہیں:۔

"زرابیّ قالیچے اور فرش ہیں یا ہر وہ چیز جو بچھائی جائے اور اس پر تکیہ لگایا جائے، اس کا واحد زِرْبِیٌّ ہے زیر کے ساتھ اور کبھی پیش بھی دے دیتے ہیں"۔ ۳۰/۱۴ ۔

زُرَّاعَ: کاشتکار، کھیتی والے، زَارِعٌ کی جمع ہے جو زَرْعٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے جس کے معنی کسان اور کاشتکار کے ہیں، ۲۶/۱۲ ۔

زُرْتُمُ: تم نے جا دیکھا، تم نے زیارت کی (نصر) زِیَارَةٌ سے جس کے معنی زیارت کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، اصل میں زَوْرٌ سینہ کے بالائی حصہ کو کہتے ہیں، اس اعتبار سے زیارت کے معنی سینے سے کسی کے سامنے ہونے یا کسی کے سینہ کی طرف رُخ کرنے کے ہوتے ہیں، ۳۰/۲ ۔

زَرْعٌ: کھیتی، کھیتی کرنا، اگانا، (فتح) زَرَعَ یَزْرَعُ کا مصدر ہے، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:۔

"زرع کے معنی اگانے کے ہیں اور اس کی حقیقت امورِ الٰہیہ کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتی ہے امورِ بشریہ کے ذریعہ نہیں، ارشاد ہے أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ (بھلا دیکھو تو جو تم بوتے ہو کیا تم اس کو اگاتے ہو یا ہم ہیں اگانے والے) پس بونے کو ان کی طرف منسوب کیا اور اگانے کی ان سے نفی کر کے اس کو اپنی ذات کی طرف نسبت دی اور جب بندے کی طرف اس کو نسبت دی جاتی ہے تو اس بنا پر کہ بندہ ان اسباب کو سرانجام دیتا ہے جو اگانے کا سبب ہیں چنانچہ جب تم کسی چیز کے اُگنے کا باعث بنو تو کہتے ہو، میں نے یہ اگایا۔

زرع اصل میں مصدر ہے اور مزروع یعنی کھیتی اس سے مراد لی گئی ہے جیسے ارشاد ہے فَنُخْرِجُ بِهِۦ زَرْعًا (پھر ہم نکالتے ہیں اس سے کھیتی) اور فرمایا وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ (اور کھیتیاں اور گھر خاصے)"

۴/۲ ۔ ۱۳/۱۸،۷ ۔ ۵۵/۸ ۔ ۲۶/۱۲ ۔

زَرْعًا: ۱۵/۱۶ ۔ ۲۱/۱۶ ۔ ۲۳/۱۶ ۔

زُرْقًا: نیلی چشم، کبود چشم، اَزْرَقُ کی جمع جو زُرْقَۃٌ

سے ہے جس کے معنی نیلگوں ہونے کے ہیں، صفت مشبہ کا صیغہ ہے جس کی آنکھ کی سیاہی نیلاہٹ یا سبزی یا زردی کی طرف مائل ہو اسے ازرق کہا جاتا ہے۔ علامہ زمخشری لکھتے ہیں :-

"زُرْقٌ کے بارے میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ کبود رنگ عرب کے نزدیک آنکھوں کے بارے میں سب سے مبغوض ترین رنگ ہے کیونکہ رومی جو ان کے دشمن ہیں، گربہ چشم ہی ہوتے ہیں اسی لئے انہوں نے دشمن کی صفت یہ بیان کی ہے اسود الکبد اصہب السبال ازرق العین (سیاہ جگر، بھوری مونچھوں والا، کبود چشم) دوسرے یہ کہ اندھے مراد ہیں کیونکہ جس کی آنکھ کی روشنی جاتی رہتی ہے اس کی پتلی نیلی ہو جاتی ہے۔"

پ ۱۶/۱۴ -

زُرُوْعٍ : کھیتیاں، زَرْعٌ کی جمع ہے، پ ۱۹/۱۲، ۲۵/۱۴ .

فصل العین المہملہ

زَعَمَ : اس نے دعویٰ کیا، زَعْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَزْعُمُوْنَ)، پ ۲۵/۱۵ -

زَعَمْتَ : تونے کہا، تونے خبر دی، زَعْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، پ ۱۵/۱۰ -

زَعَمْتُمْ : تم نے بتایا، تم نے سمجھا، تم نے دعوی کیا، زَعْمٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ ۷/۱۷، ۶، پ ۱۵/۱۸، ۱۹، پ ۲۲/۹، ۲۵/۱۱ .

زَعْمِهِمْ : ان کا خیال، ان کا گمان، زَعَمَ، زَعْمٌ، یَزْعُمُ کا مصدر ہے جو مضاف ہے اور ھم ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ ہے، علامہ احمد فیومی المصباح المنیر میں لکھتے ہیں :-

"زعم میں تین لغتیں ہیں، اہلِ حجاز کے نزدیک زا کا زبر ہے، قبیلہ اسد کے نزدیک پیش ہے اور قبیلہ قیس کے بعض افراد کے نزدیک زیر ہے اسی سے ہے زعمت الحنفیۃ (حنفیہ نے کہا) زعم سیبویہ (سیبویہ نے کہا) ارشادِ الٰہی اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ (یا گرا دے آسمان ہم پر جیسا کہ کہا کرتا ہے) بھی اسی معنی میں ہے نیز ظن یعنی گمان کے لئے بھی بولتے ہیں فی زعمی کذا (میرا گمان یہ ہے) اور اعتقاد کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا (جو لوگ کافر ہیں ان کا اعتقاد ہے کہ ہرگز اٹھائے نہ جائیں گے) ازہری نے یہ کہا ہے کہ "زعم" بیشتر اس شے میں ہوتا ہے جس میں شک کیا جاتا ہو اور متحقق نہ ہو اور بعض کا قول

ہے کہ یہ کذب سے کنایہ ہے اور مرزوقی کا بیان ہے کہ اس کا استعمال اکثر اس شے کے لئے ہوتا ہے جو باطل ہو یا جس میں شبہ ہو اور ابن القوطیہ کہتے ہیں زعم زعما کے معنی ہیں ایسی بات کہے جس کے متعلق پتہ نہیں کہ صحیح ہے یا غلط "۔ ۔

زَعِیْمٌ: ذمہ دار، ضامن کہنے والا، قائل، اول معنی کے اعتبار سے زَعَامَۃٌ سے ہے جس کے معنی ضامن اور کفیل ہونے کے ہیں اور دوسرے معنی کے لحاظ سے زَعْمٌ سے بروزن فَعِیْلٌ بمعنی اسم فاعل ہے، راغب لکھتے ہیں :۔

" بذریعہ قول یا بسبب ریاست ضمانت دینے کو زَعَامَۃٌ کہا جاتا ہے چنانچہ متکفل اور رئیس کو زَعِیْمٌ بولتے ہیں کیونکہ ان دونوں کے قول میں مظنہ کذب ہونے کا یقین موجود ہے ارشاد ہے وَاَنَا بِہٖ زَعِیْمٌ (اور میں ہوں اس کا ضامن) اور سَلْہُمْ اَیُّہُمْ بِذٰلِکَ زَعِیْمٌ (کون ان میں اس کا ذمہ لیتا ہے) یہ زَعَامَۃٌ سے بمعنی کفالت ہے، یا زعم بالقول سے بمعنی زبان سے کہنے کے ہے "

کلبی کا بیان ہے کہ زعیم اہل یمن کی زبان میں کفیل کو کہتے ہیں[1] مفسرین نے اس کے معنی ضامن ہی کے بیان کئے ہیں۔ پ۱۲ ع۲۹ ۔

فصل الفاء

زَفِیْرٌ: چلانا، زَفَرَ یَزْفِرُ کا مصدر ہے علامہ خازن بغدادی رقمطراز ہیں :۔

" زفیر کی اصل سانس کی آمد و شد ہے کہ پسلیاں اس سے پھولنے لگیں اور شہیق سینہ کی طرف سانس کا لوٹانا ہے یا زفیر سانس کھینچ کر اس کو سینہ سے نکالنا ہے، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: زفیر زور کی آواز ہے اور شہیق پست آواز، ضحاک و مقاتل کا بیان ہے کہ زفیر گدھے کی پہلی آواز ہے اور شہیق اس کی آخری جبکہ وہ اس کو سینہ کی طرف لوٹاتا ہے اور ابو العالیہ کہتے ہیں کہ زفیر حلق میں ہوتی ہے اور شہیق پیٹ میں[2]"

پ۱۲ ع۹، زَفِیْرًا پ۱۸ ع۱ ۔

فصل القاف

زَقُّوْمٌ: سینہنڈ، تھوہر، جہنم کے ایک درخت

[1] لباب التاویل از علامہ خازن بغدادی، ج ۳، ص ۲۳ (طبع میمنیہ مصر)

[2] ایضاً ج ۲، ص ۳۴۹، ۳۵۰

کا نام ہے جو دوزخیوں کی غذا بنے گا جب اس کو کھائیں گی، گلے میں پھنسے گا، ایک عذاب یہ بھی ہوگا، ابن ابی حاتم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرتِ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ سے اسی طرح ڈرتے رہو جس طرح کہ ڈرنے کا حق ہے کیونکہ اگر زقوم کا ایک قطرہ بھی دنیا کے سمندروں میں ڈال دیا جائے تو زمین پر بسنے والوں کی زندگیاں خراب کر ڈالے پھر جس کی یہ غذا ہے اس کا تو پوچھنا ہی کیا، امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے[1] ۲۳/۶ ۲۵/۱۶ ۲۷/۱۵ ۔

فصل الکاف

زَکَرِیَّا: زکریا علیہ الصلوٰۃ والسلام انبیاءِ بنی اسرائیل میں مشہور عظیم المرتبت نبی گزرے ہیں، حضرتِ یحییٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والد ماجد تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی والدہ ماجدہ حضرتِ مریم علیہا السلام کی کفالت آپ ہی نے فرمائی تھی، مسندِ احمد بن حنبل، صحیح مسلم اور سنن ابنِ ماجہ میں حضرتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، حضرتِ زکریا علیہ السلام نجار یعنی بڑھئی تھے[2]، تعجب ہے کہ حاکم نے مستدرک میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد یہ لکھا ہے:۔

ھٰذا حدیث صحیح علی شرط مسلم ولم یخرجاہ۔ یہ حدیث مسلم کی شرط پر صحیح ہے حالانکہ بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔

اور امام ذہبی نے بھی تلخیص المستدرک میں اس پر کچھ نہیں کہا[3] حالانکہ صحیح مسلم میں یہ روایت بعینہٖ باب فضائل زکریا صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے[4]، اسی طرح حافظ ابن کثیر نے تفسیر سورۂ مریم میں صحیح بخاری کے حوالہ سے اس روایت کو نقل کر ڈالا[5] حالانکہ امام بخاری نے سرے سے اس حدیث کی تخریج ہی نہیں کی ہے چنانچہ علامہ عبدالرؤف مناوی نے صاف تصریح کی ہے ولم یخرجہ البخاری[6] (اور بخاری نے اس کو روایت نہیں کیا ہے) اور حافظ بدرالدین عینی لکھتے ہیں انفرد باخراجہ مسلم[7] (صرف مسلم نے اس کی روایت کی ہے)

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۱۰ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ) [2] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۴۹ (طبع مصر ۱۳۵۱ھ) [3] ملاحظہ ہو المستدرک مع الصحیحین مع تلخیص المستدرک ج ۲ ص ۵۹۱ (طبع دائرۃ المعارف ۱۳۳۴ھ) [4] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۶۸ (طبع اصح المطابع دہلی ۱۳۳۹ھ) [5] ان کے الفاظ یہ ہیں: وفی صحیح البخاری انہ کان نجارا یأکل من عمل یدہ فی النجارۃ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۱۰) [6] فیض القدیر شرح جامع الصغیر للمناوی ج ۴ ص ۵۴۵ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ) [7] عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ج ۷ ص ۳۴۴ (طبع دار الطباعۃ العامرۃ مصر)

واضح رہے کہ زکریا عجمی نام ہے اور قراءتِ مشہورہ میں مد و قصر دونوں آئے ہیں اور ممدود ہو یا مقصور دونوں صورتوں میں غیر منصرف ہے، پ۳ پ۷ پ۱۶ پ۱۷ ۔

زکوٰۃ ستھرائی، پاکیزگی، زکوٰۃ، تزکیہ سے اسم ہے،

علامہ زمخشری تفسیر سورۂ مؤمنون میں لکھتے ہیں :۔

"زکوٰۃ، ذات اور معنی دونوں کے درمیان مشترک اسم ہے، پس ذات تو نصاب کی وہ مقدار ہے جس کو زکوٰۃ دہندہ فقیر کو نکال کر دیتا ہے اور معنی زکوٰۃ دہندہ کا فعل ہے جس کا نام تزکیہ ہے[1]"

اور سورۂ کہف کی تفسیر میں زکوٰۃ کے معنی گناہوں سے پاک و صاف ہونے کے بیان کئے ہیں[2] اور خلیفۂ زمخشری

علامہ ناصر بن عبد السید مطرزی، المغرب فی ترتیب المعرب میں رقمطراز ہیں :۔

"زکوٰۃ کے معنی تزکیہ کے ہیں ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں) پھر زکوٰۃ مال کی اس مقدار کا نام پڑ گیا کہ جو فقیروں کے لئے نکالی جاتی ہے اور تزکیہ (الفاظ) طہارت کو بتا رہی ہے اور بعض کا قول ہے کہ زیادتی اور نمو پر دلالت کرتی ہے اور یہی ظاہر ہے"[3]

اور امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں :۔

"اصل میں زکوٰۃ وہ افزونی ہے جو اللہ تعالیٰ کی برکت سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا امورِ دنیویہ و اخرویہ کے ذریعہ اعتبار کیا جاتا ہے چنانچہ جب کھیتی میں افزونی و برکت حاصل ہو تو کہا جاتا ہے زکا الزرع یزکو ارشادِ الٰہی اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا (کونسا ستھرا کھانا ہے) میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو حلال ہو اور انجام کار بدہضمی نہ پیدا کرے اور اسی سے زکوٰۃ اس شے کو کہتے ہیں جسے انسان اللہ تعالیٰ کے حق میں سے فقیروں کو نکالتا ہے اور یہ نام اس لئے ہوا کہ اس میں برکت کی امید ہوتی ہے یا اس لئے کہ نفس کا تزکیہ ہوتا ہے یعنی خیرات و برکات کے ذریعہ اس کا نمو عمل میں آتا ہے یا دونوں سبب سے کیونکہ دونوں خوبیاں اس میں موجود ہیں حق تعالیٰ شانہ نے قرآن مجید میں زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ ساتھ رکھا ہے، ارشاد ہے وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو)

نفس کی پاکیزگی اور طہارت کی بدولت انسان

---

[1] کشاف، ج ۲، ص ۶۱ (طبع مصر ۱۳۰۸ھ) [2] ایضاً ج ۱، ص ۴۷۹ [3] ملاحظہ المغرب (طبع دائرۃ المعارف النظامیہ دکن)

اس حیثیت میں ہوتا ہے کہ دنیا میں اوصافِ حمیدہ کا مستحق ہوتا ہے اور آخرت میں اجر و ثواب کا اور اس کی صورت یہ ہے کہ انسان اس چیز کی کوشش میں لگ جائے جس میں اس کی پاکیزگی ہے، تزکیہ کی نسبت کبھی تو بندہ کی طرف ہوتی ہے کیونکہ وہ اس کا اکتساب کرتا ہے جیسے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰہَا (مراد کو پہنچا جس نے اس کو درست کیا) اور کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف اس کو نسبت دی جاتی ہے کیونکہ حقیقت میں وہی اس کا فاعل ہے جیسے بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ (بلکہ اللہ پاکیزہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے) اور کبھی نبی کی طرف، کیونکہ وہی لوگوں کی طرف تزکیہ کے پہنچنے میں واسطہ ہوتا ہے جیسے تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا (ان کو اس کے ذریعہ پاک کرے اور تربیت دے) اور یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ (پڑھتا ہے تمہارے پاس ہماری آیتیں اور تم کو سنوارتا ہے) اور کبھی عبادت کی طرف کہ جو اس کا ذریعہ ہے جیسے وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَکٰوۃً (اور شوق دیا اپنے پاس سے اور ستھرائی)"

(ملاحظہ ہو تُزَکُّوْنَ) ۵ ز ا ر ۱۲ — $\frac{۶}{۱۲،۷،۲}$ $\frac{۵}{۸}$ $\frac{۳}{۶}$ $\frac{۲}{۶}$ $\frac{۱}{۱۲}$

$\frac{۹}{۹}$ $\frac{۱۰}{۱۵،۱۴،۷}$ $\frac{۱۶}{۷،۵،۴،۱}$ $\frac{۱۷}{۱۷،۱۳،۵}$ $\frac{۱۹}{۱۳،۱۱،۱}$ $\frac{۹}{۱۶}$ $\frac{۱۰}{۱۰،۷}$ $\frac{۲۳}{۱}$ $\frac{۲۶}{۱۵}$ $\frac{۳}{۲}$ $\frac{۹}{۱۲}$ $\frac{۳۰}{۲۳}$ -

زَکٰی: وہ سنورا، وہ پاک ہوا، وہ درست ہوا، (نَصَرَ) زکٰوۃ سے، جس کے معنے درست ہونے، سنورنے اور زیادہ ہونے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، $\frac{۳}{۹}$ -

زَکِیًّا: ستھرا، زکٰوۃ سے بروزنِ فَعِیْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ واحد مذکر ہے یعنی گناہوں سے پاک کے یا خیر و برکت پر پرورش پانیوالے کے، اَزْکِیَاءُ جمع، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:-

"زَکِیًّا یعنی مزکّٰی بالخلقۃ کہ جس کی خلقت ہی کو سنوار دیا گیا ہو اور یہ جیسا کہ ہم نے بتایا، اجتباء کے طریق پر ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے کسی بندے کو عالم اور پاکیزہ اخلاق بنادیں، سیکھنے اور کوشش کرنے سے نہیں بلکہ محض توفیقِ الٰہی سے جس طرح کہ عام طور پر نبیوں اور رسولوں کے ساتھ ہوتا ہے، نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مزکّٰی سے موسوم کرنا استقبال میں ہونے کے اعتبار سے ہو نہ کہ فی الحال اور معنی یہ ہوں کہ جو مزکّٰی ہونے والا ہے" $\frac{۱۶}{۵}$

زَکِیَّۃً: ستھرا، گناہوں سے پاک صاف زکٰوۃ سے بروزن فَعِیْلَۃٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ

واحد مؤنث ہے، ۱۵/۲۲۔

زَكّٰهَا: اس کو سنوارا، تَزْكِيَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے (ملاحظہ ہو تَسْكُنَ) ۳۰/۱۶۔

فصل اللام

زِلْتُمْ: تم الگ رہے، تم علیحدہ رہے، زَيْلٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، مَا زِلْتُمْ (تم برابر رہے، تم مسلسل رہے) افعالِ ناقصہ میں سے ہے، اس کا استعمال کسی شے کے مسلسل اور دائمی حالت میں رہنے کے لئے ہوتا ہے (ملاحظہ ہو تَزَالُ) ۲۴/۹۔

زِلْزَالًا: جھڑجھڑانا، لرزا دینا، ہلاڈالنا، زَلْزَلَ يُزَلْزِلُ کا مصدر ہے جس کے معنی ہلانے اور جھڑجھڑا دینے کے ہیں، راغب نے لکھا ہے کہ اس میں تکرارِ حروف تکرارِ معنی کیلئے ہے یعنی بار بار جھڑجھڑانا اور ہلا ڈالنا، ۱۱/۸۔

زِلْزَالَهَا: اس کا بھونچال، اس کا زلزلہ، اس کا ہلادینا، زِلْزَالًا مصدر مضاف ھا ضمیر واحد مؤنث غائب، مضاف الیہ، ۲/۱۴۔

زُلْزِلَتْ: وہ ہلائی گئی، اس کو لرزایا گیا، اس کو زلزلہ میں ڈالا گیا، زَلْزَلَةٌ اور زِلْزَالٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب ہے، ۱/۱۴۔

زُلْزِلُوا: وہ جھڑجھڑائے گئے، وہ زلزلے میں آگئے، ہلاڈالے گئے، زَلْزَلَةٌ اور زِلْزَالٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۲۱۴/۲۔

زَلْزَلَةَ: بھونچال، زلزلہ، ہلا ڈالنا، زِلْزَالٌ کی طرح یہ بھی زَلْزَلَ يُزَلْزِلُ کا مصدر ہے، ۱/۱۷۔

زُلَفًا: رات کی گھڑیاں، ساعاتِ شب، ابو عبیدہ کہتے ہیں، زُلَفُ اللَّيْلِ کے معنی رات کی ساعتوں کے ہیں، اس کا واحد زُلْفَةٌ ہے جس کے معنی ساعت منزلت اور قربت کے ہیں[1] ۱۱۴/۱۲۔

زُلْفَةً: نزدیک، پاس، قریب، درجہ، منزلت، امام بغوی لکھتے ہیں، یہ اسم ہے بوصف مصدر اس میں مذکر، مؤنث، واحد، تثنیہ، جمع سب برابر ہیں[2]

امام راغب فرماتے ہیں:-

"زلفۃ کے معنی مرتبہ اور قدم کے ہیں، ارشادِ الٰہی فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً (جب دیکھیں گے وہ پاس لگا) کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں جب وہ مومنوں کے مرتبہ کو دیکھیں گے جس سے وہ محروم ہو گئے اور بعض کا قول ہے کہ زلفۃ کا استعمال عذاب کی جگہ میں اسی طرح ہے جیسے کہ بشارت

[1] عمدۃ القاری، ج ۸، ص ۶۷۳

[2] معالم التنزیل، ج ۴، ص ۱۶۹ (طبع بمبئی)

وغیرہ الفاظ کا استعمال ہوتا ہے" ۲۹/۲ -

زُلْفیٰ : درجہ، مرتبہ، مصدر ہے مثل قُربیٰ کے جو زُلفۃ کے معنی ہیں وہی اس کے ہیں ۲۲/۱۱، ۲۳/۱۲، ۱۵/۲۱ -

زَلَقًا : تیز، ایسا صاف کہ جس پر پیر پھسلنے لگے، زلق یزلق کا مصدر ہے، ۱۵/۱۸ -

زَلَلْتُمْ : تم ڈگمگائے، تم نے لغزش کی، تم نے ٹھوکر کھائی، زلّ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو تَزِلّ) ۲/۲ -

فصل المیم

زُمَرًا : جتھے جتھے، گروہ در گروہ، جوق جوق زمرۃ کی جمع، جس کے معنی تھوڑی جماعت کے ہیں، ۵/۲۴ -

زَمْهَرِیْرًا : ٹھر، سخت ٹھنڈ، چاند، آیت شریفہ لا یرون فیہا شمسا ولا زمہریرا (نہیں دیکھتے وہاں دھوپ نہ ٹھر) کی تفسیر میں علامہ زمخشری رقمطراز ہیں :-

"یعنی جنت کی ہوا معتدل ہے نہ وہاں آفتاب کی دھوپ تمازت پہنچاتی ہے نہ سردی کی ٹھر ستاتی ہے، حدیث میں ہے ھواء الجنۃ سجسج لا حر ولا قر (جنت کی ہوا خوشگوار ہے نہ گرم ہے نہ سرد) اور زمہریر کا ترجمہ ماہتاب بھی کیا گیا ہے ثعلب کا بیان ہے کہ یہ قبیلۂ طے کی لغت میں ہے چنانچہ یہ شعر پیش کیا ہے ؎

ولیلۃ ظلامہا قد اعتکر
قطعتہا والزمہریر ما زہر

(ایسی رات کہ جس کی اندھیاری چھائی ہوئی تھی اسکو میں نے قطع کیا اور چاند روشن نہ تھا) اور معنی یہ ہوں گے کہ جنت تاباں و درخشاں ہے وہاں آفتاب کی حاجت ہے نہ ماہتاب کی" [1]

۲۹/۱۹ -

فصل النون

زَنْجَبِیْلًا : سونٹھ، امام سیوطی الاتقان میں جوالیقی اور ثعالبی سے ناقل ہیں کہ یہ فارسی لفظ ہے [2] اور مولوی غیاث الدین رام پوری غیاث اللغات میں لکھتے ہیں :-

"زنجبیل بالفتح چشمہ است در بہشت و نام وادی معروف و بایں معنی معرب زنگوبر است از رشیدی و رسالہ معربات"

[1] تفسیر کشاف ج ۲، ص ۵۴۴ (طبع بولاق مصر ۱۲۸۱ھ) [2] الاتقان، ص ۱۹۴ (طبع حمدی دہلی ۱۲۸۶ھ)

علامہ ابن دُرید لغوی جمہرۃ اللغۃ میں رقمطراز ہیں :-

"زنجبیل معرب ہے اور ایک قوم کا بیان ہے کہ زنجبیل کے معنی خمر یعنی شراب کے ہیں" [1]

امام بغوی فرماتے ہیں :-

"سونٹھ ان چیزوں میں سے ہے جن کو عرب گرم ہونے کے اعتبار سے پسند کرتے ہیں اس لئے حق تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا کہ جنت میں ان کو وہ پیالے پلائے جائیں گے جن میں جنت کی سونٹھ کی ملونی ہوگی۔ مقاتل کہتے ہیں یہ دنیا کی سونٹھ جیسی نہ ہوگی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جنت کی جس چیز کا بھی ذکر کیا اور نام لیا ہے دنیا میں اس کی مثل نہیں ہے اور کہا گیا ہے کہ زنجبیل جنت کا ایک چشمہ ہے جس میں سونٹھ کا مزہ پایا جائے گا، قتادہ کہتے ہیں مقربین تو خالص پئیں گے اور تمام اہلِ جنت کے لئے اس کی ملونی ہوگی" [2] ۲۹/۱۹ -

زِنُوْا : تم زنو (ضرب) دَزن سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو دَزن) ۱۵/۴ ، ۱۹/۱۴

زَنَانِی : زنا، بدکاری، زَنٰی یَزْنِی کا مصدر ہے بغیر عقدِ شرعی کے عورت سے وطی کرنے کا نام زنا ہے ۱۵/۴ -

زَنِیْم : بدنام، جو کسی بری علامت سے مشہور ہو وہ شخص جو کسی قوم میں اپنے کو ملائے لیکن ان کے ساتھ ہو نہ ان میں سے ہو، ابن درید نے جو لغت و عربیت کے امام ہیں جمہرۃ اللغۃ میں یہی دونوں معانی نقل کئے ہیں [3] شاہ عبدالقادر صاحب نے موضح القرآن میں پہلے معنی اختیار فرمائے ہیں چنانچہ "زنیم" کا ترجمہ لکھتے ہیں "بدنام یعنی بدی کر مشہور" اور شیخ نورالحق صاحب محدث دہلوی نے دوسرے، چنانچہ تیسیر القاری شرح فارسی صحیح بخاری میں رقمطراز ہیں :-

"زنیم، بمعنی آنکہ نسبت کردہ شدہ است بقومے کہ از انہا نباشد یا ماخوذ است از زنمتی الشاۃ کہ گوشِ بر جرم گلوئے آں را پارہ می برند و آویزاں باں می گزارند" [4]

حافظ ابن کثیر نے سلف صحابہ و تابعین کے متعدد اقوال اس کی تفسیر میں نقل کرنے کے بعد ان

---

[1] جمہرہ، ج ۳، ص ۴۰۰ (طبع دائرۃ المعارف ۱۳۴۵ھ)
[2] معالم التنزیل، ج ۴، ص ۱۹۶ (طبع بمبئی)
[3] ملاحظہ ہو جمہرہ، ج ۳، ص ۱۹
[4] تیسیر القاری، ج ۴، ص ۶۲۵ (طبع علوی لکھنؤ ۱۳۰۵ھ)

سب کا خلاصہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

والاقوال فی ھذا اور اس میں اقوال بہت ہیں
کثیرۃ وترجع الی ما اور یہ سب اسی طرف لوٹتے ہیں
قلناہ وھو ان الزنیم جو ہم نے بیان کیا کہ زنیم
ھو المشھور بالشر وہ شخص ہے جو برائی میں اتنا
الذی یعرف بہ مشہور ہو کہ اسی کے ذریعہ
بین الناس و لوگوں میں اسے پہچانا جائے
غالبا یکون دعیا اور اکثر ایسا شخص نسب میں
ولد زنا فان فی متہم اور حرام زادہ ہوتا ہے
الغالب یتسلط کیونکہ بیشتر شیطان جتنا
الشیطان علیہ مالا اس پر مسلط ہوتا ہے دوسرے
یتسلط علی غیرہ پر نہیں ہوتا جیسا کہ حدیث
کما جاء فی الحدیث میں آیا ہے کہ ولد الزنا جنت
لا یدخل الجنۃ ولد میں نہیں جائیگا اور دوسری
زنا و فی الحدیث حدیث میں ہے کہ ولد الزنا
الاخر ولد الزنا شر تینوں میں برا ہے جبکہ
الثلاثۃ اذا عمل اپنے ماں باپ کے عمل سے
بعمل ابویہ له کرے۔

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں:۔

"زنیم کے بارے میں متعدد اقوال ہیں:

(۱) فراء کا بیان ہے کہ زنیم وہ ہے جس کے نسب میں تہمت ہو قوم میں ملحق ہوا اور ان میں سے نہ ہو، حضرت حسان کہتے ہیں:۔

وانت زنیم نیط فی آل ھاشم
کما نیط خلف الراکب القدح الفرد

(اور تو حرام زادہ ہے آلِ ہاشم کے ساتھ میں لٹکایا ہوا جس طرح کہ سوار کے پیچھے اکیلا تیر لٹکایا گیا ہو) اور ہر چیز میں جو زیادتی (یعنی فالتو) ہو وہ زنمۃ ہے اور زنمت الشاۃ بھی اس وقت بولتے ہیں جبکہ بکری کے کان چیرے جائیں اور وہ لٹک کر خشک ہو جائیں اور ایک معلق شے کی طرح باقی رہ جائیں، حاصل یہ کہ زنیم وہ ولد الزنا ہے جو نسب میں قوم کے ساتھ ملحق ہوا اور ان میں سے ہو نہیں، ولید قریش میں نسب کے اندر متہم تھا اور ان کی اصل میں سے نہ تھا، اس کے باپ نے اس کی پیدائش کے اٹھارہ سال کے بعد اس کے متعلق دعویٰ کیا تھا، اور بعض کا قول ہے کہ اس کی ماں نے زنا کیا تھا مگر مشہور نہ تھا یہاں تک کہ آیت نازل ہوئی۔

(۲) شعبی کا قول ہے کہ زنیم وہ ہے جو برائی کا در

له تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۴۰۵ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ)

ملامت میں اس طرح مشہور ہو جیسے کہ بکری اپنے زنمہ یعنی کان کے لٹکے ہوئے زائد گوشت سے پہچانی جاتی ہے۔

(۲) عکرمہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ زنیم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کے گلے میں بھی زائد گوشت تھا جس سے وہ مشہور تھا اور مقاتل نے کہا ہے کہ اس کے کان کی جڑ میں اسی طرح تھا جیسا کہ بکری کے کان کا کٹا ہوا گوشت لٹکا ہوتا ہے [1] ۲۹/۱۳۔

فصل الواو

زَوَالٌ: زائل ہونا، زَالَ یَزُوْلُ کا مصدر ہے، زوال کا استعمال اس شے کے متعلق ہوتا ہے جو پہلے سے قائم ہو، ۱۴/۱۳۔

زَوْجٌ: خاوند، بیوی، جوڑا، بھانت بھانت، قسم قسم، علامہ احمد بن علی الفیومی، المصباح المنیر میں رقمطراز ہیں:-

"زوج وہ شکل ہے جس کی کوئی نظیر ہو جیسے کہ اصناف والوان یعنی مختلف قسمیں اور رنگ ہیں اور یا اس کی کوئی نقیض ہو جیسے خشک و تر، نر و مادہ، شب و روز، شیریں و تلخ۔ ابن درید کہتے ہیں زوج ہر دو کو کہتے ہیں، فرد کی ضد ہے، جوہری کا بھی ان کے اتباع میں یہی بیان ہے کہ ان دو کو جو جفت ہوں زوجان کہا جاتا ہے اور زوج بھی چنانچہ عندی زوج نعال کہو گے تو دو جوتے مراد لو گے اور زوجان ہوگا تو چار مراد ہوں گے اور ابن قتیبہ کا قول ہے کہ زوج ایک بھی ہوتا ہے اور دو بھی ارشادِ الٰہی مِنْ كُلِّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ میں زوج یہاں واحد ہی ہے، ابوعبیدہ اور ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے۔

اور ازہری کہتے ہیں کہ نحویوں نے دو کے "زوج" ہونے سے انکار کیا ہے، زوج ان کے نزدیک فرد ہے اور یہی درست ہے۔ ابن الانباری کا بیان ہے کہ عوام خطا کرتے ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ زوج دو ہیں حالانکہ یہ عرب کا مذہب نہیں ہے کیونکہ وہ مثلاً زوج حمام (کبوتر کا جوڑا) کہتے وقت زوج کو واحد نہیں بولیں گے بلکہ کہیں گے زوجان من حمام (کبوتر کا ایک جوڑا) زوجان من خفاف (موزوں کا ایک جوڑا) اور پرندے میں کسی ایک کو زوج نہیں بولتے بلکہ نر کو فرد۔

[1] تفسیر کبیر، ج ۸، ص ۱۹۸ (طبع خیریہ مصر ۱۳۰۸ھ)

اور مادہ کو فردہ کہتے ہیں اور سجستانی کا قول ہے
کہ دو کو زوج نہیں کہا جاتا، نہ پرند میں سے نہ پرند
کے علاوہ، کیونکہ یہ جاہلوں کا کلام ہے لیکن ہر دو
زوجان ہیں اور بعض نے اس کے لئے خَلَقَ
الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ (اس نے بنایا جوڑا
نر اور مادہ) سے استدلال کیا ہے (کیونکہ اگر زوج
دو کے لئے آتا تو زوجین نہ لایا جاتا) ہاں واحد
کو زوج کے ساتھ موسوم کرنا اس شرط کے
ساتھ مشروط ہے کہ اس کے ساتھ دوسرا
اس کی جنس کا ہو"

أَزْوَاجٌ جمع، ۲۷/۱۴ ۱۷/۸ ۱۹/۵ ۲۱/۱۰ ۲۶/۱۵۔

زَوْجًا ۲۷/۱۴ (ملاحظہ ہو أَزْوَاجٌ)

زَوْجَيْنِ: قسم قسم، وہ دو شکلیں جن میں سے
ہر ایک دوسرے کا نظیر ہو یا نقیض ہو، زوج کا تثنیہ
بحالتِ رفع، ۲۷/۱۳۔

زُوِّجَتْ: اس کا جوڑ ملا دیا گیا، تَزْوِیْجٌ سے
جس کے معنی ایک کے دوسری شے کے جفت و قرین
کرنا اور اسی اعتبار سے مرد و عورت میں عقد کرنے
کے معنے آتے ہیں، ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث
غائب، آیت شریفہ وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ (اور
جب جیوں کے جوڑ بندھیں) کی تفسیر میں امام راغب
نے تین قول نقل کئے ہیں (۱) ہر گروہ کو اس کے گروہ
کے ساتھ جنت یا دوزخ میں ملا دیا جائیگا (۲) ارواح
کو اجساد کے ساتھ ملا دیا جائیگا۔ (۳) نفوس کو اپنے
اعمال کے ساتھ ملا دیا جائے۔ ۳۰/۶۔

زَوْجُكَ: تیری بیوی، تیری جورو، تیری عورت
زوج مضاف ک ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ،
۲/۴ ۹/۶ ۱۶/۱۶ ۲۲/۲۔

زَوَّجْنٰكَهَا: ہم نے وہ تیرے نکاح میں دی
زَوَّجْنَا تَزْوِیْجٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ک ضمیر واحد
مذکر حاضر، ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب، ۲۲/۲۔

زَوَّجْنٰهُمْ: ہم نے ان کو بیاہ دیا، اس میں ھم
ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۲۵/۹ ۲۷/۹۔

زَوْجُهٗ: اس کی عورت، اس کی بیوی، زوج
مضاف ہٗ ضمیر مضاف الیہ ۱/۱۲ ۱۷/۹۔

زَوْجَهَا: اس کا جوڑا، اس کا خاوند، زوج
مضاف ھا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ،
۴/۱۲ ۹/۱۴ ۲۳/۱۵ ۲۸/۱۔

زَوْجَيْنِ: وہ دو شکلیں جن میں سے ہر ایک دوسرے
کا نظیر ہو یا نقیض، جوڑا، زوج کا تثنیہ بحالتِ نصب و
جر، آیۂ شریفہ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (اور
ہر چیز کے بنائے ہم نے جوڑے) میں بعض نے زوجین کے

معنی نر اور مادہ کے لئے ہیں اور بعض نے مرکب اور صحیح و راجح صنفوں اور قسموں کے ہیں یعنی ہر شے کی ہم نے دو قسمیں کی ہیں اور قسم سے مراد مقابل ہے یعنی ہر شے میں کوئی نہ کوئی صفت ذاتی یا عرضی ایسی ہے جس سے دوسری شے جس میں اس صفت کی ضد و نقیض ملحوظ ہے اس کے مقابل شمار کی جاتی ہے جیسے آسمان و زمین، جوہر و عرض، گرمی و سردی، چھوٹی بڑی، خوشنما و بدنما، سفید و سیاہی، روشنی و تاریکی وغیرہ وغیرہ، پ ۱۲ ع ۱۳، پ ۱۸ ع ۲، پ ۲۷ ع ۱۸، پ ۱۹ ع ۱۸ -

زُوْرٌ : جھوٹ، علامہ زمخشری لکھتے ہیں :-

"زور، زَوْرٌ اور اِزْوِرَارٌ سے ہے جس کے معنی انحراف کے ہیں۔" [۱]

چونکہ حق، جھوٹ حق سے منحرف ہوتا ہے اس لئے اس کو زور کہا جاتا ہے، پ ۱۷ ع ۱۱، پ ۱۹ ع ۱۴ -

زُوْرًا پ ۱۸ ع ۱۶، پ ۲۹ ع ۱ -

فصل الھاء

زَهْرَةَ : رونق، خوبی، تازگی، سرسبزی، زینت و بہار اصل میں کلی جب کھل جاتی ہے تو زَهْرَةٌ کہلاتی ہے اور دنیا کی بہار اور زیب و زینت کیلئے بھی اسی مناسبت سے زھرۃ بولا جاتا ہے، پ ۱۶ ع ۱۴ -

زَهَقَ : وہ نکل بھاگا، وہ مٹ گیا، زُھُوْقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَزْھَقُ)، پ ۱۵ ع ۹ -

زُهُوْقًا : نکل بھاگنے والا، مٹ جانے والا۔ زُھُوْقٌ سے بروزن فَعُوْلٌ بمعنی اسم فاعل صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے، پ ۱۵ ع ۹ -

فصل الیاء المثناۃ

زِيَادَةٌ : زیادتی، بڑھتی، زیادہ ہونا، زیادہ کرنا، زَادَ يَزِيْدُ کا مصدر ہے امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں :-

"زیادت کبھی تو مذموم ہوتی ہے جیسے زیادت علی الکفایہ یعنی کافی سے زائد ہونا مثلاً انگلیوں کا زائد ہونا اور کبھی محمود جیسے ارشادِ ربانی ہے لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ (جنہوں نے کی بھلائی ان کو ہے بھلائی اور بڑھتی) مختلف طرق سے مروی ہے کہ یہ زیادت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رخِ انور کی طرف نظر کرنا ہے، یا انعامات اور حالات کی جانب اشارہ ہے جن کا دنیا میں تصور کرنا ناممکن ہے اور زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ

[۱] تفسیر کشاف، ج ۲، ص ۵۴ (طبع بولاق مصر ۱۲۸۱ھ)

الجسم (اور زیادہ کشائش دی عقل میں اور بدن میں) یعنی ان کے اہلِ زمانہ کو جو کچھ عطا کیا تھا اس سے زائد مقدار میں ان کو علم اور جسم میں سے عطا فرمایا۔ "اور زیادت مکروہہ" کے سلسلہ میں ارشاد ہے مَا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (اور زیادہ ہوا ان کا بدکنا) اور زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ (ان کو ہم نے بڑھائی مار پر مار) اور فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ (سو تم کچھ نہیں بڑھاتے میرا سوائے نقصان) اور یہ جو فرمایا فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (پھر زیادہ دیا اللہ نے ان کو آزار) تو یہ وہ زیادتی ہے جس پر انسان کی سرشت بنائی گئی ہے کہ جو شخص کسی فعل کو انجام دیتا ہے خواہ خیر ہو یا شر، تو اس کی انجام دہی سے قوت محسوس کر کے دم بڑھتا رہتا ہے۔"

پ ۱۱ ع ۸ ۔

زَيْتُوْنَ: زیتون ایک مشہور درخت کا نام ہے، پ ۸ ع ۱۸، پ ۳۰ ع ۲۰، زَيْتُوْنًا پ ۳۰ ع ۵ (ملاحظہ ہو تِيْن)۔

زَيْتُوْنَةٍ: درختِ زیتون، اس میں تا وحدت کی ہے جیسے شَجَرٌ اور شَجَرَةٌ پ ۱۸ ع ۱۱۔

زَيْتُهَا: اس کا تیل، زَيْتُ مضاف ھا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، روغنِ زیتون یعنی زیتون کے تیل کو زَیت کہتے ہیں، پ ۱۸ ع ۱۱۔

زَيْدٌ: رضی اللہ عنہ، ایک مشہور صحابی کا اسمِ گرامی ہے، حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے الاصابہ میں ان کا مفصل تذکرہ قلم بند کیا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے:۔

" زید بن حارثہ بن شراحیل الکلبی ابنِ سعد کا بیان ہے کہ ان کی ماں سعدیٰ تھیں ثعلبہ بن عبد عامر کی بیٹی جو بنی معن بن طے میں سے ہے حضرتِ عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ ہم زید بن حارثہ کو زید بن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی کہا کرتے تھے، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ (پکارو لے پالکوں کو ان کے باپ کا کر کر) اس کو بخاری نے روایت کیا ہے ہشام بن محمد بن السائب الکلبی اپنے باپ نیز حمید بن منہ الطائی وغیرہ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ زید بن حارثہ کی والدہ سعدیٰ اپنی قوم میں ملنے آئیں، زید ان کے ساتھ تھے، زمانہ جاہلیت کی بات ہے، بنی القین بن الجسر کے سواروں نے بنی معن کے گھروں پر غارتگری کی اور زید کو اٹھا کر لے گئے، یہ اس وقت نوخیز بچے تھے، پھر انہیں بازارِ عکاظ میں لے کر آئے اور فروخت ہونے کے لئے پیش کیا چنانچہ حکیم بن حزام (رضی اللہ عنہ) نے اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لئے چار سو درہم میں انہیں خرید لیا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو انہوں نے انہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بخش دیا۔

ادھر جب یہ گم ہوئے تو ان کے باپ حارثہ بن شراحیل نے (ان کے فراق میں دردناک اشعار کہے جن میں کہا :

بکیت علی زید ولم ادر ما فعل
احی فیرجی ام اتی دونہ الاجل

(میں زید پر رویا حالانکہ مجھے معلوم نہیں اس نے کیا کیا آیا وہ زندہ ہے کہ اس کی آس لگائی جائے یا اس کو موت آگئی ہے)

ان ہی اشعار کے سلسلہ میں یہ بھی ہے ؎

اوصی بہ عمرا وقیس کلاھما
واوصی یزید اثم بعدھم جبل

(میں اس کے متعلق عمرو اور قیس دونوں کو وصیت کرتا ہوں نیز یزید کو اور ان سب کے بعد جبل کو کہتا ہوں)

عمرو اور قیس سے اس کے دونوں بھائی مراد ہیں اور یزید زید کا ماں شریکی بھائی ہے یہ یزید بن کعب بن شراحیل ہے اور جبل سے ان کا بڑا بیٹا مراد ہے، راوی کہتا ہے کہ پھر بنی کلب کے کچھ لوگ حج کرنے آئے تو انہوں نے زید کو دیکھا

زید انہیں پہچان گئے اور انہوں نے زید کو پہچان لیا تب زید نے کہا کہ میرے گھر والوں کو یہ اشعار پہنچا دینا ؎

احن الی قومی وان کنت نائیا
بانی قطین البیت عند المشاعر

(میں اپنی قوم کا مشتاق ہوں اگرچہ دور پڑا ہوا ہوں کیونکہ میں شعائر اللہ کے پاس بیت اللہ میں مقیم ہوں) پھر جب یہ لوگ واپس ہوئے تو انہوں نے ان کے باپ کو اطلاع دی اور ان کے جائے قیام کو بتلا دیا چنانچہ حارثہ اور ان کا بھائی کعب دونوں زر فدیہ لیکر چل پڑے اور مکہ آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دریافت کیا، کسی نے کہہ دیا آپ مسجد الحرام میں تشریف فرما ہیں، بس دونوں آپ کے پاس حاضر ہوئے اور یوں گفتگو شروع کی، اے ابن عبد المطلب! اے سردار قوم کے صاحبزادے! تم لوگ حرم الٰہی کے رہنے والے ہو مصیبت زدہ کو چھڑاتے ہو، قیدی کو کھانا کھلاتے ہو، ہم تمہارے پاس اپنے لڑکے کے معاملہ میں حاضر ہوئے ہیں جو تمہارا غلام ہے لہٰذا آپ ہم پر احسان فرمائیں اور اس کے زر فدیہ کے بارے میں جو ہم ابھی آپ کے سامنے پیش کیے دیتے ہیں اچھا معاملہ

فرمائیں، آپ نے فرمایا وہ کون ہے؟ کہنے لگے زید بن حارثہ!
اس پر آپ نے ارشاد فرمایا اس کے علاوہ کوئی اور (بھلا)
اس کو بلا لو اور اختیار دے دو، اگر وہ تمہیں اختیار کرے
تو بغیر فدیہ کے وہ تمہارا ہے اور اگر اس نے مجھے اختیار
کیا تو اللہ کی قسم جو مجھے اختیار کرے میں اس پر کسی کو
پسند کرنے والا نہیں، انہوں نے عرض کیا کہ آپ نے ہمارے ساتھ
مزید انصاف فرمایا، پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زید کو
بلا کر فرمایا تم ان لوگوں کو جانتے ہو؟ انہوں نے
عرض کیا جی ہاں یہ میرے والد ہیں اور وہ میرے
چچا، تب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا
اور میں جو ہوں تم جانتے ہی ہو اور میری صحبت
کو تم دیکھ ہی چکے ہو اب یا تو مجھے اختیار کر لو یا
ان دونوں کو، زید نے عرض کیا میں آپ پر
کسی کو اختیار کرنے والا نہیں، میرے لئے تو آپ
ہی بجائے باپ اور چچا کے ہیں، اس پر وہ دونوں
بول اٹھے زید تجھ پر افسوس، تو آزادی کے مقابلہ
میں غلامی کو اور باپ، چچا اور خاندان کے مقابلہ
میں انہیں اختیار کرتا ہے، زید نے کہا ہاں میں نے
اس ذات میں وہ بات پائی ہے جس کی بنا پر میں
اس پر کسی کو پسند نہیں کر سکتا۔ اور حضور علیہ
الصلوٰۃ والسلام نے جب یہ دیکھا تو ان کو حطیم

میں لیکر آئے اور ارشاد فرمایا گواہ رہنا کہ زید میرا بیٹا
ہے، یہ میرا وارث ہوا اور میں اس کا وارث (یہ
نبوت سے قبل کا واقعہ ہے) ان کے باپ اور چچا
نے جب یہ کیفیت دیکھی تو ان کے جی راضی ہوگئے
اور واپس لوٹ گئے، جب سے زید بن محمد ہی
کہا جاتا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو
بھیجدیا اور ابن اسحٰق نے بھی زید کے والد
حارثہ کا ان کی طلب میں آنے کا قصہ اسی کے
قریب قریب بیان کیا ہے۔

اور ابن الکلبی اپنے باپ سے، وہ ابو صالح سے
وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی
ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت
زید کو متبنّٰی کیا تو زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا
سے ان کا نکاح کر دیا جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام
کی پھوپھی حضرت امیمہ بنت عبد المطلب کی
صاحبزادی تھیں اور اس سے قبل حضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے اپنی باندی ام ایمن رضی اللہ عنہا
سے ان کا عقد کر دیا تھا چنانچہ حضرت زید سے
ام ایمن رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت
اسامہ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے پھر جب انہوں
نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دیدی

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر دیا، ام کلثوم کی والدہ اروی بنت کریز ہیں اور اروی کی ماں بیضا ہیں جو عبدالمطلب کی صاحبزادی ہیں چنانچہ اروی کے بطن سے زید بن زید اور رقیہ پیدا ہوئے پھر انہوں نے ام کلثوم کو طلاق دیکر درہ بنت ابی لہب بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا، پھر ان کو بھی طلاق دیدی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی بہن ہند بنت العوام سے عقد کیا۔

عبدالرزاق معمر سے وہ زہری سے روایت کرتے ہیں کہ ہمیں نہیں معلوم کوئی زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے پہلے اسلام لایا ہو، عبدالرزاق کا بیان ہے کہ زہری کے علاوہ اور کسی نے یہ ذکر نہیں کیا، حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ واقدی نے اپنی اسناد کے ساتھ سلیمان بن یسار سے اس کو جزم کے ساتھ بیان کیا ہے نیز زائدہ کا بھی یہی قول ہے، حضرت زید بن حارثہ بدر اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے ہیں اور غزوہ موتہ میں شہید ہوئے ہیں، یہ اس وقت امیر لشکر تھے، بعض سفروں میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کو مدینہ میں اپنا خلیفہ کیا ہے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت زید بن حارثہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تھا، یا رسول اللہ آپ نے میرے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے درمیان رشتہ مواخاۃ (بھائی چارہ) قائم فرمایا ہے، اس کو ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کو جس سریہ میں بھی بھیجا لوگوں کا امیر بنا کر ہی بھیجا اور اگر وہ زندہ رہتے تو آپ ان کو خلیفہ بناتے، اس کو ابوبکر بن ابی شیبہ نے قوی اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے، حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں سات غزووں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا اور سات غزوات میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان ہی کو ہم پر امیر کرتے رہے، یہ بخاری کی روایت ہے، واقدی نے کہا ہے کہ زید کا پہلا سریہ قردہ کی طرف ہوا پھر علی الترتیب جموم، عیص، طرف، حسمی اور ام قرفہ کی طرف پھر غزوہ موتہ پر ان کو امیر بنایا گیا اور اسی

میں شہید ہو گئے اس وقت ان کی عمر پچپن سال کی تھی، قرآن مجید میں ان کے سوا بالاتفاق (صحابہ میں سے) کسی کا ذکر بھی اس کے نام کے ساتھ نہیں ہوا ہے اور اگر ثابت ہو سکے تو پھر سجل ہیں لہ محمد بن اسامہ بن زید اپنے والد سے راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا یا زید انت مولائی ومنی والی واحب الناس الی (اے زید تو میرا آزاد کردہ ہے، مجھ سے ہے اور میری طرف ہے اور مجھ کو سب لوگوں میں زیادہ محبوب ہے، اس کو ابن سعد نے اسناد حسن سے روایت کیا ہے اور امام احمد کے ہاں یہ طویل روایت ہے اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی قسم وہ امارت کے لائق ہے یعنی زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور مجھے سب لوگوں میں زیادہ محبوب ہے، اس کو بخاری نے روایت کیا ہے اور ترمذی وغیرہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ مدینہ آئے تو اس وقت رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف فرما تھے جب انہوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دروازہ پر دستک دی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کی طرف کھڑے ہو گئے تا اینکہ انہیں گلے لگایا اور بوسہ دیا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا اس سے زیادہ مقرر کیا جتنا میرے لئے مقرر کیا تھا، چنانچہ میں نے ان سے اس کے متعلق دریافت کیا تو فرمانے لگے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھ سے زیادہ محبوب تھے اور ان کے والد تیرے باپ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیارے تھے، یہ صحیح روایت ہے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے صحیح میں روایت ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے ان سے مروی ہے، یہ زینب بنت جحش کے واقعہ میں ہے جس کو ان سے انس، براء بن عازب، ابن عباس اور ان کے صاحبزادے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے اور تابعین کی ایک جماعت نے مرسلاً روایت

لہ ملاحظہ ہو سجل۔

کیا ہے۔" سلہ ٢٣/٢ ۔

زَيْغٌ : کجی، اعتدال سے ہٹنا، زَاغَ يَزِيغُ کا مصدر ہے، امام راغب نے اس کے معنے اعتدال سے ہٹنے کے بیان کئے ہیں، ٥/٣ ۔

زَيَّلْنَا : ہم نے جدا کر دیا، ہم نے تفریق کر دی، تَزْيِيلٌ سے جس کے معنی متفرق اور پراگندہ کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ٢٨/١٠ ۔

زَيَّنَ : اس نے سنوارا، اس نے زینت دی، اس نے بھلا کر کے دکھلایا، تَزْيِيْنٌ سے جس کے معنی آراستہ کرنے اور زینت دینے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ١١/٦، ٣/٨، ٢/١٠، ١٢/١٣، ١٤/١٩، ١٦/٢٠ ۔

زُيِّنَ : وہ سنوارا گیا، مزین کیا گیا، اچھا دکھلایا گیا، تَزْيِيْنٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب، ١٠/٢، ٤/٢، ١١/٦، ٢/١٠، ١١/١٣، ١٣/١١، ١٤/٢٢، ١٩/٢٤، ٢٠،١٦/٢٦ ۔

زَيَّنَّا : ہم نے زینت دی، ہم نے سنوارا، ہم نے رونق دی، تَزْيِيْنٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ١٩/٤، ١٦/١٩، ٥/٢٣، ٦/٢٤، ١/٢٩ ۔

زَيَّنَّاهَا : ہم نے اس کو رونق دی، ہم نے اس کو زینت دی، اس میں ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، ٢/١٤، ١٥/٢٦ ۔

زِيْنَتَكُمْ : تمہاری زینت، تمہاری رونق، زِيْنَةَ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، یہاں زینت سے لباس مراد ہے، ٨/٣ ۔

زِيْنَتِهٖ : اس کی زینت، اس کی آراستگی، زِيْنَةَ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، ٢٠/١١ ۔

زِيْنَتَهَا : اس کی رونق، اس کی آرائش، زِيْنَةَ مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب، مضاف الیہ، ١٢/٤، ١٢/٥، ١٠/٢١ ۔

زِيْنَتَهُنَّ : ان کا سنگار، ان کی زینت، زِيْنَةَ مضاف ھُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب، مضاف الیہ، ١٠/٣ ۔

زَيَّنُوْا : انہوں نے مزین کر دیا، انہوں نے سنوارا، انہوں نے اچھا کر کے دکھلایا، تَزْيِيْنٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب،

زَيَّنَهٗ : اس نے اسے آراستہ کیا، اس نے اسے زینت دی، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو زَيَّنَ) ٢/٢٦ ۔

زِيْنَةٌ : زینت، زیبائش، آرائش، سنگار، گہنا، اسم ہے، امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں :۔

" زینتِ حقیقی وہ ہے جو انسان کو کسی حالت میں

سلہ ملاحظہ ہو الاصابہ فی تمیز الصحابہ، ج ۱، ص ۵۶۳، ۵۶۴ (طبع السعادہ مصر ۱۳۲۸ھ)

بھی معیوب نہ ہو، نہ دنیا میں، نہ آخرت میں لیکن جو چیز ایک حالت میں تو انسان کو رونق دے اور دوسری حالت میں نہ دے، وہ ایک حیثیت سے معیوب ہے۔

مختصر الفاظ میں زینت کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) زینت نفسی جیسے علم اور عمدہ عقائد (۲) زینت بدنی جیسے قوی و بلند و بالا ہونا (۳) زینت خارجیہ جیسے مال وجاہ آیت کریمہ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ (اس نے محبت ڈالی تمہارے دل میں ایمان کی اور اچھا دکھایا اس کو تمہارے دلوں میں) زینت نفسی سے متعلق ہے اور مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَۃَ اللّٰہِ (کس نے منع کی ہے رونق اللہ کی) کو زینت خارجی پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ مروی ہے کہ ایک قوم بیت اللہ کا برہنہ طواف کیا کرتی تھی، اس آیت کے ذریعہ ان لوگوں کو منع کیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ زینت مذکورہ سے اس آیت میں کرم مراد ہے جو آیت کریمہ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ (معزز عزت اللہ کے ہاں اسی کو بڑی ہے جس کو ادب بڑا) میں مذکور ہے اور اسی کو شاعر نے کہا ہے ع و زینۃ المرء حسن الادب (ادب کی خوبی انسان کی زینت ہے) اور ارشاد الٰہی فَخَرَجَ عَلٰی قَوۡمِہٖ فِیۡ زِیۡنَتِہٖ (پھر نکلا اپنی قوم کے سامنے اپنی تیاری سے) میں زینت دنیوی یعنی مال، اثاثہ اور جاہ مراد ہیں۔

آیات کریمات زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ (ہم نے رونق دی ورلے آسمان کو چراغوں سے) اور اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِزِیۡنَۃِ ۣ الۡکَوَاکِبِ (ہم نے رونق دی آسمان دنیا کو تاروں کی زیبائش سے) اور زَیَّنّٰہَا لِلنّٰظِرِیۡنَ (اس کو رونق دی دیکھنے والوں کے لئے) میں اس زینت کی طرف بھی اشارہ ہے جو نگاہ سے محسوس ہو رہی ہے اور عام و خاص سب اس کو جانتے ہیں اور اس زینت معقولہ کی طرف بھی جس کی معرفت خواص کے ساتھ ہی مخصوص ہے یعنی تاروں کے احکام اور ان کی رفتار۔

اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو زینت دنیا کبھی ان کے مزین کر کے ابداع فرماتے اور اسی طرح بیان کے ایجاد کرنے سے ہوتا ہے اور لوگوں کا کسی شے کو مزین کرنا یا تو ان کے آراستہ کرنے سے ہوتا ہے اور یا ان کے قول سے کہ اس کی مدح کرنے لگیں اور بڑھا چڑھا کر اس کا ذکر کریں۔"

يَوْمَ الزِّينَةِ کے معنی روزِ عید اور جشن کے دن کے ہیں، ۹/۱۱ ، ۱۱/۱۴ ، ۱۴/۷ ، ۱۵/۱۳،۱۶،۱۸ ، ۱۸/۱۲،۱۳ ، ۲۳/۵ ، ۲۷/۱۹ ۔

بابُ السین المہملۃ

س : اب، ابھی، قریب، عن قریب، علامہ سیوطی الاتقان میں لکھتے ہیں :۔

"سین حرف ہے جو مضارع کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کو استقبال کے لئے خاص کر دیتا ہے اور مضارع کے بمنزلہ جزء کے ہے اسی لئے اس میں عمل نہیں کیا ہے اہلِ بصرہ اس طرف گئے ہیں کہ سوف کی بہ نسبت مضارع کے ساتھ اس کی نسبت استقبال تنگ تر ہوتی ہے، اہلِ عربیت اس کو حرفِ تنفیس سے تعبیر کرتے ہیں جس کے معنی حرفِ توسیع کے ہیں کیونکہ یہ مضارع کو تنگ زمانہ یعنی حال سے وسیع زمانہ یعنی استقبال کی طرف پلٹ دیتا ہے اور بعض نے ذکر کیا ہے کہ کبھی استقبال کے استمرار کے لئے آتا ہے جیسا ارشاد ہے سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ الآیہ (اب تم دیکھو گے ایک اور لوگ) اور سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ الآیہ (اب کہیں گے بیوقوف) کیونکہ یہ ان کے اس کہنے کے بعد نازل ہوا ہے کہ وہ کا ہے پر پھر گئے تو سین استمرار کو بتانے کے لئے آیا ہے، استقبال کے لئے نہیں، ابنِ ہشام نے کہا ہے کہ اہلِ نحو اس کو نہیں جانتے بلکہ استمرار تو مضارع سے سمجھا جاتا ہے اور سین استقبال پر آتی ہے کیونکہ استمرار مستقبل ہی میں ہوتا ہے۔

ابنِ ہشام کہتے ہیں کہ زمخشری نے یہ خیال کیا ہے کہ سین جب کسی محبوب یا مکروہ فعل پر داخل ہوتا ہے تو یہ بتاتا ہے کہ وہ ضرور واقع ہوگا اور مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے اس کی وجہ سمجھی ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فعل کے ہونے کے وعدہ کو بتاتا ہے پس اس کا اس پر داخل ہونا جو وعدہ یا وعید کو بتائے اس کی تاکید اور اس کے معنی برقرار رہنے کا مقتضی ہے چنانچہ زمخشری نے سورہ بقرہ میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے چنانچہ

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ (سو اب کفایت ہے تیری طرف سے ان کو اللہ) میں کہا ہے کہ "سین" کے معنی یہ ہیں کہ یہ لامحالہ ہو کر ہی رہے گا اگرچہ کچھ وقت کی اس کی دیر ہو، اور سورۂ براءۃ میں اس کی تصریح ہے چنانچہ آیت اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ (وہ لوگ ان پر رحم کریگا اللہ) میں کہا ہے کہ "سین" لامحالہ وجود رحمت کو بتاتا ہے اور یہ وعدہ کی اسی طرح تاکید کرتا ہے جس طرح تمہارے سَأَنْتَقِمُ مِنْكَ (بس اب تجھ سے بدلہ لونگا) کہنے میں وعید کی تاکید کرتا ہے۔" [1]

فصل الالف

سَآءَ: برا ہے (نصر) فعلِ ذم ہے، سَوْءٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اَسْوَءُ)، ۴/۱۴، ۵/۳، ۶/۱۳، ۷/۱۰، ۸/۳، ۹/۱۲، ۱۰/۸، ۱۳/۱۴ و ۹، ۱۵/۱۴، ۱۶/۱۴، ۱۹/۱۳، ۱۹/۱۹، ۲۰/۱۳، ۲۲/۹، ۲۵/۱۸، ۲۶/۱۳، ۱۳ -

سَآءَتْ: بُری ہے، سَوْءٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۵/۱۴، ۵/۱۱، ۱۵/۱۶، ۱۹/۲، ۲۶/۹ -

سٰبِحٰتِ: تیرنے والیاں، سَبْحٌ سے اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، سَابِحَةٌ کی جمع ہے (ملاحظہ ہو سَبْحٌ) ۳۰/۲ -

سٰبِغٰتٍ: کشادہ زرہیں، سُبُوْغٌ سے جس کے معنی وسیع اور فراخ ہونے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، سَابِغَةٌ کی جمع، پوری لمبی چوڑی زرہ کے لیئے "سابغہ" کا استعمال ہوتا ہے، ۸/۱۲۲ -

سَابِقٌ: آگے بڑھنے والا، سَبْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو تَسْبِيْقُ اور سَبْقًا) ۲۲/۱۶، ۲۳/۲ -

سٰبِقٰتِ: آگے بڑھنے والیاں، سَبْقٌ سے اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، سَابِقَةٌ کی جمع ہے ۳۰/۲ -

سَابِقُوْٓا: دوڑو، سبقت کرو، مُسَابَقَةٌ اور سِبَاقٌ سے جس کے معنی دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے ہیں، امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۲۷/۱۹ -

سٰبِقُوْنَ: آگے پہنچنے والے، آگے بڑھنے والے، سَبْقٌ سے اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت رفع، سَابِقٌ کی جمع، آیۂ شریفہ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ (اور جو لوگ قدیم ہیں پہلے وطن چھوڑنے والے اور مدد کرنیوالے) کی تفسیر

[1] الاتقان فی علوم القرآن (طبع احمدی دہلی) ص ۲۲۸، ۲۲۹

میں حافظ ابن عبد البر نے اپنی مشہور کتاب الاستیعاب فی اسماء الاصحاب میں حسب ذیل اقوال نقل کئے ہیں:۔

(۱) ابن سیرین کہتے ہیں "سابقون اولون" وہ لوگ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نمازیں ادا کی ہیں، محمد بن الحنفیہ اور سعید بن المسیب کا بھی یہی قول[۱] ہے۔ امام مالک، یحییٰ بن سعید سے وہ سعید بن المسیب سے راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ ماہ تک بیت المقدس کی طرف نماز ادا کی پھر واقعۂ بدر سے دو مہینے پہلے آپ کا رخ کعبہ کی طرف پھیر دیا گیا۔

(۲) محمد بن کعب قرظی اور عطاء بن یسار کا قول ہے کہ یہ اہلِ بدر ہیں، عبیدہ کہتے ہیں کہ اہلِ بدر کی تعداد تین سو تیرہ یا تین سو چودہ تھی۔

(۳) شعبی کا بیان ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بیعتِ رضوان میں شرکت کی ہے، حضرتِ جابر بن عبد اللہ معقل بن یسار اور عبد اللہ بن ادفی رضی اللہ عنہم کا بیان ہے کہ ان کی تعداد چودہ سو تھی، یہ تینوں حضرات بھی اس بیعت میں شریک تھے اور ایک روایت میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے پندرہ سو کی تعداد منقول ہے[۲]، ۱۱/۲، ۱۸/۴، ۲۷/۱۴۔

سَابِقِيْنَ: آگے بڑھنے والے، سَبْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب وجر، سَابِقٌ کی جمع، ۲۰/۱۹۔

سَاجِدًا: سجدہ کرنے والا، سُجُوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو اُسْجُدْ)، ۲۳/۱۵۔

سٰجِدُوْنَ: سجدہ کرنے والے، سُجُوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ رفع، سَاجِدٌ واحد، ۱۱/۳۔

سٰجِدِيْنَ: سجدہ کرنے والے، سُجُوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب وجر، ۴/۹، ۴/۹، ۱۱/۱۲، ۶/۱۳/۱۴، ۱۵/۱۷/۱۹، ۱۴/۲۳۔

سَاحَتِهِمْ: ان کا میدان، ان کا صحن، سَاحَۃٌ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، جائے فراخ کو سَاحَۃٌ کہتے ہیں اور اسی لئے سَاحَۃُ الدار یعنی صحنِ مکان ہے، ۲۳/۹۔

سَاحِرٌ: جادوگر، سِحْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، یہ لفظ صرف سورۂ ذریات میں الف کے ساتھ مرقوم ہے اور باقی تمام قرآن میں بغیر الف ہے۔

---

[۱] حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں حضرت ابو موسیٰ اشعری، حسن بصری اور قتادہ سے بھی یہی نقل کیا ہے (ملاحظہ ج ۲ ص ۳۸۳ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ)

[۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الاستیعاب، ج ۱ ص ۲ تا ص ۷ (طبع مصر ۱۳۲۸ھ) برحاشیہ الاصابۃ۔

ملاحظہ ہو سِحْرٌ) پ۹، پ۱۱، پ۱۳، پ۱۶، پ۱۹، پ۲۳، پ۲۴، پ۲۵، پ۲۶ ۔

سٰحِرَانِ: دو جادوگر، سِحْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ تثنیہ مذکر بحالتِ رفع، ۱۶ ۔

سٰحِرُوْنَ: جادو کرنے والے، سِحْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ رفع سَاحِرٌ واحد، پ۱۱ ۔

سَاحِلِ: کنارۂ دریا، ساحلِ سمندر، سَحْلٌ سے جس کے معنی چھیلنے کے ہیں، ماخوذ ہے، چونکہ کنارۂ دریا سے پانی کو جدا کرتا ہے اس لئے ساحل سے موسوم ہوا اور بعض کا خیال ہے کہ یہ بمعنی مسحول ہے کیونکہ پانی اس کو چھیلتا اور کاٹتا ہے لیکن اس کا استعمال بلفظ فاعل ہوا ہے جیسے هَمٌّ نَاصِبٌ بمعنے منصوب بوتے ہیں، سَوَاحِلُ جمع، ۱۶ ۔

سٰخِرِيْنَ: ہنسی کرنے والے، ٹھٹھا کرنے والے سُخْرِيَّتٌ سے جس کے معنی استہزاء اور مذاق کرنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب و جر، سَاخِرٌ واحد، پ۲۴ ۔

سَادَتَنَا: ہمارے سردار، سَادَةٌ، سَيِّدٌ کی جمع مضاف ہے نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ (ملاحظہ ہو سَيِّدًا) پ۲۲ ۔

سَادِسُهُمْ: ان کا چھٹا، سَادِسُ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، پ۱۵، پ۲۸ ۔

سَارٍ: وہ چلا، سَيْرٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، (ملاحظہ ہو تَسِيْرُ) پ۲۰ ۔

سَارِبٌ: گلیوں میں پھرنے والا، راہ میں چلنے والا، سُرُوْبٌ سے جس کے معنی اپنے رخ پر چلنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، سَرْبٌ جمع ہے جیسے رَكْبٌ رَاكِبٌ کی جمع ہے، پ۱۳ ۔

سَارِعُوْا: جلدی کرو، دوڑو، مُسَارَعَةٌ سے جس کے معنی دوڑنے اور دوڑانے کے ہیں، امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، اس کا تعدیہ بذریعہ اِلٰی ہوتا ہے، ابن جنی نے تصریح کی ہے کہ سَارَعَ متعدی ہے اور سَرُعَ اور أَسْرَعَ دونوں لازم ہیں اور ان دونوں میں باہم فرق یہ ہے کہ سَرُعَ تو پسندیدہ ہے اور أَسْرَعَ کا مطلب ہے اپنی جان کو سرعت کی تکلیف دی[1]، پ۴ ۔

سَارِقٌ: چور، چوری کرنے والا، سَرِقَةٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، (ملاحظہ ہو سَرَقَ) پ۶ ۔

سٰرِقُوْنَ: چور، چوری کرنے والا، سَرِقَةٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ رفع سَارِقٌ واحد، پ۱۳ ۔

سَارِقَةٌ: چوری کرنے والی، چرانے والی، سَرِقَةٌ

[1] ملاحظہ ہو تاج المصادر از امام ابوجعفر بیہقی۔

سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، ۱۰/۲ ب۔

سٰرِقِیْنَ: چرانے والے، چوری کرنے والے، یہ اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت نصب و جر ہے، ۱۳/۲ پ۔

سَاعَة: گھڑی، وقت، رات یا دن کا کوئی سا وقت ہو ساعت کہلاتا ہے، اہلِ عرب اس کا استعمال وقت ہی کے معنی میں کرتے ہیں چاہے ذرا دیر ہی کے لئے ہو، قرآن مجید میں الساعۃ کا لفظ جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے اس سے قیامت مراد ہے، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:۔

"زمانہ کے حصوں میں سے کوئی سا بھی حصہ ہو ساعت ہے اور قیامت بھی اس سے مراد لی جاتی ہے، ارشاد ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ (پاس آلگی وہ گھڑی یعنی قیامت) اور یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ (تجھ سے پوچھتے ہیں وہ گھڑی یعنی قیامت) اور عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ (اس کے پاس ہے قیامت کی خبر) یا تو حق تعالیٰ شانہ کے جلد حساب لینے کے سبب اس کو قیامت سے تشبیہ دی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہے وَهُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِيْنَ (اور وہ شتاب لیتا ہے حساب) اور یا اس وجہ سے کہ جس پر یہ کہکر تنبیہ فرمایا ہے كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا (ایسا لگے گا جس دن اس کو دیکھیں گے کہ ان کو دیر نہ لگی مگر ایک شام یا اس کی صبح) اور يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ (اور جس دن ان کو جمع کریگا گویا نہ رہے تھے مگر کوئی گھڑی دن) پس ساعتِ اولیٰ قیامت ہے اور ساعتِ ثانیہ زمانہ کا قلیل وقت۔

اور بعض کا قول ہے کہ وہ ساعات جو قیامت کے معنی دیتی ہیں تین ہیں (۱) الساعۃ الکبریٰ یعنی لوگوں کا حساب دینے کے لئے اٹھنا، اسی کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اشارہ فرمایا ہے لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَظْهَرَ الْفُحْشُ وَالتَّفَحُّشُ وَحَتّٰى يُعْبَدَ الدِّرْهَمُ وَالدِّيْنَارُ (قیامت قائم نہیں ہوگی یہانتک کہ فحش اور بے حیائی کھلم کھلا ہونے لگے اور یہاں تک کہ روپیہ اور اشرفی کی پوجا ہونے لگے) وغیرہ وغیرہ، اور آپ نے بہت سے ان امور کا ذکر فرمایا کہ جو نہ آپ کے زمانہ میں ہوئے اور نہ آپ کے بعد۔ (۲) الساعۃ الوسطیٰ اور یہ ایک قرن کے لوگوں کا مرجانا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ

آپ نے عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر فرمایا ان یطل عمر ھٰذا الغلام لم یمت حتی تقوم الساعۃ (اگر اس لڑکے کی عمر دراز ہوئی تو یہ اس وقت تک نہیں مریگا جب تک قیامت قائم نہ ہو) چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ صحابہ میں سب سے آخری مرنے والے شخص ہیں۔

(۳) الساعۃ الصغریٰ، اور یہ انسان کی موت ہے پس ہر انسان کی ساعت اس کی موت ہے اور اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰہِ حَتّٰی اِذَا جَآءَتْھُمُ السَّاعَۃُ بَغْتَۃً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْھَا (خراب ہوئے جنہوں نے جھوٹ جانا ملنا اللہ کا جب تک کہ آپہنچی ان پر قیامت بے خبر، کہنے لگے اے افسوس کیسا قصور کیا اس میں) اور معلوم ہے کہ یہ حسرت انسان کو اس کی موت کے وقت حاصل ہوتی ہے کیونکہ ارشاد ہے وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ (اور خرچ کرو کچھ ہمارا دیا اس سے پہلے کہ پہنچے کسی کو تم میں سے موت، تب کہے اے رب کیوں نہ ڈھیل دی مجھ کو ایک تھوڑی مدت کہ میں خیرات کرتا اور رہتا نیک لوگوں میں) اور اسی طرح یہ آیت ہے قُلْ اَرَءَیْتَکُمْ اِنْ اَتٰکُمْ عَذَابُ اللّٰہِ اَوْ اَتَتْکُمُ السَّاعَۃُ (تو کہہ دیکھو تو اگر آوے تم پر عذاب اللہ کا یا آوے تم پر قیامت) اور مروی ہے کہ جب آندھی آتی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا رنگ رو متغیر ہو جاتا اور فرماتے تخوفت الساعۃ (مجھے قیامت کا دھڑکا ہوا) نیز ارشاد ہے ما امد طرفی ولا اغضھا الا والساعۃ قد قامت (میں جب بھی نظر اٹھاتا ہوں یا نیچی کرتا ہوں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ قیامت ہو چکی (یعنی موت آ چکی)"

پ۷/۱۰، پ۸/۱۱، پ۹/۱۳، پ۱۱/۳، ۱۰، پ۱۳/۶، پ۱۴/۴، ۱۴، ۱۷، پ۱۵/۱۵، ۱۷، پ۱۶/۸، ۱۰، پ۱۷/۴، ۸، ۱۳، پ۱۸/۱۷، پ۲۱/۵، ۹، ۱۳، پ۲۲/۵، ۷، ۹، پ۲۴/۱۰، ۱۱، پ۲۵/۱، ۳، ۲، ۱۳، ۲۰، پ۲۶/۴، ۹، پ۲۷/۸، ۱۰، پ۳۰/۴۔

سَافِلَھَا: اس کے نیچے، اس کے تلے، سَافِلٌ سُفُوْلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ (ملاحظہ ہو اَسْفَلَ) پ۱۲/۷، پ۱۴/۵۔

سَافِلِیْنَ: نیچے ہونے والے، سُفُوْلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت نصب و جر، پ۳۰/۲

سَاقٍ: پنڈلی، علامہ لغوی مجدالدین فیروز آبادی قاموس میں رقمطراز ہیں :۔

"ٹخنہ اور گھٹنے کے جو درمیان ہے "وہ ساق" ہے، سُوْقٌ سِیْقَانٌ اَسْؤُقٌ جمع ہوا اور واو کو ہمزہ اس لئے کیا گیا کہ ضمہ کو برداشت کر سکے اور یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ (جس دن کھولی جائے پنڈلی) کے معنی عن شدۃ کے ہیں (یعنی جس دن سختی ظاہر ہو) وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (اور لپٹ گئی پنڈلی پر پنڈلی) یعنی دنیا کی آخری شدت آخرت کی پہلی شدت سے لپٹ گئی، جب معاملہ کی شدت اور اس کی ہولناکی کی خبر دینا مقصود ہوتا ہے تو ساق کا ذکر کرتے ہیں"، ۲۹/۴، ۱۷ -

سَاقِطًا: گرنے والا، سُقُوْطٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو تَسَّقَطُ) ۲۷/۴ -

سَاقَیْهَا: اس کی دونوں پنڈلیاں، سَاقَ مضاف هَا ضمیر واحد مونث غائب مضاف الیہ، سَاقَیْ اصل میں سَاقَیْنِ تھا سُوْقٌ کا تثنیہ بحالتِ نصب و جر، اضافت کے سبب نؔ ساقط ہو گئی، ۱۹/۱۸ -

سَاكِنًا: ٹھہرا ہوا، ساکن، سُکُوْنٌ سے جس کے معنی تھمنے اور حرکت کے بعد کسی شئے کے ٹھہر جانے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، ۱۹/۴ -

سَأَلَ: اس نے مانگا، سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اِسْئَلْ اور سُؤَالٌ)، ۲۹/۸ -

سَالَتْ: وہ بہی، وہ جاری ہوئی، (ضرب) سَیْلًا سے جس کے معنی بہنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مونث غائب، ۱۳/۸ -

سَأَلْتُكَ: میں نے تجھ سے پوچھا، میں نے تجھ سے سوال کیا، سَأَلْتُ سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر، ۱۶/۱ -

سَأَلْتُكُمْ: میں نے تم سے سوال کیا، میں نے تم سے مانگا، اس میں كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے، ۲۲/۱۲، ۱۲ -

سَأَلْتُمْ: تم نے مانگا، تم نے سوال کیا، سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۱ -

سَأَلْتُمُوْهُ: تم نے اس کو مانگا، تم نے اس کا سوال کیا، اس میں واؤ اشباع کا، هُ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، ۱۳/۴ -

سَأَلْتُمُوْهُنَّ: تم نے ان (عورتوں) سے مانگا تم نے ان سے سوال کیا، اس میں واؤ اشباع کا اور هُنَّ ضمیر جمع مونث غائب ہے، ۲۲/۴ -

سَأَلْتَهُمْ: تو نے ان سے پوچھا، تو نے ان سے

سوال کیا، سَأَلْتُ سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، پ ۱۴ پ ۲۱ / ۱۲، ۲ پ ۲۴ / ۱ پ ۲۵ / ۳، ۷ ۔

سَاَلَکَ : اس نے تجھ سے پوچھا، اس نے تجھ سے سوال کیا، اس میں کَ ضمیر واحد مذکر حاضر ہے، (ملاحظہ ہو سَاَلَ) پ ۲ ۔

سَالِمُوْنَ : چنگے، اچھے بھلے، صحیح سالم، سَلَامَۃٌ سے جس کے معنی آفاتِ ظاہر و باطن سے صحیح سالم رہنے کے ہیں، اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مذکر سَالِمٌ کی جمع، پ ۲۹ / ۴ ۔

سَاَلُوْا : انہوں نے مانگا، انہوں نے سوال کیا، سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۶ / ۲ ۔

سَاَلَهَا : اس کو پوچھا، اس کا سوال کیا، اس میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے (ملاحظہ ہو سَاَلَ) پ ۷ / ۴ ۔

سَاَلَهُمْ : ان سے پوچھا، ان سے سوال کیا، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو سَاَلَ) پ ۲۹ / ۱ ۔

سَامِدُوْنَ : کھیل کرنے والے، غافل ہونیوالے، گانیوالے، تکبر سے سر اٹھانے والے، حیرت میں کھڑے رہنے والے، سُمُوْدٌ سے جس کے معنی کھیلنے، غافل ہونے گانے اور تکبر سے سر اٹھانے اور حیرت میں کھڑے ہو جانے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، سَامِدٌ واحد۔ ابنِ درید نے تصریح کی ہے کہ یہ یمانی لغت ہے[۱] اور عبدالرزاق بروایتِ عکرمہ حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے معنی گانے کے نقل کرتے ہیں، عکرمہ کا بیان ہے کہ یہ اہلِ یمن کی زبان ہے جب یمنی تَغَنَّ (تو گا) کہنا چاہیگا تو اس کے لئے اُسْمُدْ بولیگا،[۲] اور امامِ بخاری اپنی صحیح میں عکرمہ سے ناقل ہیں کہ سَامِدُوْنَ کے معنی حمیری زبان میں گانیوالوں کے ہیں[۳]، نیز عبدالرزاق نے ایک اور طریق سے بروایت عکرمہ حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے معنی کھیل کرنیوالوں کے اور بروایتِ معمر، قتادہ سے، غافل ہونیوالوں کے روایت کئے ہیں، اور ابنِ مردویہ بروایتِ سعید بن جبیر حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روگردانی کرنیوالوں کے معنی نقل کرتے ہیں[۴]، پ ۲۷ / ۷ ۔

سٰمِرًا : کہانی والا، افسانہ گو، داستاں سرا، سَمَرٌ سے جس کے معنی رات میں قصہ گوئی کے ہیں، اسم

[۱] جمہرۃ اللغۃ: ج ۲، ص ۲۶۵ [۲] فتح الباری ج ۸، ص ۶۰۵ (طبع مصر) [۳] صحیح البخاری ج ۲، ص ۷۲۰ (طبع مجتبائی دہلی) [۴] فتح الباری، ج ۸، ص ۴۶۵ (طبع مصر)

فاعل کا صیغہ جمع مذکر، علامہ محمود آلوسی روح المعانی میں رقمطراز ہیں :-

"سامِرًا بربنائے حال منصوب ہے اور یہ اسم جمع ہے جیسے کہ حاج، حاضر، حامل اور باقر ہیں اور بعض کا قول ہے کہ یہ مصدر ہے جو بنائے تاویل مشہور حال واقع ہوا ہے اسی لئے اپنی اصل کے اعتبار سے قلیل وکثیر سب پر مشتمل ہے مگر مخفی نہ رہے کہ مصدر کا فاعل کے وزن پر آنا نادر ہے اور اسی سے عافیہ اور عاقبہ ہے سمر اصل میں ظلِ قمر (چاند کا سایہ) کو کہتے ہیں اور یہ جیسا کہ مطلع (کتاب کا نام ہے) میں مذکور ہے اپنے دھندلے پن کی وجہ سے اس نام سے موسوم ہے اور بحر میں ہے کہ درختوں پر جو چاندنی پڑتی ہے اسے کہتے ہیں، اور راغب کا بیان ہے کہ یہ رات کی اندھیاری ہے بعد میں رات میں باتیں کرنے کے معنی میں اس کا استعمال ہونے لگا، اور بعض نے سامر کی تفسیر اندھیری رات سے کی ہے اور یہاں اس معنی میں اس کا ہونا اور پھر بربنائے نزع خافض اسے منصوب قرار دینا کچھ نہیں ہے۔" [۱]

سَامِرِیُّ [۱۸] سامری، علامہ محمود زمخشری، کشاف میں رقمطراز ہیں :-

"سامری بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ کی طرف منسوب ہے جس کو سامرہ کہا جاتا ہے اور بعض کا قول ہے کہ سامرہ یہود میں ایک قوم ہے جو بعض مذہبی چیزوں میں یہود کی مخالف ہے اور بعض نے اس کو باجرما کا رہنے والا بتایا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ کرمان کا ایک دیہاتی کافر تھا، اس کا نام موسیٰ بن ظفر ہے، یہ منافق تھا اور اسلام ظاہر کرتا تھا، اس کی قوم گائے کی پجاری تھی [۲]

اور مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں :-

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سامری کون تھا، یہ اس کا نام تھا یا قومیت کا لقب؟ قیاس کہتا ہے کہ یہاں سامری سے مقصود سمیری قوم کا فرد ہے، کیونکہ جس قوم کو ہم نے سمیری کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے، عربی میں قدیم سے اس کا نام سامری چلا آرہا ہے اور اب بھی عراق میں ان کا بقایا اسی نام سے پکارا جاتا ہے، یہاں قرآن کا "السامری" کہہ کے اسے پکارنا صاف کہہ رہا ہے کہ یہ نام نہیں ہے اس کی قومیت کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ شخص اسرائیلی نہ تھا، سامری تھا،

---

[۱] روح المعانی، ج ۱۸، ص ۵۴ (طبع منیریہ مصر)

[۲] کشاف، ج ۴، ص ۲۹، (طبع بولاق مصر ۱۲۸۱ھ)

حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے تین ہزار برس پہلے دجلہ و فرات کے دوآبے میں دو مختلف قومیں آباد ہو رہی تھیں، اور ایک عظیم الشان تمدن کی بنیادیں اٹھا رہی تھیں، ان میں ایک قوم جو جنوب سے آئی تھی عرب تھی، دوسری جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ شمال سے اتری، سمیری تھی، اسی قوم کے نام سے تاریخ قدیم کا شہر سامرہ اور آباد ہوا تھا جس کا محل تل العبید میں دریافت ہوا ہے اور وہاں سے پانچ ہزار برس پیشتر کے بنے ہوئے زیور اور سنہری ظروف برآمد ہوئے ہیں۔

بہرحال سمیری قبائل کا اصلی وطن عراق تھا مگر یہ دور دور تک پھیل گئے تھے، مصر آن سے تعلقات کا سراغ ایک ہزار سال قبل مسیح تک روشنی میں آچکا ہے پس معلوم ہوتا ہے اسی قوم کا ایک فرد حضرت موسیٰ کا بھی معتقد ہو گیا اور جب بنی اسرائیل نکلے تو یہ بھی ان کے ساتھ نکل آیا، اسی کو قرآن نے "السامری" کے لفظ سے یاد کیا ہے گائے، بیل اور بچھڑے کی تقدیس کا خیال سمیریوں میں بھی تھا اور مصریوں میں بھی[1]"

۱۶/۱۴،۱۳ -

سَاوٰی: اس نے برابر کر دیا، وہ برابر ہو گیا، مُسَاوَاۃٌ سے جس کے معنی برابر کرنے اور برابر ہونے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ۱۶/۲

سَاھِرَۃٌ: میدان، زمین، روئے زمین، سَھَرٌ سے جس کے معنی نیند اُڑ جانے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، مگر اس کا استعمال زمین اور روئے زمین کے معنی میں ہوتا ہے، امام رازی تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں :-

"ساھرۃ سفید ہموار زمین کو کہتے ہیں، اس نام سے اس کے موسوم ہونے کی دو وجہیں ہیں، (۱) اس پر چلنے والا خوف سے سوتا نہیں، (۲) اس میں سراب رواں ہوتا ہے یہ عرب کے محاورہ عین ساھرۃ (چشمۂ رواں) سے ماخوذ ہے اور میرے نزدیک اس میں تیسری وجہ بھی ہے وہ یہ کہ زمین کا ساھرۃ اس لئے نام پڑا کہ شدتِ خوف کے باعث اس میں انسان کی نیند اڑ جاتی ہے تو وہ زمین کہ جس کے اندر قیامت کے موقع پر کافر جمع ہوں گے نہایت ہی خوف میں ہوں گے لہٰذا اس زمین کا نام ساھرۃ اس

[1] ترجمان القرآن، ج ۲، ص ۴۶۴ و ۴۶۵

بنا پر ہوا۔

پھر ایک اور وجہ سے بھی علماء میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ دنیا کی زمین ہے اور دوسروں کا بیان ہے کہ ارضِ آخرت ہے کیونکہ لوگ زجرہ (جھڑکی) صیحہ (شور) کے وقت جوق در جوق آخرت کی زمین پر منتقل ہو نگے شاید یہ وجہ زیادہ قریب ہو[1]، پ ۳۰/۲۔

سَاهَمَ: اس نے قرعہ ڈلوایا، مُسَاهَمَةٌ سے جس کے معنے کسی کے ساتھ قرعہ ڈالنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۲۳/۹۔

سَاهُوْنَ: بے خبر، بھولنے والے، غافل، سَهْوٌ سے جس کے معنی غافل ہونے کے ہیں، اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مذکر۔ سَاهُوْنَ اصل میں سَاهِيُوْنَ تھا بروزن فَاعِلُوْنَ، یٰ مضموم ماقبل اس کا مکسور ضمہ یٰ پر ثقیل ہوا، نقل کر کے ماقبل کو دیا، اب وٗ اور یٰ دو ساکن جمع ہوئے، یٰ کو حذف کر دیا۔ امام راغب لکھتے ہیں:۔

"غفلت سے جو خطا ہو وہ "سہو" ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ انسان سے ایسی چیزیں سرزد نہ ہوں جو اس خطا کو کھینچتی اور پیدا کرتی ہیں جیسے دلیوانہ کسی انسان کو گالی دے دوسرے یہ کہ اس سے ایسی چیزیں ہوئیں جو اس خطا کو پیدا کرتی ہیں جیسے وہ شخص کہ جس نے شراب پی اور پھر اس سے کوئی برائی بغیر اس برائی کے ارادہ کے ظہور میں آئی تو پہلی خطا تو اس کی معاف ہے اور دوسری پر ماخوذ ہوگا اور دوسری طرح کی خطا پر حق تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے ارشاد ہے فِیْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ (غفلت میں بھول رہے ہیں) عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (اپنی نماز سے بے خبر ہیں)"

پ ۲۶/۱۸ پ ۳۰/۳۲۔

سَائِبَةٍ: سائبہ اہلِ جاہلیت مویشی میں سے جو جانور بت کے نام پر آزاد کرتے اور اسے اپنے اختیار پر چھوڑ دیتے، وہ "سائبہ" تھا۔

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں:۔

"سائبۃ۔ بروزن فَاعِلَۃٌ، ساب سے ہے جو سطحِ زمین پر کسی چیز کے رواں ہونے کے لئے استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے ساب الماء (پانی رواں ہوا) سابت الحیۃ (سانپ رواں ہوا) پس جو جانور اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ جدھر چاہے چلا جائے وہ سائبۃ ہے اور یہ بمعنی مسیبۃ (رواں شدہ

[1] تفسیر کبیر، ج ۸، ص ۴۴۳ (طبع مصر ۱۳۰۹ھ)

اسمِ فاعل بمعنی اسم مفعول) ہے جیسے کہ عیشۃ راضیۃ بمعنی مرضیۃ ہے اور اس کے متعلق علماء نے متعدد صورتیں بیان کی ہیں :-

(۱) ابوعبیدہ کا بیان ہے کہ کوئی شخص جب بیمار ہوجاتا یا سفر سے واپس ہوتا یا کوئی منت مانتا یا کسی نعمت کا شکرانہ ادا کرتا تو اونٹ چھوڑ دیتا جو تمام احکام میں بحیرہ[۱] کی طرح ہوتا تھا۔

(۲) فراء کا قول ہے کہ جب ناقہ دس بچے دے چکتی جو سب کے سب مادہ ہوتے تو اسے چھوڑ دیا جاتا نہ اس پر سواری کی جاتی نہ اس کا دودھ دوہا جاتا اور نہ اس کی اون کاٹی جاتی اور نہ بجز بچہ یا مہمان کے کوئی اس کا دودھ پیتا تھا۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سائبۃ وہ ہے جو بتوں کے لئے لیجائی جاتی یعنی ان کے لئے چھوڑی جاتی تھی، ایک شخص اپنے مال میں سے جو چاہتا چھوڑ دیتا اور اسے لیکر پجاریوں کے پاس جو ان کے بتوں کے خادم تھے آتا تھا اور وہ مسافروں کو اس کا دودھ پلاتے تھے۔

(۴) سائبۃ وہ غلام ہے جو اس طرح پر آزاد کیا جاتا کہ نہ اس پر ولاء ہوگی، نہ دیت اور نہ میراث ؎۔ [۲]

شیخ نور الحق محدث دہلوی، تیسیر القاری میں فرماتے ہیں :-

" ابوعبیدہ گوید سائبہ از ہمہ انعام می باشد کہ نذر بتاں کردندی گذاشتند و بعضے گویند مخصوص بہ شتر ست "۔ [۳]

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو دیکھا کہ وہ اپنی آنتیں آگ میں کھینچ رہا ہے یہ پہلا شخص ہے جس نے سوائب (سانڈنیاں) کو چھوڑا ہے۔ [۴] سہ۔

سٰٓئِحٰتٍ : روزہ دار، سیاحۃ سے جس کے معنی زمین پر چلنے کے ہیں، اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، سائحۃ واحد اس اعتبار سے اس کے لغوی معنی زمین پر سیر و سیاحت کرنے والیوں کے ہیں لیکن سلف کی اکثریت نے اس کی تفسیر صائمات یعنی روزہ رکھنے والیوں سے کی ہے، حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں

---

[۱] ملاحظہ ہو لفظِ بحیرہ [۲] تفسیر کبیر، ج ۳، ص ۴۵۷، ۴۵۸ [۳] تیسیر القاری شرح صحیح البخاری، ج ۴، ص ۳۲۵ (طبع علوی لکھنؤ)
[۴] صحیح البخاری، ج ۲، ص ۶۶۵ (طبع مجتبائی دہلی)

صحابہ میں سے حضرتِ ابو ہریرہ، حضرتِ عائشہ، حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہم اور تابعین اہلِ تفسیر میں سے عکرمہ، مجاہد، سعید بن جبیر، عطاء، محمد بن کعب قرظی، ابو عبدالرحمٰن سلمی، ابو مالک، ابراہیم نخعی، حسن، قتادہ، ضحاک، ربیع بن انس اور سدی وغیرہم کا یہی قول نقل کیا ہے اور زید بن اسلم اور ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن نے اس کی تفسیر مہاجرات (ہجرت کرنے والیاں) سے کی ہے مگر پہلا قول اولیٰ ہے۔[1]

علامہ زمخشری، کشاف میں سورہ التحریم میں اس لفظ کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"صائم کو سائح کہا گیا کیونکہ اس کے پاس توشہ نہیں ہوتا اس لئے جب تک کھانے کو نہ ملے رکا رہتا ہے پس روزہ دار کو افطار کا وقت آجانے تک رک جانے میں اس سے تشبیہ دی گئی ہے۔" ۲۸/۱۹

سَائِحُونَ: بے تعلق رہنے والے، یہ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ ہے فرماتے ہیں:۔

"بے تعلق رہنا روزہ ہے یا ہجرت ہے یا دل نہ لگانا دنیا کے مزوں میں" (موضح القرآن)

سِیَاحَۃٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر سَائِحٌ واحد، علامہ خازن بغدادی لکھتے ہیں:۔

"سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ صائم کا سائح اس لئے نام پڑا کہ سیاحت کرنے والا کھانا، پینا، نکاح کرنا سب لذتوں کو ترک کر دیتا ہے اور ازہری کا بیان ہے کہ جو شخص عابدانہ طریق پر زمین میں سیاحت کرتا ہے اس کے ساتھ توشہ نہیں رہتا اس لئے وہ کھانے سے رکا رہتا ہے اور اسی طرح روزہ دار بھی کھانے سے رک جاتا ہے اور بعض کا قول ہے کہ سیاحت اصل میں زمین پر برابر چلتے رہنے کا نام ہے جیسے کہ بہتا پانی ہوتا ہے اور روزہ دار بھی برابر طاعت کی بجا آوری اور امرِ ممنوع کے ترک میں مشغول رہتا ہے عطاء کہتے ہیں کہ "سائحون" سے مراد راہِ خدا کے غازی اور مجاہد ہیں اور اس پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو حضرتِ عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) مجھے سیاحت کی اجازت عطا فرمائیے، تو آپ نے ارشاد فرمایا میری امت کی سیاحت اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔ بغوی نے اس روایت کو بغیر سند کے ذکر کیا ہے

[1] ملاحظہ ہو تفسیر ابنِ کثیر ج ۴، ص ۳۹۰ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ)

عکرمہ نے کہا ہے کہ "سائحون" سے طالب علم مراد ہیں کہ جو طلبِ علم میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں پھرتے رہتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ کہ نفس کی درستگی اور اخلاق کی خوبی میں سیاحت کو بڑا دخل ہے کیونکہ ضرور ہے کہ سیاحت کرنے والے کو طرح طرح کی تکالیف اور مشقتوں سے سابقہ پڑے جن پر صبر کرنا اسے لابدی ہے، دورانِ سیاحت میں علماء و صلحاء سے ملاقات ہوگی اور ان سے استفادہ کرکے ان کی برکتوں کو لے کر واپس ہوگا نیز قدرتِ الٰہی کے آثار و عجائبات نظر پڑیں گے اور ان پر غور کریگا تو حق تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی عظمت قدرت کیطرف رہنمائی کریں گے۔" [1]

امام راغب، مفردات القرآن میں تحریر کرتے ہیں:۔

"بعض نے کہا ہے کہ روزہ کی دو قسمیں ہیں ایک حقیقی یعنی کھانے پینے اور جماع کو ترک کرنا دوسرے حکمی یعنی جوارح کان، آنکھ، زبان وغیرہ کی معاصی سے حفاظت کرنا، پس سائح وہ ہے جو پہلی قسم کا روزہ نہیں بلکہ یہ روزہ رکھے اور بعض کا قول ہے کہ "سائحون" وہ ہیں جو اس آیت کے مقتضیٰ کی تلاش میں رہتے ہیں اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا (کیا پھرے نہیں ملک میں جو ان کے دل ہوتے جن سے بوجھتے یا کان ہوتے جن سے سنتے۔")

حافظ ابنِ کثیر نے مفسرین سلف صحابہ و تابعین سے اس کی تفسیر میں روزہ داروں کے سے نقل کرکے لکھا ہے کہ اس بارے میں حدیث مرفوع بھی وارد ہوئی ہے، ابنِ جریر حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سائحون روزہ دار ہیں مگر یہ موقوفاً صحیح ہے، نیز ابنِ جریر نے عبید بن عمیر سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سائحین کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا وہ روزہ رکھنے والے ہیں، ابنِ کثیر کہتے ہیں یہ مرسل جید ہے اور یہ معنی سب اقوال میں اصح اور زیادہ مشہور ہیں اور ایسی روایت بھی آئی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ سیاحت سے مراد جہاد ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں مگر سیاحت سے مراد وہ نہیں ہے جو بعض متعبدین سمجھ بیٹھے ہیں کہ بس محض زمین میں پھر لینا اور پہاڑ کی چوٹیوں اور کھوؤں اور جنگلوں میں تنہا بسر کرنا سیاحت ہے کیونکہ یہ چیز بجز اس زمانہ کے جب کہ

[1] لباب التاویل فی معانی التنزیل، ج ۲، ص ۲۶۹ (طبع مصر)

فتنوں کا زمانہ ہو اور مذہب پامال ہو رہا ہو اور کسی وقت مشروع نہیں ہے[۱]۔ پ‍۱۱

سَائِغٌ: خوشگوار، رچتا پچتا، سَوْغٌ سے جس کے معنی آسانی کے ساتھ کھانے پینے کے حلق سے نیچے اتر جانے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ۲۲/۱۴ ۔ سَائِغًا ۱۴/۱۵ ۔

سَائِقٌ: ہانکنے والا، سَوْقٌ سے جس کے معنے ہانکنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، یہاں وہ فرشتہ مراد ہے جو حشر میں کھینچ کر لائے گا۔ ۲۶/۱۶ ۔

سَائِلٌ: مانگنے والا، سوال کرنے والا، سُؤَالٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، آیت شریفہ سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ کی تفسیر میں ابن ابی حاتم نے ابن زید سے یہ روایت کی ہے کہ جہنم کی ایک وادی ہے جسے سائل کہا جاتا ہے[۲]، حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ قول ضعیف اور مراد سے دور ہے، صحیح پہلے ہی معنی ہیں کیونکہ سیاق اسی کو بتا رہا ہے[۳] (ملاحظہ ہو اِسْأَلْ اور سُؤَالٌ) ۲۶/۱۸ ۲۹/۷ ۲۰/۱۸ ۔

سَائِلِيْنَ: مانگنے والے، سوال کرنے والے، پوچھنے والے، سُؤَالٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب و جر، پ‍۲/۶ ۱۳/۱۲ ۲۶/۱۶ ۔

فصل الباء الموحدہ

سَبَا: ایک قوم کا نام ہے، ان کا وطن عرب میں تھا، یمن کی طرف (موضح القرآن)، امام ابن جریر طبری حضرت فروہ بن مسیک غطیفی رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے سبا سے مطلع فرمائیے وہ کیا ہے، آیا وہ کوئی ملک ہے یا کوئی عورت ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نہ تو وہ کوئی ملک ہے اور نہ کوئی عورت بلکہ ایک شخص ہے جس کے دس اولادیں ہوئیں، چھ نے یمن کی سمت کو اختیار کیا اور چار نے شام کو، جو لوگ بجانب شام ہیں وہ لخم، جذام، عاملہ اور غسان ہیں اور جنہوں نے یمن کی سمت کو اختیار کیا وہ کندہ، اشعریین، ازد، مذحج، حمیر اور انمار ہیں، تب اس شخص نے دریافت کیا انمار کون ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ لوگ جن میں خثعم اور بجیلہ ہیں، امام ترمذی نے بھی اس حدیث کو اپنی جامع میں اس سے زیادہ بسط کے ساتھ روایت کیا ہے[۴] اور اس کو حسن غریب بتایا ہے[۵]، زجاج کہتے ہیں کہ سبا دہ

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۳۹۲
[۳] تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۴۱۸ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ)
[۴] الاتقان فی علوم القرآن از سیوطی، ص ۹۰ (طبع احمدی)
[۵] ایضاً، ج ۳، ص ۵۳۱ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ)

شہر ہے جو مارب کے نام سے مشہور ہے، یہ صنعاء سے
تین شب کی مسافت پر ہے[1]۔ یاقوت حموی لکھتے ہیں
کہ یہ سرزمین اس نام سے اس لئے موسوم ہوئی کہ
یہی اولادِ سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان کی سکونت
گاہ تھی، یاقوت نے اس کا طول البلد ۶۴ درجہ اور
عرض البلد ۱۷ درجہ بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اقلیم
اول میں ہے[2]۔ ابنِ درید نے کتاب الاشتقاق میں لکھا ہے
کہ سبا بن یشجب بن یعرب کا لقب ہے اس کا نام
عبدِ شمس ہے، یہ لفظ یمن کے تمام قبائل کو جامع ہے[3]
مولانا سید سلیمان ندوی، ارض القرآن میں لکھتے ہیں:۔
"توراۃ میں شبا ایک جدِ قبیلہ کا نام ہے، عرب
روایت کے مطابق اس جدِ قبیلہ کا نام عمر یا
عبدِ شمس اور لقب سبا تھا، محققینِ جدید بھی
زیادہ تر اس کو لقب خیال کرتے ہیں، لغویینِ عرب
کی رائے ہے کہ یہ "سبی" سے مشتق ہے جس کے معنی
غلام بنانے کے ہیں، چونکہ عبدِ شمس بہت بڑا فاتح تھا
اور اس نے بہت سے لوگوں کو گرفتار کر کے غلام
بنایا اس لئے اس کا لقب سبا قرار دیا گیا،
تحقیقِ جدید یہ ہے کہ "سبی" اور "سبا" اس معنی سے
ماخوذ ہے جس کا مفہوم تجارت ہے کتبات میں عموماً
سبا کا مادہ تجارتی سفر کے معنی میں مستعمل ہوا ہے،
عربی زبان میں یہ اب تک شراب کی تجارت یا اُس کی
خرید و فروخت اور اس کے سفر کے معنی میں مستعمل
ہے، سبا چونکہ تاجر قوم تھی اس لئے اس لقب
سے مشہور ہوئی،،[4] ۱۹/۱۷ ۲۲/۲۸ -

سُبَاتًا: آرام، راحت، تکان کا دفع کرنا، اصل میں
اس کے معنی راحت کے ہیں، اسی سے سَبَتَ یَسْبُتُ
(نصر) بضمِ مضارع آتا ہے، آیتِ شریف وَجَعَلْنَا
نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (اور بنایا نیند کو تمہاری تکان دفع کرنے
کے لئے) میں ابن الاعرابی نے سُبات کو بمعنی قطع کرنے
کے لیا ہے اور سبت کے معنی قطع کرنے کے ہیں، گویا
جب سو گیا لوگوں سے منقطع ہو گیا۔ زجاج کہتے ہیں،
سبات یہ ہے کہ حرکت سے منقطع ہو جائے اور روح
بدن میں موجود ہو پس معنی یہ ہیں "ہم نے تمہاری نیند کو
تمہارے لئے راحت بنایا۔[5]

راغب لکھتے ہیں سبات بمعنی قطعِ عمل ہے یہ راحت
کی، اس صفت کی طرف اشارہ ہے جس کا آیت لِتَسْكُنُوا
فِيهِ (تاکہ اس میں چین پکڑو) میں بیان ہے۔ ۱۰/۳ ۲۰/۱ -

[1] تاج العروس [2] معجم البلدان، ج ۵، ص ۲۴ (طبع مصر ۱۳۲۴ھ) [3] تاج العروس
[4] ارض القرآن ج ۱، ص ۲۳۶، ۲۳۷ (طبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۴۳ھ) [5] تاج العروس

سَبَبٍ: رسی، سامان، ذریعہ، ابوعبیدہ کہتے ہیں، ہر وہ رسی جو اوپر سے ڈالی جائے "سبب" ہے خالد بن عیینہ کا بیان ہے کہ جو مضبوط اور لمبی رسی ہو وہ "سبب" ہے اور جب تک اس کے ذریعہ اترا چڑھا نہ جائے سبب نہیں کہلاتی اور بعض کا قول ہے کہ اس وقت تک "سبب" سے موسوم نہیں ہوتی جب تک کہ وہ ایک طرف سے چھت یا اسی قسم کے کسی مقام میں لٹکی ہوئی نہ ہو[1] (ملاحظہ ہو اَسباب) ۱۷/۹ ۔

سَبَبًا ۱۶/۲ ۔

سَبْتِ: کام، کاج سے قطع تعلق کر لینا، سنیچر کی تعظیم کرنا، سنیچر کا دن، یوم شنبہ، اول معنی کے اعتبار سے مصدر ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے اسم جس کی جمع اَسْبُتٌ اور سُبُوْتٌ آتی ہے، علامہ زمخشری نے پہلے معنی اختیار کئے ہیں اور علامہ ابوحیان اندلسی نے دوسرے، چنانچہ زمخشری کشاف میں لکھتے ہیں :-

"سبت مصدر ہے سبتت الیھود کے معنی ہیں یہود نے شنبہ کے دن کی تعظیم کی،،[2]

اور ابوحیان البحر المحیط میں فرماتے ہیں :-

"السبت یوم معلوم (روز شنبہ) کا نام ہے اور یہ سَبْتٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی قطع کرنے کے ہیں اور یا سبات سے ہے جس کے معنی آسائش و راحت کے ہیں اور ابوالفرج ابن الجوزی نے کہا ہے کہ یہ خطاب ہے، کلام عرب میں سَبَت بمعنی اِستَرَاحَ کے معروف نہیں

ابن جریج کا بیان ہے کہ "یوم السبت" اس لئے نام پڑا کہ وہ زمانہ کا ایک قطعہ (ٹکڑا) ہے"[3]

علامہ مرتضیٰ زبیدی لغوی تاج العروس شرح قاموس میں رقمطراز ہیں :-

"السبت ہفتہ کا ایک مشہور دن ہے اور وہ ہفتہ کا ساتواں روز ہے[4] اور سبت اس کا اس لئے نام پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دن میں پیدائش کی ابتداء فرمائی اور زمین کی پیدائش کے ایک حصہ کو اسی دن میں قطع یعنی تمام کیا اور کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کو اس دن کام کاج کے قطع کرنے اور چھوڑ دینے کا حکم تھا اور محکم میں ہے کہ سبت اس لئے نام رکھا گیا کہ پیدائش کی ابتداء یکشنبہ کے دن سے ہوئی تھی جو جمعہ کے دن تک جاری رہی

---

[1] تاج العروس [2] تفسیر کشاف، ج۱، ص ۳۰۷ (طبع مصر) [3] البحر المحیط، ج۱، ص ۲۴۰ (طبع سعادۃ مصر ۱۳۲۸ھ)

[4] اردو میں اسی لئے اسے ہفتہ کہا جاتا ہے۔

اور شنبہ کو کسی چیز کی پیدائش عمل میں نہیں آئی، اہلِ لغت نے کہا ہے لہٰذا یوم السبت مسبتۃ ہوا یعنی تمام شدہ بایں طور کہ اس دن میں عمل منقطع ہو گیا۔" [۱]

علامہ موصوف نے سبت کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں تین توجیہیں ذکر فرمائی ہیں جن میں پہلی توجیہ یقیناً ناصحیح ہے کیونکہ اولاً تو اس میں اختلاف ہے کہ ہفتہ کے دن کسی چیز کی پیدائش عمل میں بھی آئی یا نہیں اور بر تقدیر صحت ہفتہ ہی کو سبت سے موسوم کرنا کیا معنی جب کہ بقیہ چھ دنوں میں سے ہر ایک دن میں کسی نہ کسی شے کی تخلیق تکمیل کو پہنچی ہے البتہ دوسری توجیہ قابلِ قبول ہے لیکن اصل میں سبت کی وجہ تسمیہ وہی ہے جو علامہ موصوف نے امام اللغۃ ابن سیدہ کی کتاب المحکم سے نقل کی ہے، ائمہ لغت کی تصریحات اسی کی تائید میں ہیں، ابو عبیدہ کہتے ہیں:۔

انما سمی سبتا لانہ سبت فیہ خلق کل شیئ و عملہ [۲]

سبت اسلئے نام رکھا گیا کہ اس میں ہر شے کی پیدائش کا کام قطع ہو چکا۔

امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں:۔

"حق تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش کی ابتدار یوم الاحد یعنی یک شنبہ کے دن سے فرمائی جیسا کہ ارشاد ہے چھ دن میں ان کو خلق فرما کر ہفتہ کو اپنا کام ختم فرما دیا لہٰذا اس دن کا نام "یوم السبت" پڑ گیا۔"

جوہری کا بیان ہے:۔

وسمی یوم السبت لانقطاع الایام عندہ [۳]

چونکہ دن اس پر ختم ہو جاتے ہیں اس لئے اس کا نام "یوم السبت" قرار دیا گیا۔

غرض آفرینش عالم کی ابتدا چونکہ اتوار کے دن سے عمل میں آتی ہے اس لئے وہ عالم کا پہلا دن یعنی یوم الاحد قرار پایا اور ہفتہ کے دن چونکہ پیدائش کا کام منقطع ہو گیا اس لئے انقطاع کے دن یعنی یوم السبت سے موسوم ہوا، یہود و نصاریٰ دونوں فرقوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ہفتہ کے ایک دن کو عید قرار دیا، یہود نے سنیچر کو پسند کیا اور نصاریٰ نے اتوار کو اور حق تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے یوم جمعہ کو مشروع فرمایا۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم پچھلے ہیں قیامت کے اگلے بس کتاب ان یہود و نصاریٰ کو پہلے مل گئی اور یہ یعنی جمعہ ان کا دن ہے جو ان پر مقرر

[۱] تاج العروس من جواہر القاموس ج ۱، ص ۵۷۴ (طبع خیریہ مصر ۱۳۰۶ھ، مادہ سبت) [۲] تاج العروس [۳] ایضاً

کیا گیا تھا تو انہوں نے اس میں اختلاف کیا اور اللہ نے ہمیں اس کی طرف رہنمائی فرمائی، اب لوگ اس میں ہمارے پیچھے ہیں، یہودی کل اور نصاریٰ پرسوں[1] اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ سے اللہ نے اگلوں کو بے خبر رکھا، یہودیوں کے لئے تو سنیچر ہوا اور نصرانیوں کیلئے اتوار اور اللہ ہمیں لایا تو ہمیں جمعہ کے دن کی ہدایت فرمائی اور جمعہ سنیچر اور اتوار مقرر ہوئے اور اسی طرح وہ لوگ قیامت کے دن ہمارے پیچھے ہوں گے ہم دنیا والوں میں اخیر ہیں اور قیامت کے دن اول کہ خلائق سے پہلے ہمارا ہی فیصلہ ہوگا[2]

امام رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں:-

"اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ آیا عقل میں کوئی ایسی وجہ ہے جو یہ بتلاتی ہو کہ جمعہ کا دن ہفتہ کے دن سے افضل ہے کیونکہ اہل ملل اس پر متفق ہیں کہ حق تعالےٰ نے چھ روز میں عالم کی تخلیق فرمائی یکشنبہ سے پیدائش وآفرینش کی ابتدار فرمائی اور جمعہ کے دن میں تکمیل ہوگئی، سنیچر کا دن فراغت کا دن ہوا، یہود تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ترکِ اعمال میں اپنے پروردگار کی موافقت کرتے ہیں، بدیں وجہ انہوں نے سبت کو معین کیا ہے اور نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ خلق وتکوین کی ابتدار تو ایک شنبہ سے ہوئی ہے اس لئے ہم اس دن کو عید قرار دیتے ہیں لہٰذا یہ دونوں وجہیں تو معقول ہیں پھر جمعہ کو ہمارے لئے عید مقرر کرنے کی کیا وجہ ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ جمعہ کا دن کامل ہونے اور تمام ہونے کا دن ہے اور تمام وکمال کا حاصل ہونا فرحِ کامل اور سرورِ عظیم کا موجب ہے لہٰذا اس بنا پر جمعہ کے دن کو عید قرار دینا اولیٰ ہے، واللہ اعلم"[3]

واضح رہے کہ اس امر میں علمار کا اختلاف ہے کہ آفرینشِ عالم کی ابتدار کس دن میں عمل میں آئی بعض شنبہ بتاتے ہیں اور بعض یکشنبہ اور اسکی وجہ اختلافِ روایات ہے، حافظ ابنِ کثیر البدایہ والنہایہ میں فرماتے ہیں:-

"ابنِ جریر نے اولِ ایام کے بارے میں تین اقوال نقل کئے ہیں اور محمد بن اسحاق سے ان کا بیان روایت کیا ہے کہ اہلِ توراۃ کہتے ہیں اللہ

---

[1] صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۲۰ (طبع مصطفائی ۱۳۰۷ھ) صحیح مسلم ج ۲، ص ۱۴۴۳ (طبع مصر ۱۳۳۶ھ) [2] صحیح بخاری ج ۱، ص ۱۴۶ (طبع مصر ۱۳۲۷ھ) [3] تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۳۶۳۔

نے آفرینش کی ابتدار یکشنبہ کو دیا ئی اور اہل انجیل کہتے ہیں دوشنبہ کو اللہ نے تخلیق شروع کی اور ہم مسلمان جیسا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے یوں کہتے ہیں کہ اللہ نے شنبہ کو پیدائش کا آغاز فرمایا۔

اور یہ قول جس کی ابن اسحٰق نے مسلمانوں سے حکایت کی ہے، فقہاء شافعیہ وغیرہم کی ایک جماعت اسی طرف مائل ہے اور ابھی اس بارے میں ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی حدیث خلق اللہ التربۃ یوم السبت (اللہ نے مٹی کو شنبہ کے دن پیدا فرمایا) آنے والی ہے۔

اور یکشنبہ کے قول کو ابن جریر نے بروایت سدی، ابومالک (رضی اللہ عنہ) اور بروایت ابی صالح، ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے اور بروایت مرہ، ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) اور صحابہ کی ایک جماعت نیز عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنہ) سے بھی روایت کیا ہے اور اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے اور یہی توراۃ کی تصریح ہے اور اسی کی طرف فقہاء کا دوسرا گروہ مائل ہے اور یہی لفظ احد سے زیادہ مشابہ ہے اور اسی بناء پر چھ دن میں پیدائش کی تکمیل ہوئی اور جمعہ ان کا آخری دن ہوا اور مسلمانوں نے ہفتہ میں اسے اپنے لئے عید قرار دیا۔[1]

حدیث مذکور جس کی طرف حافظ ابن کثیر نے اشارہ کیا ہے، مسند احمد بن حنبل، صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا اللہ نے مٹی کو شنبہ کے دن پیدا فرمایا اور پہاڑوں کو یکشنبہ کے دن اور درختوں کو دوشنبہ کے دن اور مکروہ یعنی ناپسند امور کو سہ شنبہ کے دن اور نور کو چہار شنبہ کے دن خلق فرمایا اور پنجشنبہ کے دن جانوروں کو منتشر فرمایا اور روز جمعہ بعد عصر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا جو آخری مخلوق ہیں اور جمعہ کی آخری ساعت میں عصر سے لیکر رات کے درمیان ان کی تخلیق عمل میں لائی گئی ہے یہ روایت ان تینوں کتابوں میں بروایت ابن جریج بایں اسناد مروی ہے ابن جریج اخبرنی اسماعیل بن امیۃ عن ایوب بن خالد عن عبداللہ بن رافع مولی ام سلمۃ عن ابی ہریرۃ نیز امام نسائی نے تفسیر میں بروایت ابن جریج عن عطاء بن ابی رباح عن ابی ہریرہ روایت کیا ہے[2]۔ حافظ ابن کثیر اس روایت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"ابن جریج پر اس حدیث میں اختلاف ہے،

[1] البدایہ والنہایہ، ج ۱، ص ۱۵ (طبع مصر مطبع کردستان العلمیہ ۱۳۴۸ھ)
[2] ایضاً ج ۱، ص ۱۷

علی بن المدینی، بخاری اور بیہقی وغیرہ حفاظ نے اس حدیث میں کلام کیا ہے، البخاری نے تاریخ میں کہا ہے کہ "بعض نے اس کو کعب سے بیان کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے" یعنی یہ حدیث ان روایتوں میں سے ہے جس کو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کعب سے سنا اور ان سے لیا ہے کیونکہ وہ دونوں حدیث کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے اور اٹھتے بیٹھتے تھے، یہ تو انہیں اپنے صحیفوں سے بتاتے اور وہ انہیں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے وہ باتیں نقل کرتے جو اس کی تصدیق میں ہوتیں، پس یہ حدیث وہ ہے جس کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کعب سے ان کے صحیفوں سے لی ہے پھر کسی راوی کو وہم ہوا اور اس نے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کر دیا اور یہ کہکر کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا" اس کے رفع کی اور تاکید کر دی۔

نیز اس کے متن میں سخت غرابت ہے منجملہ اس کے یہ کہ اس میں آسمانوں کے پیدا کرنے کا ذکر تک نہیں اور زمین اور زمین میں جو کچھ ہے سات روز میں اس کے پیدا ہونے کو بیان کیا ہے، اور یہ قرآن مجید کے خلاف ہے کیونکہ زمین چار دن میں پیدا ہوئی ہے پھر دو دن میں آسمانوں کو دھوئیں سے پیدا کیا گیا"۔ [1]

اور دوسرے قول یعنی یکشنبہ کو آغاز آفرینش ہونے کے بارے میں وہ حدیث ہے جو مستدرک حاکم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ نے زمین کو یکشنبہ اور شنبہ کے دن پیدا فرمایا اور پہاڑوں کو نیز ان منافع کو جو پہاڑوں میں ہیں سہ شنبہ کے روز بنایا اور درخت، پانی، شہر، آبادی اور ویرانہ کی چہار شنبہ کے روز تخلیق فرمائی، یہ چار روز ہوئے، ارشادِ عزوجل ہے قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ۝ تو کہہ کیا تم منکر ہو اس سے جس نے بنائی زمین دو دن میں اور برابر کرتے ہو اس کے ساتھ اوروں کو وہ رب ہے

[1] ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ، ج ۱، ص ۱۷

جہان کا اور رکھے اس میں بھاری پہاڑ اوپر سے اور برکت رکھی اس کے اندر اور ٹھہرائیں اس میں خوراکیں اس کی چار دن میں، پورا ہوا پوچھنے والوں کو) اور پنجشنبہ کے دن آسمان پیدا کیا اور جمعہ کے دن ستارے، آفتاب و ماہتاب اور فرشتے پیدا فرمائے، اب تین ساعتیں جمعہ کی باقی رہی تھیں کہ ان تین ساعتوں میں سے پہلی ساعت میں اجلیں پیدا فرمائیں کہ وقت پر مرتا ہے جسے موت آئی اور دوسری ساعت میں ہر اس شئے پر کہ جس سے لوگ منتفع ہوتے ہیں، آفت ڈالی اور تیسری میں حضرتِ آدم علیہ السلام کو پیدا فرما کر انہیں جنت میں بسایا اور ابلیس کو انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا اور آخری ساعت میں وہاں سے ان کا اخراج کر دیا یہود نے کہا پھر کیا ہوا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے فرمایا پھر وہ عرش پر قائم ہوا بولے اگر پوری بات کہتے تو ٹھیک تھا، کہنے لگے پھر آپ نے آرام لیا، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت غصہ آیا اور یہ آیت نازل ہوئی وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ (اور ہم نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے چھ دن میں اور ہم کو نہ ہوا کچھ تکان، سو تو سہتا رہ جو کچھ وہ کہتے ہیں)۔

حاکم نے لکھا ہے :۔

هٰذَا صحيح الاسناد ولم يخرجاه[1]	یہ حدیث صحیح الاسناد ہے مگر بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔

مگر حاکم کی تصحیح میں اہلِ فن کو کلام ہے، حافظ ابنِ کثیر فرماتے ہیں اس حدیث میں غرابت ہے[2]، اس حدیث کا ایک راوی ابو سعید بقال ہے، اس کے متعلق حافظ ذہبی تلخیص المستدرک میں ابنِ معین سے جو فنِ جرح و تعدیل کے امام ہیں، ناقل ہیں کہ لا یکتب حدیثہ[3] (اس کی حدیث نہ لکھی جائے)۔

غرض آفرینشِ عالم کے متعلق دنوں کی ترتیب و تعیین میں تو کوئی صحیح حدیث موجود نہیں البتہ سلف صحابہ و تابعین کی اکثریت اسی پر ہے کہ ابتداء آفرینش

---

[1] مستدرک حاکم، ج ۲، ص ۵۴۳ (طبع دائرۃ المعارف) واضح رہے کہ اس حدیث کو حاکم کے علاوہ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور نحاس نے ناسخ و منسوخ میں اور ابوالشیخ نے کتاب العظمۃ اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں نیز بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں روایت کیا ہے (ملاحظہ ہو الدر المنثور فی تفسیر الماثور، از سیوطی، ج ۵، ص ۱۳۶)۔

[2] تفسیر ابنِ کثیر، ج ۴، ص ۹۴

[3] تلخیص المستدرک، ج ۲، ص ۵۴۳

یکشنبہ کے دن سے عمل میں آئی بلکہ امام جریر طبری نے تو اس پر سلف کا اجماع نقل کیا ہے)۔ [۱]

پ ۲/۱ پ ۴/۵ پ ۲/۶ پ ۱۱/۹ پ ۲۲/۱۴۔

سَبْتِهِمْ : ان کا شنبہ منانا، ان کا سنیچر منانا، ان کا کام چھوڑ دینا، سبت مضاف ھم ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، یہود سنیچر کے دن کام چھوڑ دیتے اور اس دن کی تعظیم کرتے ہیں۔ پ ۱۱/۹۔

سَبَّحَ : اس نے پاکی بیان کی، تَسْبِيْحٌ سے جس کے معنی سُبْحَانَ اللہ کہنے اور اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، امام راغب لکھتے ہیں:

"سب چیزیں حق تعالیٰ شانہ کی تسبیح کرتی ہیں بعض کا سجدہ تسخیری ہوتا ہے اور بعض کا اختیاری آسمان، زمین اور رینگنے والے جانوروں کے متعلق اس بارے میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ وہ بالتسخیر تسبیح گذار ہیں کیونکہ ان کے احوال اللہ تعالیٰ کی حکمتِ کاملہ پر دال ہیں البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آسمان و زمین آیا اپنے اختیار سے بھی اللہ کی پاکی بولتے ہیں اور آیت اسی کی مقتضی ہے"۔

علامہ لغوی سید محمد مرتضیٰ زبیدی، تاج العروس شرح قاموس رقمطراز ہیں:۔

"اور کبھی تسبیح بول کر اس سے نماز اور ذکر اور تحمید اور تمجید مراد لی جاتی ہے اور نمازِ تسبیح سے اس لئے موسوم ہوئی کہ تسبیح کے معنی اللہ کی تعظیم کرنے اور ہر برائی سے اس کی تنزیہ یعنی پاکی بیان کرنے کے ہیں اور ارشادِ الٰہی فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ (سو پاک اللہ کی یاد کرو جب شام کرو اور جب صبح کرو) کی اسی معنی پر تفسیر کی گئی ہے کہ ان دونوں وقتوں میں اللہ ان کو نماز کا حکم فرماتا ہے اور فراء نے کہا ہے کہ حِيْنَ تُمْسُوْنَ مغرب و عشاء اور حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ نمازِ فجر اور عَشِيًّا نمازِ عصر اور حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ نمازِ اولیٰ یعنی ظہر ہے اور ارشاد ہے وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ (یعنی نماز پڑھ شام اور صبح)" (ملاحظہ ہو تَسْبِيْحَهٗ) پ ۱۷/۲۷ پ ۹/۴/۲۸۔

سَبِّحْ : تو تسبیح کر، تو پاکی بیان کر، تو عبادت کر، تَسْبِيْحٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، پ ۱۲/۳ پ ۶/۴ پ ۷/۱۶ پ ۳/۱۹ پ ۱۱/۲۴ پ ۱۷/۲۶ پ ۴، ۱۵، ۱۶/۲۷ پ ۶/۲۹ پ ۱۲، ۳۵/۳۰

[۱] تاریخ طبری، ج ۱ ص ۲۳ (طبع مصر)

سَبْحًا: مشغول ہونا، تیزی سے تیرنا، یہ سَبَحَ یَسْبَحُ کا مصدر ہے، امام راغب فرماتے ہیں:-

"سَبْحٌ کے معنی پانی اور ہوا میں تیز گزرنے کے ہیں، بولا جاتا ہے سَبَحَ، سَبْحًا، سَبَاحَةً اور حسبِ ذیل معانی میں بطورِ استعارہ استعمال ہوا ہے:

(۱) آسمان میں ستاروں کی گردش کے لئے جیسے وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (اور ہر کوئی ایک چکر میں پھرتے ہیں۔ (۲) گھوڑے کے دوڑنے کے لئے جیسے وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا (اور قسم ہے پیرنے والے گھوڑوں کی تیزی سے) (۳) کام میں جلد لگ جانے کے لئے جیسے اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (البتہ تجھ کو دن میں جلد شغل رہتا ہے لمبا)"

علامہ محمود آلوسی آیت اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا کی تفسیر میں لکھتے ہیں:-

"کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں" دن کو اپنے سونے اور حوائج میں مصروف ہونے کیلئے فراغت اور گنجائش ہے" اور بعض نے کہا ہے کہ اگر رات میں کچھ چھوٹ جائے تو تمہیں دن میں فراغت ہے تم اس کی تلافی کر سکتے ہو" پس سبح یعنی فراغ ہے اور لغت میں یہ اس معنی میں مستعمل ہے لیکن پہلے معنی (یعنی کام میں جلدی مشغول ہو جانا) عرب کے محاورہ سبح فی الماء کے زیادہ موافق اور موقع کے زیادہ مناسب ہیں۔" [۱] ۲۹/۱۲ ۳۰/۳۔

سُبْحٰنَ: پاک ہے، امام سیوطی الاتقان میں رقمطراز ہیں:-

"سبحان مصدر ہے بمعنی تسبیح (یعنی پاکی بیان کرنے کے)، نصب نیز مفرد کی طرف اضافت اس کو لازم ہیں خواہ مفرد اسم ظاہر ہو جیسے سُبْحٰنَ اللّٰهِ (اللہ پاک ہے) اور سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى (پاک ذات ہے جو لے گیا) یا اسمِ ضمیر سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ (اس کے لائق نہیں ہے کہ اس کے اولاد ہو) اور سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا (پاک ہے تو ہم کو معلوم نہیں) اور یہ ان مصادر میں سے ہے جن کے فعل کو مردہ کر دیا گیا ہے (یعنی کبھی استعمال نہیں کیا گیا) اور کرمانی کی عجائب میں ہے کہ "یہ غریب (یعنی اوپری سی بات) ہے جو مفضل نے بیان کی ہے کہ سبحان سَبَحَ کا مصدر ہے جب کہ دعا اور ذکر کے لئے

[۱] روح المعانی، ج ۲۹، ص ۱۰۵ (طبع منیریہ مصر)

اپنی آواز بلند کرے اور یہ شعر پیش کیا ہے ؎

قبح الالٰہ وجوہ تغلب کلما

سبح الحجیج وکبروا اھلالا

(اللہ تغلب کے مونہوں کو بگاڑے جب بھی حاجی زور سے دعا مانگیں اور چلّا کر تکبیر کہیں)

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سبحان اللہ کے معنی ہیں اللہ کی ذات کی ہر برائی سے پاکی بیان کرنا،، لہ

علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے قاموس میں سبحان کو معرفہ لکھا ہے یعنی وہ اس کی تسبیح کا علم جنس بناتے ہیں جیسے بُرّۃٌ (ایک گیہوں) بُرٌّ (گندم) کا علمِ جنس ہے اور اسی طرح دوسرے اعلامِ اجناس کہ جو معانی کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور صاحبِ قاموس نے جو اس کا علم ہونا بیان کیا ہے یہی مختار جاہیر ہے، قاضی بیضاوی، زمخشری، دمامینی اور بہت سے علماء بھی اسی کے مُقر ہیں، زجاج نے سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے اور اس کا نصب ایک پوشیدہ فعل کی بنا پر ہے جس کا اظہار متروک ہے

اصل یوں ہے اُسَبِّحُ اللّٰہَ سُبْحٰنَہٗ تَسْبِیْحًا (میں اللہ کی تسبیح کرتا ہوں) شیخ محمد فاسی لکھتے ہیں کہ یہ سبحان فعل کا قائم مقام ہو کر تنزیہ بلیغ یعنی ان برائیوں سے جن کو مشرکین حق تعالےٰ شانہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، پاک ہونے کو بتانے لگا، نضر بن شمیل کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا ایک شخص نے مجھ سے سبحان اللہ کی تفسیر بیان کی اس نے کہا کہ کیا تم محاورہ الفرس یسبح فی عنقہ (گھوڑا اپنی تیزی میں دوڑ رہا ہے) پر غور نہیں کرتے کہنے لگا سبحان اللہ کے معنی ہیں اللہ کی طرف لپکنا اور اس کی اطاعت میں چست رہنا۔

یہ واضح رہے کہ امام سیوطی نے جو یہ کہا ہے کہ سبحان کے فعل کو مردہ کر دیا گیا ہے اور مفصل نے جو اس سے فعل کے آنے کا ذکر کیا ہے تو تعجب کے ساتھ اسے کرمانی کی عجائب سے نقل کیا ہے اور اسی طرح ابن یعیش وغیرہ شارحین مفصل نے بھی لکھا ہے سو لائقِ اعتبار نہیں کیونکہ اس کا فعل مشہور ہے اور ارباب افعال اور دیگر علماء اس کو لائے ہیں ان کا بیان ہے کہ یہ سَبَّحَ مخفف سے ہے جیسے کہ شَکَرَ شُکْرانًا ہے اور ایک جماعت نے اس کو بھی جائز

لہ الاتقان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۱۶۳ (طبع مصر ۱۳۲۳ھ)

رکھا ہے کہ اس کا فعل سَبَّحَ ہو مشدد۔ مگر تیسری تصریح ضرور کرتے ہیں کہ یہ بعید از قیاس ہے کیونکہ اس کی کوئی نظیر نہیں، برخلاف اول کے کہ اس کی نظیریں بہت سی ہیں اگرچہ وہ بھی غیر مقیس ہے یعنی قاعدہ کے مطابق نہیں ہے۔[1] پ ۱۳/۶، پ ۱۵/۱، ۱۰، ۱۲، پ ۱۷/۲، پ ۱۸/۵، پ ۱۹/۱۶، پ ۲۰/۱۰، پ ۲۱/۵، پ ۲۳/۳، ۴، ۹، پ ۲۵/۷، ۱۳، پ ۲۷/۴، پ ۲۸/۶، پ ۲۹/۳۔

سُبْحٰنَكَ: تو پاک ہے، سبحان مضاف، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، پ ۱/۴، پ ۴/۱۱، پ ۷/۶، پ ۹/۱۴، پ ۱۱/۶، پ ۱۷/۶، پ ۱۸/۸، ۱۷، پ ۲۲/۱۱۔

سُبْحٰنَهٗ: وہ پاک ہے، سبحان مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، پ ۱/۱۴، پ ۶/۷، پ ۷/۱۸، پ ۱۰/۱۱، پ ۱۱/۷، ۲، پ ۱۳/۷، ۱۳، پ ۱۵/۵، پ ۱۶/۵، پ ۱۷/۲، پ ۲۱/۷، پ ۲۳/۱۵، پ ۲۴/۴۔

سَبَّحُوْا: انہوں نے تسبیح کی، انہوں نے پاکی بیان کی، تَسْبِيْحٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ (ملاحظہ ہو تَسْبِيْحًا اور سَبَّحَ) پ ۲۱/۱۵۔

سَبِّحُوْا: تم تسبیح پڑھو، تم پاکی بیان کرو، تم عبادت کرو، تَسْبِيْحٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ ۱۶/۴۔

سَبِّحُوْهُ: اس کی پاکی بولتے رہو، اس کی یاد کرتے رہو، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ ۲۲/۳۔

سَبِّحْهُ: تو اس کی تسبیح کر، اس کی پاکی بول، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے۔ (ملاحظہ ہو سَبِّحْ) پ ۲۶/۱۷، پ ۲۷/۴، پ ۲۹/۲۰۔

سَبُعٌ: درندہ، اَسْبُعٌ اور سِبَاعٌ جمع، امام راغب نے مفردات میں لکھا ہے:-

"درندہ کو سَبُعٌ اس لئے کہا گیا کہ اس کی قوت پوری ہوتی ہے اور سَبْعٌ بھی اعدادِ تامّہ میں سے ہے" پ ۶/۵۔

سَبْعَ: سات، ہفت، اسمِ عدد ہے مؤنث کے لئے آتا ہے، پ ۱/۳، پ ۳/۴، پ ۱۳/۱۶، پ ۱۵/۵، پ ۱۸/۱، ۱۵، پ ۲۴/۱۶، پ ۲۵/۱۸، پ ۲۹/۱، ۵، ۹، سَبْعًا پ ۲۴/۶، پ ۳۰/۱۔

سَبْعُوْنَ: ستر، اسمِ عدد ہے بحالتِ رفع سبعون ہوگا، پ ۲۹/۵۔

سَبْعَةٌ: سات، ہفت، اسمِ عدد ہے جو مذکر کے لئے آتا ہے، پ ۲/۸، پ ۱۴/۳، پ ۱۵/۱۵، پ ۲۱/۱۲۔

سَبْعِيْنَ: ستر، اسمِ عدد ہے، بحالت نصب و جر، سَبْعِيْنَ ہوگا۔ پ ۹/۹، پ ۱۰/۱۶۔

سَبَقَ: وہ پہلے ہو چکا، وہ پہلے گزر چکا، اس نے

[1] اس بحث کے تمام حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو: تاج العروس شرح قاموس۔

سبقت کی، سَبَقَ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب،
مِنَ اللّٰہِ سَبَقَ کا مطلب ہے اللہ کی طرف سے
پہلے سے مقرر ہو چکا اور ہو چکا، پ۹ پ۱۶ (ملاحظہ ہو
تَسْبِقُ) [illegible] ۔

سَبْقًا: آگے ہونا، پہلے ہونا، مقدم ہونا، سَبَقَ
یَسْبِقُ کا مصدر ہے، پ۳۰ ۔

سَبَقَتْ: پہلے سے ہو چکی، پہلے سے مقرر ہو چکی،
سَبَقَ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ۱۱
[illegible] ۔

سَبَقَکُمْ: اس نے تم سے پہلے کیا، اس نے تم سے
سبقت کی، سَبَقَ اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے
(ملاحظہ ہو سَبَقَ) [illegible] ۔

سَبَقُوْا: انہوں نے سبقت کی، وہ آگے نکل گئے،
سَبَقَ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ۱۰ ۔

سَبَقُوْنَا: وہ ہم سے پہلے دوڑے، انہوں نے
ہم سے سبقت کی، وہ ہم سے آگے ہوئے، اس میں
نا ضمیر جمع متکلم ہے، [illegible] ۔

سُبُلَ: راہیں، راستے، سَبِیْلٌ کی جمع، پ۷
[illegible] ۔

سُبُلَنَا: ہماری راہیں، ہمارے راستے، سُبُلَ
مضاف، نا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، [illegible] ۔

سُبُلًا [illegible] ۔

سَبِیْل: راستہ، راہ، "سبیل" اصل میں اس راہ
کو کہتے ہیں جو واضح ہو اور اس میں سہولت ہو، امام
راغب لکھتے ہیں:-

"سَبِیْلٌ کا استعمال ہر اس شے کیلئے ہوتا ہے جس کے
ذریعہ کسی شے تک پہنچا جا سکے خواہ وہ شے شر ہو
یا خیر، نیز واضح راستہ بھی اس سے مراد لیا جاتا ہے
یہ لفظ مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی،
ابن الاثیر نے کہا ہے کہ اس کی تانیث زیادہ غالب
ہے[1] اس کی تذکیر کا شاہد ارشادِ الٰہی وَاِنْ یَّرَوْا
سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ۚ وَاِنْ یَّرَوْا
سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ہے (کہ اس میں سبیل
کے لئے مذکر کی ضمیر لائی گئی ہے) اور تانیث کا شاہد
قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِیْرَةٍ
ہے (کہ ھٰذہ کے ذریعہ اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے
جو مؤنث کے لئے استعمال ہوتا ہے)

آیت شریفہ لَیَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ (اور ان
کو روکتے رہتے ہیں راہ سے) میں "سبیل" سے راہِ حق مراد
ہے کیونکہ اسمِ جنس کا جب مطلق ہو کر استعمال ہو تو وہ

[1] النہایہ فی غریب الحدیث والاثر، ج ۲، ص ۱۵۶ (طبع خیریہ مصر)

اس کے ساتھ مخصوص ہوگا جو حق ہو اور ایسے ہی ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ (پھر راہ آسان کردی اس کو) سے آیت کریمہ وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ (اور اللہ تک پہنچتی ہے سیدھی راہ اور بعضی راہ کج بھی ہے) میں سبیل سے کوئی ایک معین راستہ مراد نہیں کہ جو کج بھی ہو بلکہ یہاں یہ اسم جنس ہے سبیل

۱/۱۳، ۲/۶، ۱۰، ۳/۱۶، ۵/۳، ۴، ۹، ۱۱، ۱۴، ۶/۷، ۱۳، ۱۴، ۷/۱۲
۹/۷، ۱۰/۱، ۱۸، ۱۱/۱۳، ۱۳/۱۱، ۱۴/۵، ۷، ۲۲، ۱۵/۳، ۱۸/۱۷، ۱۹/۱۷
۲۰/۶، ۱۵، ۱۶، ۲۱/۷، ۱۱، ۱۷، ۲۴/۷، ۹، ۱۰، ۲۵/۵، ۶، ۲، ۲۸/۴، ۷
۲۹/۱۹، ۳۰/۵ -

سَبِيلًا ۴/۱، ۱۳، ۵/۳، ۵، ۹، ۱۱، ۱۷، ۱۸، ۶/۱، ۹/۷، ۸
۱۵/۴، ۵، ۸، ۹، ۱۲، ۱۸/۱۶، ۱۹/۱، ۲، ۳، ۲۲/۵، ۲۹/۱۳، ۲ -

سَبِيلِ اللَّهِ: راہِ خدا، اللہ کی راہ، سَبِيل مضاف اللہ مضاف الیہ، حافظ ابو السعادات ابن الاثیر الجزری لکھتے ہیں :-

"سبیل اللہ لفظ عام ہے جو ہر اس خالص عمل کیلئے آتا ہے جس کی بدولت حق کے تقرب کے راستہ پر فرائض، نوافل اور انواع عبادات کی ادائیگی کے ذریعہ گامزن ہوا جائے اور جب یہ مطلق استعمال ہو تو بیشتر جہاد کے معنی میں آتا ہے حتیٰ کہ کثرتِ استعمال کی بنا پر ایسا ہوگیا کہ گویا اسی معنی میں منحصر ہو"[1]

۲/۳، ۸، ۱۱، ۱۶، ۳/۴، ۵، ۱۰، ۴/۱، ۶، ۸، ۵/۷، ۸، ۱۰، ۶/۲، ۳، ۱۲
۸/۱، ۱۳، ۱۹، ۹/۱۸، ۱۰/۲، ۴، ۶، ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۴، ۱۷، ۱۱/۳، ۴
۱۲/۲، ۱۳/۱۳، ۱۴/۸، ۱۹، ۱۷/۸، ۱۰، ۱۸/۹، ۲۱/۱۰، ۲۳/۱۱، ۲۶/۵، ۸، ۱۴
۲۷/۱۷، ۲۸/۳، ۱۰، ۱۳، ۲۹/۱۴ -

سَبِيلِكَ: تیری راہ، تیرا راستہ، سبیل مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۱۴/۱۲، ۲۴/۶ -

سَبِيلَنَا: ہماری راہ، ہمارا راستہ، سَبِيلَ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، ۳۰/۱۳ -

سَبِيلِهِ: اس کی راہ، ان کا راستہ، سبیل مضاف ہ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، ۱/۱۰
۸/۱، ۶، ۱۰/۸، ۹، ۱۳/۱۷، ۱۴/۲۲، ۱۵/۲۱، ۲۳/۱۵، ۲۷/۶
۲۸/۹، ۲۹/۳ -

سَبِيلِهِمْ: ان کی راہ، ان کا راستہ، سَبِيل مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۱۰/۷ -

سَبِيلِي: میری راہ، میرا راستہ، سَبِيل مضاف ی ضمیر واحد متکلم، مضاف الیہ، ۷/۱۱، ۱۳/۶، ۲۸/۷ -

فصل التاء المثناة

سِتْرًا: حجاب، پردہ، سُتُور اور أَسْتَار جمع، ۱۶/۲

[1] ماخوذ از النہایہ فی غریب الحدیث والاثر

سِتَّةِ: چھ، اسم عدد ہے، مذکر کے لئے استعمال ہوتا ہے سِتَّۃٌ اصل میں سِدْسَۃٌ تھا، سین کو تا سے بدلا اور پھر دال کا اس میں ادغام کر دیا گیا، پ ۸/۱۴، پ ۱۱/۶، پ ۱۲/۱، پ ۱۹/۳، پ ۲۱/۱۴، پ ۲۶/۱۷، پ ۲۷/۱۷۔

سِتِّيْنَ: ساٹھ، اسم عدد ہے، سِتَّۃٌ سے مشتق ہے، پ ۲۸/۱۔

فصل الجیم المعجمہ

سَجَدَ: اس نے سجدہ کیا، سُجُوْدٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، حضرتِ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے متعلق بعض نے تو یہ کہا ہے کہ فرشتوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ حضرتِ آدم علیہ السلام کو قبلہ قرار دیں اور بعض کا قول ہے کہ حضرتِ آدم علیہ السلام کے سامنے فروتنی کرنے اور ان کی اولاد کی مصالح کا بندوبست کرنے کا ان کو حکم ہوا تھا، سو بجز ابلیس کے سب نے حکم مانا، [1] (ملاحظہ ہو اُسْجُدْ) پ ۱۴/۳، پ ۲۳/۱۴۔

سُجَّدًا: سجدہ کرنے والے، سَاجِدٌ کی جمع، آیتِ شریفہ اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا (اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے) میں جھکتے ہوئے اطاعت شعارانہ داخل ہونا مراد ہے، امام سیوطی واسطی سے اس آیت کی تفسیر میں ناقل ہیں کہ سریانی میں سُجَّدًا کے معنی ہیں سر جھکانے والے اور وَخَرُّوْا لَہٗ سُجَّدًا (اور سب گرے اس کے آگے سجدہ میں) میں سجدہ تعظیمی مراد ہے، سجدہ عبادت نہیں اور اخفش نے جو نحو و لغت کے امام ہیں، فرمایا ہے کہ یہاں خَرُّوْا یعنی مَرُّوْا (یعنی گزرنے) کے ہے، گرنے اور زمین پر پڑنے کے معنی میں نہیں، ان کے قول پر آیت کا ترجمہ یوں ہوگا "وہ ان کے لئے جھکے ہوئے گزرے" پ ۱/۶، پ ۷/۲، پ ۹/۱۰، پ ۱۳/۵، پ ۱۴/۱۲، پ ۱۵/۱۲، پ ۱۶/۱۲،۷، پ ۱۹/۴، پ ۲۱/۱۵، پ ۲۶/۱۲۔

سَجَدُوْا: انہوں نے سجدہ کیا، سُجُوْدٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۱/۴، پ ۵/۱۲، پ ۸/۹، پ ۱۵/۱۹،۷، پ ۱۶/۱۶۔

سُجِرَتْ: وہ آگ سے بھر دی گئی، اس کا پانی بہایا گیا، وہ خالی کی گئی، وہ پُر کی گئی، تَسْجِيْرٌ سے جس کے معنی زور سے آگ بھڑکانے اور بہانے، خالی کرنے اور پُر کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، امام فخرالدین رازی آیۂ شریفہ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (اور جب دریا جھونکے جائیں گے) کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:–

"یہ بالتخفیف بھی پڑھا گیا ہے اور بالتشدید بھی (یعنی سُجِرَتْ بھی اور سُجِّرَتْ بھی) اور اس میں

---

[1] الاتقان، ج ۱، ص ۱۳۸ [2] تاج العروس

مختلف وجہیں ہیں۔

(۱) اصل کلمہ سجرت التنور سے ہے جو تنور جھونکنے اور اس میں آگ بھڑکانے کے لئے آتا ہے اور کسی چیز میں جب آگ بھڑکائی جاتی ہے تو جو کچھ رطوبت اس میں ہوتی ہے وہ خشک ہو جاتی ہے تو اس وقت سمندروں میں ذرا سا پانی بھی نہیں بچے گا، پھر چونکہ حسب تصریح وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ (اور چلائے جائیں گے پہاڑ) پہاڑ چلائے جائیں گے اس لئے اس آن سمندر اور زمین انتہائی حرارت اور سوزانی میں ایک شے بن جائیں گے اور یہ بھی احتمال ہے کہ جب سمندروں کے پانی سوکھ جائیں تو زمین ابھر کر اور مرتفع ہو کر پہاڑوں کی چوٹیوں کے برابر ہو جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ جب پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ان کے اجزاء منتشر ہوں اور وہ مٹی کی طرح ہو جائیں تو وہ مٹی سمندروں کی تہ میں جا پہنچے اور سطح زمین سمندروں کے ساتھ برابر ہو جائے اور سب مل کر ایک دہکتا ہوا سمندر بن جائے۔

(۲) سجرت بمعنی فجرت ہو جو پانی کے رواں ہونے کے لئے آتا ہے اور یہ اس طرح کہ چونکہ حسب ارشاد مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ، بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (چلائے دو دریا مل کر چلنے والے، ان دونوں میں ہے ایک پردہ جو ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے) سمندروں کے مابین آڑ ہے پس جب اللہ اس آڑ کو ہٹا دیگا، ایک دوسرے میں رواں ہونے لگے گا اور سارے سمندر ایک سمندر بن جائیں گے، کلبی کا قول یہی ہے۔

(۳) سجرت بمعنی اوقدت یعنی آگ بھڑکانے کے ہے قفال نے کہا ہے کہ اس کی تاویل میں مختلف وجوہ کا احتمال ہے، اول یہ کہ جہنم سمندروں کی تہوں میں ہو اس لئے سمندر اس وقت تو اس لئے نہیں دہکتے کہ دنیا کو قائم رکھنا ہے لیکن جب دنیا کی مدت ختم ہو جائیگی، حق تعالیٰ شانہ اس آگ کی تاثیر کو سمندروں تک پہنچا دیگا اور اس لئے وہ پورے طور پر کھولنے لگ جائیں گے دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو سمندر میں ڈال دیگا اور سمندر کھول اٹھیں گے۔ سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ سمندروں میں آتش عظیم پیدا فرمائیگا کہ پانی ابل جائینگے۔ میں (یعنی امام رازی) کہتا ہوں کہ ان سب وجہوں میں تکلف سے کام لیا گیا ہے، ان میں سے کسی کی بھی حاجت نہیں کیونکہ جو دنیا کی تخریب اور

قیامت کے قائم کرنے پر قادر ہے یقیناً وہ اس پر بھی قادر ہے کہ سمندروں کے ساتھ جو چاہے کرے، ان کو کھولا دے یا ان کے پانیوں کو آگ کی شکل میں بدل ڈالے بغیر اس کے کہ اسے ان میں آفتاب و ماہتاب ڈالنے کی حاجت ہو یا ان کے نیچے جہنم کی آگ ہو[1]"۔ پ ۳۰

سِجِلّ: کاغذ کا طومار، صحیفہ، محضر، وثیقہ، لکھنے والا مرد، ایک شخص کا نام، سِجِلَّاتٌ جمع، یہ ان اسماء میں ہے کہ باوجود مذکر ہونے کے ان کی جمع الف تا کے ساتھ آتی ہے[2] جو جمع مؤنث سالم کا وزن ہے۔

علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں:-

"اس میں اختلاف ہے کہ آیا یہ لفظ عربی ہے یا معرب (یعنی دوسری زبان سے عربی میں لایا گیا) ہے پس بصرہ والے تو اس طرف گئے ہیں کہ یہ عربی ہے اور ابو الفضل رازی نے کہا ہے کہ اصح یہ ہے کہ یہ فارسی سے معرب ہے۔"[3]

ابن جنی نے جو نحو و عربیت کے امام ہیں المحتسب میں سجل کے معنی کتاب یعنی نوشتہ کے نقل کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ایک قوم نے اس کو فارسی سے معرب کہا ہے[4]۔ امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں کہ:-

"اس کی اصل جیسا کہ بیان کیا گیا ہے فارسی ہے جس کو عربی کر لیا گیا ہے اور سجل کو پتھر بنایا گیا ہے جس پر تحریر کیا جاتا تھا بعد میں ہر وہ شے جس پر لکھا جانے لگا اس کا نام سجل پڑ گیا۔"

اس لحاظ سے سجل فارسی لفظ سنگ کا معرب ہے اور ابن مردویہ نے بطریق ابی الجوزاء حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ حبشی زبان میں اس کے معنی شخص کے ہیں[5]، امام لغت زجاج کا بھی یہی بیان ہے۔[6]

امام ابن جریر طبری اپنی مشہور تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن میں رقمطراز ہیں:-

"جس سجل کا حق تعالیٰ نے یہاں ذکر فرمایا ہے اہل تاویل اس کے معنی میں مختلف ہیں، بعض کا قول ہے کہ وہ ایک فرشتہ کا نام ہے، کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ وہ ایک کاتب تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کتابت کی خدمت انجام دیا کرتے تھے[7]، دیگر حضرات

---

[1] تفسیر کبیر، ج ۸، ص ۳۸۳، ۳۳۹ (طبع شرفیہ مصر ۱۳۲۴ھ) [2] تاج العروس [3] روح المعانی ج ۱۷ ص ۹۱ (طبع منیریہ مصر)
[4] الاتقان از سیوطی ج ۱ ص ۱۳۸ (طبع مصر ۱۳۴۳ھ) [5] ایضاً [6] غرائب القرآن و رغائب الفرقان از نظام الدین نیشاپوری ج ۱۷ ص ۶۰ (برحاشیہ تفسیر طبری)

یہ کہتے ہیں کہ سجل وہ صحیفہ ہے جس میں لکھا جاتا ہے
(پہلے قول کو ابن جریر نے حضرتِ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما
اور سدی سے اور دوسرے کو حضرت ابن عباس
رضی اللہ عنہما سے اور تیسرے کو حضرتِ ابن عباس
رضی اللہ عنہما اور مجاہد سے روایت کیا ہے
اور اس کے بعد فرمایا ہے کہ) اور اس بارے
میں ہمارے نزدیک سب اقوال میں صحت کے
اعتبار سے اولیٰ اس شخص کا قول ہے جس نے سجل کو
اس جگہ بمعنی صحیفہ بیان کیا ہے کیونکہ یہی معنے
کلام عرب میں معروف ہیں اور ہمارے نبی صلی اللہ
علیہ وسلم کے لئے کسی ایسے کاتب کا پتہ نہیں چلتا
کہ جس کا نام سجل ہو اور نہ فرشتوں میں کوئی ایسا
فرشتہ ہے کہ جس کا یہ نام ہو[1]

واضح رہے کہ ابن مندہ، ابونعیم، ابن مردویہ،
خطیب اور ابن عساکر حضرتِ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ
سے راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کا ایک کاتب تھا جس کو سجل کہا جاتا تھا سو اللہ
تعالیٰ نے نازل فرمایا یَوْمَ نَطْوِی السَّمَاءَ
كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (جس دن ہم لپیٹ دیں گے
آسمان کو جس طرح کہ سجل کا لپیٹنا ہے نوشتوں کو)[2]

خطیبِ بغدادی نے تاریخِ بغداد میں اس حدیث
کو روایت کر کے بروایت برقانی حافظ ابوالفتح ازدی
سے نقل کیا ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو ابن نمیر اس
میں منفرد ہیں[3]۔ حافظ ابن حجر عسقلانی الاصابہ میں
لکھتے ہیں کہ "ابن نمیر کبارِ ثقات میں سے ہیں اور یہ
حدیث ان طرق سے صحیح ہے اور اس سے غفلت
ہوئی جس نے یہ زعم کیا یہ حدیث موضوع ہے"[4]
لیکن حافظ صاحب کا یہ فرمانا اسناد کے اعتبار سے
تو ممکن ہے اسے تسلیم کر لیا جائے لیکن متن بہرحال
نکارت سے خالی نہیں، حافظ ابن کثیر نے صاف
تصریح کی ہے:-

وھذا منکر جدا — "یہ ابنِ عمر سے بروایتِ
من حدیث نافع — نافع سخت منکر ہے
عن ابن عمر — ہرگز صحیح نہیں ہے"
لا یصح اصلا[5]

اسی طرح ابوداؤد اور نسائی وغیرہ کی وہ روایت
جو انہوں نے حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے
یہ کی ہے کہ سجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

[1] جامع البیان المعروف بتفسیر ابن جریر طبری، ج ۱۷، ص ۱۰۷، (طبع میمنیہ مصر) [2] تفسیر فتح القدیر، ج ۳، ص ۴۱۸ (طبع مصر ۱۳۵۰ھ)
[3] تاریخ بغداد، ج ۸، ص ۱۷۵ (طبع سعادۃ مصر ۱۳۴۹ھ) [4] الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ، ج ۳، ص ۶۵ (طبع شرفیہ مصر ۱۳۲۵ھ)
[5] ملاحظہ ہو الدر المنثور فی تفسیر بالمأثور از امام سیوطی، ج ۴، ص ۳۴۰ (طبع مصر)

کے کاتب تھے اور بیہقی نے اس کی تصحیح بھی کی ہے صحیح نہیں بلکہ موضوع ہے چنانچہ حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں :-

"اور اسی طرح ابنِ عباس سے بروایت ابی داؤد وغیرہ جو گزرا وہ بھی صحیح نہیں، حفاظ کی ایک جماعت نے اس کے موضوع ہونے کی تصریح کی ہے اگرچہ وہ ابو داؤد کی سنن میں موجود ہے منجملہ ان کے ہمارے شیخ حافظ کبیر ابو الحجاج مزی ہیں اور بحمداللہ اس حدیث پر ایک مستقل جزء لکھا ہے اور امام ابو جعفر بن جریر اس روایت پر انکار کے درپے ہیں، انہوں نے اس کی پورے طور پر تردید کی ہے، ان کا بیان ہے کہ صحابہ میں کسی ایسے شخص کا پتہ نہیں چلتا کہ جس کا نام سجل ہو حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاتب معروف ہیں، ان میں کوئی ایسا شخص نہیں کہ جسکا نام سجل ہو، اللہ ان پر رحم فرمائے! انہوں نے اس بارے میں بالکل صحیح فرمایا ہے اور یہ بس حدیث کی نکارت پر سب سے قوی دلیل ہے اور جس نے بھی اسماء صحابہ میں سجل کا ذکر کیا ہے اس نے اسی حدیث پر اعتماد کیا ہے کسی اور چیز پر نہیں، واللہ اعلم۔ اور صحیح ابنِ عباس سے یہی ہے کہ سجل صحیفہ ہی ہے، علی بن ابی طلحہ اور عوفی ان سے یہی روایت کرتے ہیں۔ مجاہد، قتادہ اور بہت سے علماء نے اسی کی تصریح کی ہے اور ابنِ جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے کیونکہ لغت میں یہی مشہور ہے پس اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ "جس دن کہ ہم لپیٹ لیں آسمان کو جیسے لپیٹتے ہیں صحیفہ میں نوشتے"۔

قاضی شوکانی نے تفسیر فتح القدیر میں لکھا ہے کہ یہ کہنا کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے بس یہی صحیح ہے (یعنی سجل کا معنی صحیفہ ہونا) درست نہیں

کیونکہ علی بن ابی طلحہ اور عوفی دونوں ضعیف ہیں لہٰذا اولیٰ یہ ہے کہ معنی لغوی ہی پر اعتماد کیا جائے۔[۱] لیکن واضح رہے کہ علی بن ابی طلحہ وہ ہیں جن پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایات کے باب میں امام بخاری نے اپنی صحیح میں اعتماد کیا ہے اور عوفی کی روایات کی امام ترمذی نے تحسین کی ہے۔[۲]

علاوہ ازیں سجل کو اگر کسی کاتب کا نام مانا جائے تو تشبیہ میں حسن نہیں رہتا۔ بہرحال لغت کے اعتبار سے بھی اور روایت کے اعتبار سے بھی اولیٰ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنے صحیفہ کے لئے جائیں۔ پ ۱۷۔

سِجْنٌ: قید خانہ، محبس، سُجُوْنٌ جمع پ ۱۲، ۱۳۔

سُجُوْدٌ: سجدہ کرنا، سر زمین پر رکھنا، فروتنی کرنا، یہ سَجَدَ یَسْجُدُ کا مصدر ہے۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ کبھی سجود کی تعبیر نماز سے بھی کی جاتی ہے۔ ارشاد ہے وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (اور نماز کے پیچھے) اور صلاۃ الضحیٰ کو سبحۃ الضحیٰ اور سجود الضحیٰ بھی کہتے ہیں۔ پ ۲۶، ۲۹۔

سُجُوْدٌ: سجدہ کرنے والے، سَاجِدٌ کی جمع پ ۱، ۱۷، ۲۶۔

سَجٰی: وہ چھا گیا، اس نے آرام لیا، اس نے قرار پکڑا (نصر)، سُجُوٌّ سے جس کے معنی سکون پانے اور قرار پکڑنے کے ہیں۔ ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، علامہ حسین بن محمد معروف با بن خالویہ لکھتے ہیں کہ:-

"جب رات میں ہوا تھم جائے اور اسکی اندھیاری سخت بڑھ جائے تو کہا جاتا ہے لیل ساج اسی طرح جب سمندر تھم جاتا ہے تو بحر ساج بولتے ہیں۔"[۱] پ ۳۰۔

سِجِّیْلٌ: کنکر، یہ وہی فارسی کا سنگ و گل ہے جو عربی میں آکر سجیل بن گیا ہے۔ فریابی نے مجاہد سے یہی نقل کیا ہے۔[۲] پ ۱۲، ۱۴، ۳۰۔

سِجِّیْنٌ: سجین، قید خانہ، ابو حاتم نے کتاب الزینۃ میں ذکر کیا ہے کہ یہ لفظ غیر عربی ہے، امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں:-

"سجین آیا شئے معین کے لئے اسم علم ہے یا کسی معنی سے اسم مشتق ہے، اس بارے میں دو قول ہیں۔

اول جمہور مفسرین کا قول ہے کہ یہ شئے معین کا علم ہے پھر اس سے شئے معین میں اختلاف ہے اکثر تو اس طرف ہیں کہ ساتویں زمین زیر زمین ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما

---

[۱] اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم ص ۱۱۶ (طبع دار الکتب المصریہ)
[۲] الاتقان ج ۱، ص ۱۳۸ (طبع مصر)

دکا بروایت عطا رہیں) قتادہ، مجاہد، ضحاک اور ابن زید کا یہی قول ہے حضرت براء رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا سجّین ساتوں زمینوں میں سب سے نیچے ہے، عطاء خراسانی کا بیان ہے کہ ابلیس اور اس کی ذریت اسی میں ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سجّین جہنم میں ایک گڑھا ہے، کلبی اور مجاہد نے کہا ہے کہ سجّین ساتویں زمین کے نیچے ایک چٹان ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مشتق ہے اور سجّین بروزن فِعّیل، سَجْنٌ سے جس کے معنی حبس اور تضییق (یعنی روکنے، قید کرنے اور تنگ کرنے) کے ہیں، اسی طرح اسم قرار دیا گیا ہے جس طرح کہ فِسق سے فِسّیقٌ بولا جاتا ہے ابوعبیدہ، مبرا اور زجاج کا یہی قول ہے واحدی کا بیان ہے کہ یہ قول ضعیف ہے اور اس امر کی دلیل کہ اہل عرب سجّین کو نہیں جانتے آیۂ شریفہ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ (اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے سجّین) ہے یعنی سجّین اس میں سے نہیں جسے تم اور تمہاری قوم جانتی ہو (امام رازی کہتے ہیں) اور میں اس کو ضعیف نہیں بتاتا کیونکہ شاید یہ سجّین کے معاملہ کی عظمت کے لئے بیان کیا گیا ہو جیسے ارشاد الٰہی وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے دن انصاف کا) میں ہے۔ ؔ[1]

شیخ اسمٰعیل حقی بروسوی لکھتے ہیں:-

"سجّین اس جامع کتاب کا علم ہے جو شر کا دفتر ہے جس میں شیاطین نیز کافران و فاسقان جن و انس کے اعمال مدون ہیں، یہ لفظ حاتم کی طرح صفت سے نقل کر لیا گیا ہے اور منصرف ہے کیونکہ اس میں صرف ایک ہی سبب ہے یعنی معرفہ ہونا اور اس کی اصل فِعّیلٌ ہے سَجْنٌ سے سَاجِنٌ کا مبالغہ ہے[ع] یا چونکہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے اسے ساتویں زمین کے نیچے تاریک اور وحشتناک مقام پر ڈال دیا گیا ہے نیز ابلیس اور اس کی ذریت کا ان کی تذلیل اور تحقیر کی بنا پر مسکن ہے اور وہاں راندہ درگاہ شیاطین

[1] تفسیر کبیر مسمّٰی بہ مفاتیح الغیب، ج ۸، ص ۳۵۲ (طبع مصر)

[ع] بمعنی بہت روکنے اور قید کرنے والے کے کیونکہ یہ دوزخیوں کو جہنم میں روکنے اور قید کرنے کا سبب ہے۔

پہنچتے رہتے ہیں جس طرح کہ نیکوں کے نوشتوں
پر فرشتگانِ مقرب حاضر ہوتے ہیں لہٰذا سجین
سجون کا مبالغہ ہے۔" [1]

قاضی محمد بن علی شوکانی فرماتے ہیں :-

"سجین کے نون میں علماء نے اختلاف کیا ہے
بعض نے کہا ہے کہ اصلی ہے اور اس کا اشتقاق
سجن سے ہے جس کے معنی حبس کے ہیں اور یہ
مبالغہ کا وزن ہے جیسے خِمّیرٌ سِکّیرٌ اور
فِسّیقٌ، خمر، سکر اور فسق سے ہیں۔ ابو عبیدہ
مبرد اور زجاج نے ایسا ہی بیان کیا ہے،
واحدی نے کہا ہے کہ یہ کمزور بات ہے
کیونکہ عرب سجین سے واقف نہ تھے اور
اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ان ائمہ کا بیان
کرنا، خود دلیل قائم کرنا اور یہ بتلانا ہے کہ یہ لفظ
عربی زبان کا ہے اور اسی میں سے ابن مقبل
کا شعر ہے ؎

ورفقة يضربون البيض ضاحية
ضربا تواصت به الابطال سجينا

اور بعض کا قول ہے کہ نون لام کے بدلہ میں ہے
اصل میں سجیل تھا جو سجل سے مشتق ہے جس کے
معنی نوشتہ کے ہیں۔" [2] ۳۰ : ۸

فصل الحاء المهملة

سَحَابٌ : بادل، سحاب ابر کو کہتے ہیں خواہ اس
میں پانی ہو یا نہ ہو اور کبھی لفظ سحاب ذکر کرکے بطور
تشبیہ اس سے سایہ اور اندھیرا بھی مراد لیا جاتا ہے
ارشاد ہے اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِىْ بَحْرٍ لُّجِّىٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ
مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌۢ
بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ (یا جیسے اندھیرے گہرے دریا میں کہ چڑھی
آتی ہے اس پر ایک لہر اس پر ایک اور لہر اس کے اوپر
بادل (یعنی اندھیرا بادل) اندھیرے ہیں ایک پر ایک)
اصل میں سَحْبٌ کے معنی کھینچنے کے ہیں اسی سے
سحاب ہے کیونکہ ہوا اس کو کھینچ کر لے چلتی ہے
یا اس لئے کہ یہ پانی کو کھینچ کر لاتا ہے یا اس بنا پر کہ
یہ خود اپنی روانی میں کھنچا چلا آتا ہے۔ اصمعی نے جو
لغتِ عربیت کے امام ہیں کتاب السحاب میں لکھا
ہے کہ :-

"سحاب اسم جنس جمعی ہے، اس کا واحد سحابۃ

---

[1] تفسیر روح البیان، ج ۳، ص ۳۶۶ (طبع استنبول)
[2] تفسیر فتح القدیر، ج ۵، ص ۳۸۸ (طبع مصر)

عہ یعنے محبوس و مقید کے کیونکہ ساتویں زمین میں مقید پڑا ہوا ہے۔

ہے، یہ مذکر بھی آتا ہے اور مؤنث بھی، مفرد بھی استعمال

ہوتا ہے اور جمع بھی" لہ

فرید وجدی لکھتے ہیں:-

"لفظ کی رعایت سے اس کی صفت مفرد آتی

ہے جیسے ارشادِ الٰہی وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ

بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (اور بادل جو کہ تابعدار

ہے اس کے حکم کا درمیان آسمان اور زمین کے)

اور معنی کی رعایت سے جمع بھی لائی جاتی ہے

جیسے وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (اور اٹھاتا

ہے بادل بھاری)" لہ

اسی طرح تذکیر کی مثال آیتِ مذکورہ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ

اور تانیث کی حتّٰی اِذَا اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا ہے،

تانیث جمع ہونے ہی کی وجہ سے ہے، اس کی جمع

سُحُبٌ آتی ہے، لسان العرب میں ہے، مناسب

یہ ہے کہ سُحُبٌ سَحَابٌ کی جمع ہو جو سَحَابَۃٌ کی جمع

ہے پس سُحُبٌ جمع الجمع ہے۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے عمامۂ مبارک کا نام سحاب تھا جو ہوا میں

(شملہ کے) اڑنے کے سبب بادل سے تشبیہ کی

بنا پر اس نام سے موسوم ہوا، ۳۲/۵، ۴۳/۲۴، ۱۳/۸، ۲/۴۴

۲۷/۲۷۔ سَحَابًا ۷/۵۷، ۳۰/۴۸، ۲۴/۴۳۔

سَحَّارٌ: بڑا جادوگر، سِحْرٌ سے بروزن فَعَّالٌ

مبالغہ کا صیغہ ہے، ۲۶/۳۷۔

سُحْتٌ: حرام، اصل میں وہ چھلکا جسے جڑ سے

اکھیڑ لیا جائے سَحْتٌ ہے اور اسی سے سُحْتٌ کا

استعمال اس ممنوع فعل کے لئے ہوتا ہے کہ جس

کے مرتکب کو عار دامن گیر ہو، گویا وہ اپنے دین و مروت

کی جڑ کاٹتا ہے، مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں:-

"گفتگو میں یہ کبھی مکروہ کے لئے آتا ہے اور کبھی

حرام کے لئے اور قرآن سے اس کا پتہ

چلتا ہے" لہ

ارشادِ الٰہی ہے اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (بڑے حرام

کے کھانے والے ہیں) ہیں سُحْتٌ بمعنی حرام ہے یعنی وہ

چیز جو انسان کے دین کا ناس کرنے والی ہے، اور حدیث

کسب الحجام سحت (پچھنے لگانے والے کی کمائی

سحت ہے) یعنی سحت بمعنی مکروہ ہے یعنی یہ کمائی

مروت کو ختم کرنے والی ہے دین کو نہیں کیونکہ حضور

علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو اونٹنی کے چارہ اور

لہ تاج العروس شرح قاموس

لہ دائرۃ المعارف، فرید وجدی، مادہ سحب

لہ تاج العروس شرح قاموس

غلاموں کو کھانا کھلانے میں صرف کرنے کی اجازت دی ہے[1] ۔ ﷺ ۱۳/۱۰/۶

سحر : جادو، جادو کرنا، سَحَرَ یَسْحَرُ کا مصدر ہے یہ مصادر شاذہ میں ہے[2]، علامہ ابن خالویہ لغوی نے کتاب لیس میں تصریح کی ہے کہ عربی زبان میں فَعَلَ یَفْعَلُ فِعْلًا کے وزن پر سوائے سَحَرَ یَسْحَرُ سِحْرًا اور کوئی مصدر نہیں ہے[3]، لیکن علامہ ابوحیان نے البحر المحیط میں اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ بجز سِحْرٌ اور فِعْلٌ کے اور کوئی مصدر بروزن فِعْلٌ فَعَلَ یَفْعَلُ کا نہیں پایا جاتا[4]، شیخ سمین نے بھی یہی کہا ہے[5]۔

امام ابوبکر جصاص رازی احکام القرآن میں رقمطراز ہیں:۔

"اہل لغت ذکر کرتے ہیں کہ سحر کی اصل لغت میں اس شے کے لئے ہے جو لطیف ہو اور جس کا سبب مخفی ہو اور سَحَر ان کے نزدیک بالفتح بمعنی غذا کیونکہ وہ مخفی ہوتی ہے اور اس کے مجاری لطیف ہوتے ہیں، لبید کہتے ہیں (رضی اللہ عنہ) ؎

ارانا موضعین لامر غیب
و نسحر بالطعام و بالشراب

یہاں نسحر میں دو وجہیں بیان کی گئی ہیں، ہم سحر زدہ کی طرح مشغول و فریفتہ تھے، دوسرے یہ کہ ہم غذا حاصل کر رہے تھے اور یہ وجہ بھی ہو اس کے معنی خفا کے ہوتے ہیں، ایک اور شاعر کہتا ہے ؎

فان تسئلینا فیم نحن فاننا
عصافیر من هذا الانام المسحر

اس بیت کے معنی میں بھی وہی احتمال ہیں جو اول میں ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ مُسَحَّر سے ذوسحر (پھیپھڑے والا) مراد لیا ہو، سحر پھیپھڑے کو اور جو حلق سے لگا ہوا ہے کہتے ہیں، اسی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مابین سحری ونحری (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پھیپھڑے اور سینے کے بالائی حصہ کے مابین وفات پائی) اور ارشاد الٰہی ہے اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ (یعنی تم اس مخلوق سے ہو جو کھاتی پیتی ہے) وراسی کو آیت شریفہ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (اور تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم) بتلاتی ہے جس طرح کہ فرمایا ہے مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ

---

[1] ملاحظہ ہو مفردات امام راغب [2] روح المعانی، ج ۱، ص ۳۰۵ [3] تاج العروس شرح قاموس
[4] البحر المحیط، ج ۱، ص ۳۱۹ [5] الفتوحات الالٰہیہ بتوضیح تفسیر الجلالین للدقائق الخفیہ مشہور بہ حاشیہ جمل علی الجلالین ج ۱ ص ۸۶ (طبع مصر ۱۳۵۲ھ)

الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ (یہ کیسا رسول ہے کھاتا ہے کھانا اور پھرتا ہے بازاروں میں) نیز یہ بھی احتمال ہے کہ ہماری طرح ذُو سَحَر (پھیپھڑے والا) ہے اور اس قسم کے معاملات پر لفظِ سحر کا ذکر ان اجسام کے ضعف و لطافت اور رقت کے سبب کیا جاتا ہے، نیز بایں ہمہ اس کے ذریعہ انسان کا قوام ہے لہٰذا جس کی یہ صفت ہو وہ ضعیف و محتاج ہے، یہ ہیں وہ معنی جو لغت میں سحر کے آتے ہیں، پھر یہ اسم منقول ہو کر ہر اس امر کے لئے استعمال ہونے لگا جس کا سبب مخفی ہو اور اپنی حقیقت کے خلاف اس کا تخیل ہونے لگے نیز ملمع اور دھوکہ بازی کے قائم مقام ہوا اور جب بھی یہ لفظ مطلق بلا کسی قید کے استعمال ہوگا اپنے فاعل کی مذمت کو بتائے گا ہاں قید کے ساتھ قابلِ مدح وستائش کے بارے میں بھی استعمال ہوا ہے، مروی ہے ان من البیان لسحرا (بعض بیان تو جادو ہے)[1]۔

امام راغب فرماتے ہیں:۔

"سحر طرف حلقوم اور پھیپھڑے کو کہتے ہیں اور کہا گیا ہے کہ اس سے سحر کا اشتقاق کیا گیا ہے اور وہ سحر یعنی گلے اور پھیپھڑے کو نشانہ بنانا ہے، سحر مختلف معانی کے لئے بولا جاتا ہے

(۱) دھوکہ دینا اور بے حقیقت خیالات کا پیدا کرانا جیسے شعبدہ باز کہ جو کچھ بھی کرتا ہے ہاتھ کی صفائی کی بنا پر نظریں بچا کر کرتا ہے اور جیسے کہ چغلخور ملمع کی باتوں کے ذریعہ جو (دوسری طرف سے) کانوں کو بند کر دیتی ہیں، کیا کرتا ہے ارشادِ الٰہی سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ (انہوں نے باندھ دیا لوگوں کی آنکھوں کو اور ان کو ڈرا دیا) اسی کے متعلق ہے، نیز فرمایا ہے يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ (اس کے خیال میں آئیں ان کے جادو سے) اور اسی نظر سے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ساحر (جادوگر) سے موسوم کیا، وَقَالُوا يَا أَيُّهَ السَّاحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ (اور کہنے لگا اے جادوگر پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو)

(۲) شیطان سے کسی طرح کے تقرب کے ذریعہ اس کی معاونت کا حاصل کرنا، جیسا کہ ارشاد ہے هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ (میں بتلاؤں تم

[1] احکام القرآن، ج ۱، ص ۴۷ (طبع مصر ۱۳۴۷ھ)

کو کس پر اترتے ہیں شیطان ہر جھوٹے گنہگار پر)
اور اسی کے متعلق فرمایا ہے وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ سکھلاتے تھے لوگوں کو جادو)۔

(۳) جس کی طرف ان سمجھ (جو بات تک کہ نا نہیں جانتے) جاتے ہیں کہ وہ ایک ایسے فعل کا نام ہے جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ اس کی قوت سے صورتوں اور طبیعتوں کو بدلا اور انسان کو گدھا بنایا جاتا ہے حالانکہ اہلِ علم کے نزدیک اس کی کچھ حقیقت نہیں ہے اور کبھی سحر سے اس کی خوبی کا تصور ہوتا ہے چنانچہ کہا گیا ہے ان من البیان لسحراً اور کبھی کام کی باریکی کا چنانچہ اطباء طبیعت کو سَاحِرَۃ کہتے اور غذا کو سحر سے موسوم کرتے ہیں کیونکہ اس کا فعل دقیق اور اسکی تاثیر لطیف ہوتی ہے۔

حافظ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں :۔
"سحر کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں :

اول یہ کہ وہ اعیان (حقائق) کا قلب و اختراع اور لوگوں کی صورتوں کو بدل ڈالنا ہے جو کہ معجزات و کرامات کے مشابہ ہے جیسے کہ ہوا میں اڑنا اور رات رات میں مسافتوں کا قطع کر ڈالنا،

دوم یہ کہ دھوکہ بازیاں بازی گریاں طمع سازیاں اور شعبدہ بازیاں ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (اس کے خیال میں آئیں ان کے جادو سے کہ دوڑ رہی ہیں) اسی کو بتلا رہا ہے اور حدیث میں ہے کہ لبید بن الاعصم نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کیا تھا تو آپ کے خیال میں یوں آتا تھا کہ آپ کسی چیز کو انجام دے رہے ہیں حالانکہ آپ اس کو انجام دیتے نہ تھے اور یہ معتزلہ کا قول ہے جن کی رائے میں سحر کی کوئی حقیقت نہیں ہے شافعیہ میں ابو اسحٰق استرابازی بھی انہی کے موافق ہیں۔

سوم یہ کہ وہ حیلہ کے طور پر ایسا معاملہ ہے جو نظر بندی کر دیتا ہے اسی سے ہے سَحَرُوْا اَعْيُنَ النَّاسِ (انہوں نے باندھ دیا لوگوں کی آنکھوں کو) حیلہ گروں اور ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے والوں اور شعبدہ بازوں میں اس طرح کی چیزیں ہوتی ہیں جن میں سے بہت سی باتیں کتاب کشف الدق والشعوذہ والیضاح الشک اور کتاب ارخاء الستور والکلل فی الشعوذہ

دلائل میں مذکور ہیں اور حدیث میں ہے کہ جب مکہ میں چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے تو ابوجہل (علیہ اللعن) کہنے لگا ذرا اتنا صبر کرو کہ بادیہ نشین لوگ آلیں اگر وہ اس کی خبر نہ دیں تو محمد (صلوات اللہ علیہ وسلامہ) نے ہماری آنکھوں پر سحر کیا ہے (یعنی ہماری نظر بندی کر دی ہے) جب انہوں نے بھی اس کی خبر دی تو بولا کہ یہ تو بڑا جادو ہے،

چہارم یہ کہ وہ خدمت جن کی ایک قسم ہے اور انہوں نے ہی اسے اپنے اجسام کی جنسِ لطیف اور اس کی ہیئتوں سے نکالا ہے چنانچہ وہ لطیف دقیق اور مخفی ہی ہے۔

پنجم یہ کہ وہ ان اجسام سے مرکب ہے جن کو جمع کر کے جلایا جاتا اور ان کی راکھ اور سیاہیاں بنا کر ان پر اسماء اور عزیمتیں پڑھی جاتی ہیں اور پھر جہاں سحر کی ضرورت پڑتی ہے وہاں انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔

ششم یہ کہ اس کی اصل طلسمات اور قلفطریات ہیں جو ستاروں کی خاصیتوں کی تاثیر پر بنائے جاتے ہیں جیسے کہ فرعونی لاٹھیوں کے پارہ میں دھوپ کی تاثیر تھی یا جو چیز مشکل ہو اس کی سہولت کے لئے شیطانوں سے خدمت لینا۔

ہفتم یہ کہ وہ ان کلمات سے مرکب ہے جو کفر پر مشتمل ہیں۔

ہمارے ایک معاصر کا بیان ہے کہ یہ سب اقوال جو سحر کی حقیقت کے متعلق لوگوں نے بیان کئے ہیں۔ سحر کے اقسام میں سے بعض قسمیں ہیں، اس نے ان کے ساتھ دوسرے انواع شعبدہ، دک (ایک چیز کو دوسری چیز سے ملا دینا) نیز نیرنجات، اوفاق، عزائم اور رومالوں کا ڈالنا اور اختلالِ حواس کی قسموں کو بھی شامل کیا ہے (یہاں تک معاصر کا بیان ختم ہوا)

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سحر موجود تھا، کیونکہ قرآن اور حدیث صحیح اس پر ناطق ہیں لیکن اب ہمارے زمانہ میں تمام وہ باتیں جن پر ہم نے کتابوں کے ذریعہ واقفیت حاصل کی ہے کذب و افترا ہیں جن سے کچھ نہیں بنتا اور قطعی کوئی شے اس میں سے صحیح نہیں اور یہی حال عزیمتوں اور رومال ڈالنے کا ہے پر وہ لوگ جن کے متعلق یہ اعتقاد کیا جاتا ہے کہ وہ عقلمند ہیں، ان باتوں کی تصدیق کرنے

ان پر کان دھرتے ہیں حالانکہ میں نے بعض ان لوگوں کو کہ جو اپنے کو عالم بتلاتے ہیں یہ دیکھا ہے کہ جب مفلس ہوئے چند کتابیں بنائیں اور اپنے دماغ سے کچھ باتیں ان میں ذکر کرکے بازار میں اچھے داموں انہیں فروخت کر ڈالا۔

اور بعض علماء نے سحر کے اسم کا اطلاق لوگوں کے درمیان چغلخوری کے ذریعہ ادھر کی باتیں ادھر لگانے پر بھی کیا ہے کیونکہ اس میں بھی دوست کو دشمن سے اور محبوب کو مبغوض سے بدل دیتا ہے۔" لہ

سحر کی حقیقت پر امام ابوبکر جصاص رازی نے احکام القرآن میں اور امام فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں اور علامہ ابنِ خلدون نے مقدمہ میں اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے تفسیر فتح العزیز میں اور شیخ طنطاوی جوہری نے تفسیر الجواہر میں بڑی سیر حاصل بحثیں لکھی ہیں، تفصیل کے لئے ان کا مطالعہ کافی ہے۔

۱/۱۲ ، ۷/۵،۷ ، ۹/۵۴ ، ۱۱/۱۳ ، ۱۲/۱ ، ۱۶/۱۲ ، ۱۷/۱ ، ۱۹/۱۶،۷ ، ۲۰/۷ ، ۲۲/۱۱
۲۳/۵ ، ۲۵/۹ ، ۲۶/۱ ، ۲۷/۸،۳ ، ۲۵/۹ ، ۲۹/۱۵ -

سَحَرٍ: پچھلی رات، سحر کا وقت۔ سحر کے معنی اصل میں پھیپھڑے کے ہیں، مجازاً اس کا استعمال صبح سے کچھ پہلے رات کے اس آخری حصہ کے لئے ہوتا ہے جبکہ پچھلی رات کی سیاہی دن کی روشنی سے مل جاتی ہے، علامہ زمخشری کا بیان ہے:۔

"سحر اس کا نام بطورِ استعارہ پڑا کیونکہ وہ رات کے جانے اور دن کے آنے کا وقت ہے اس لئے وہ صبح کے سانس لینے کا مقام ہے۔" سلہ

اَسْحَارٌ جمع (ملاحظہ ہو اَسْحَارٍ) ۲۷/۹ -

سِحْرَانِ: دو جادو، سِحْرٌ کا تثنیہ بحالتِ رفع، ۲۰/۵۴ -

سِحْرُكَ: تیرا جادو، سحر مضاف، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۱۶/۱۲ -

سَحَرُوْا: انہوں نے جادو کیا، انہوں نے نظربندی کی (فتح) سِحْرٌ سے، ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۹/۵۴ -

سَحَرَةٌ: جادوگر، سَاحِرٌ کی جمع ۹/۵۴ ، ۱۱/۱۲ ، ۱۶/۱۲ ، ۱۹/۷ -

سِحْرِهٖ: اس کا جادو، سِحْرٌ مضاف، هٖ ضمیر

لہ البحر المحیط، ج ۱، ۳۲۷، ۳۲۵ (طبع مصر) سلہ تاج العروس، فصل السین، باب الراء

واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، ۱۹۔

سِحْرِهِمَا: ان دونوں کا جادو، سحر مضاف هما ضمیر تثنیہ مذکر غائب، مضاف الیہ، ۱۶/۱۲۔

سِحْرِهِمْ: ان کا جادو، سحر مضاف هم ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۶/۱۲۔

سُحْقًا: دفع ہونا، دور کرنا، مصدر ہے اور اس کا فعل ثلاثی ہے سَمِعَ کرُمَ دونوں سے آتا ہے[1] یعنی سَحِقَ یَسْحَقُ بھی اور سَحُقَ یَسْحُقُ بھی، زجاج نے اس بابِ فعال کا مصدر بتایا ہے یعنی اَسْحَقَ سُحْقًا، ابوعلی فارسی کا بیان ہے کہ قیاس سحاقًا ہے، مصدر بحذفِ زوائد آیا ہے جیسے کہ کہا گیا ہے

ع وان اهلك فذلك كان قدری (اگر میں ہلاک ہوا تو یہی میری تقدیر میں تھا) کہ یہاں قدری بمعنی تقدیری کے ہے، ابوحیان لکھتے ہیں کہ:

"مصدر میں دعا، حذف کی احتیاج نہیں کیونکہ اس کا فعل ثلاثی آیا ہے"[2] ۱۹/۱

سَحِيْقٍ: دور، بعید، سُحق سے بروزن فعیل بمعنی فاعل ہے۔ ۱۱

فصل الخاء المعجمہ

سَخِرَ: اس نے ٹھٹھا کیا (سمع) سُخر سے جس کے معنی ٹھٹھا کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ آیتِ شریفہ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ (اللہ نے ان کو ٹھٹھا کرنے کی سزا دی) میں سُخر کا استعمال حق تعالیٰ شانہ کے لئے بسببِ مشاکلت ہے۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"یہ ان کی بداطواری اور اہلِ ایمان سے استہزاء کے مقابلہ کے طور پر ہے کیونکہ جیسا کام ویسا بدلہ"[3]

امام رازی نے اصم سے اس کے معنی کی تشریح نقل کی ہے:

"مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان منافقین نے جو نیکی کے کام بظاہر انجام دئے تھے انہیں قبول تو رکھا مگر ان پر انہیں ثواب نہیں عطا فرمائیگا تو یہ تحریہ (ٹھٹھے) ہی کی طرح ہوا"[4] ۱۰/۱۶

سَخَّرَ: اس نے کام میں لگا دیا، اس نے بس میں کر دیا، تسخیر (د) سے جس کے معنی بس میں کرنے اور زبردستی کسی خاص کام میں لگا دینے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب: ۱۳/۷، ۱۲ — ۱۴/۸ — ۱۷/۱۶ — ۲۱/۲، ۱۲ — ۲۲/۱۴ — ۲۳/۱۵ — ۲۵/۷، ۱۸

---

[1] کاری [2] البحر المحیط ج ۸ ص ۳۰۰ [3] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۷۶ (طبع مصر ۱۳۶۵ھ) [4] تفسیر کبیر ج ۴ ص ۹۶ ملاحظہ ہو

سَخَّرْنَا: ہم نے تابع کر دیا، ہم نے بس میں کر دیا، تَسْخِیْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، پ ۱۷/۶، ۲۳/۱۲

سَخَّرَهَا: ہم نے اس کو بس میں کر دیا، اس میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، پ ۱۷/۱۲

سَخِرُوْا: انہوں نے ہنسی کی، انہوں نے ٹھٹھا کیا، سُخْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۱۲/۴، پ ۱۷/۲۔

سَخَّرَهَا: اس نے اس کو مقرر کر دیا، اس نے اس کو کام میں لگا دیا، اس میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے (ملاحظہ ہو سَخَّرَ) پ ۱۷/۱۲، ۲۹/۵

سِخْرِیًّا: ٹھٹھا، ہنسی، دل لگی، اسم ہے، واضح رہے کہ یہ سُخْرٌ سے جس کے معنی ٹھٹھا کرنے کے ہیں، اسم بھی ہو سکتا ہے اور سَخِرَ یَسْخَرُ کا مصدر بھی جس کے معنی مسخر ہونے اور بس میں آنے کے ہیں، اور علامہ زمخشری تفسیر سورہ مومنوں میں رقمطراز ہیں:۔

"سُخْرِیّ پیش کے ساتھ اور زیر کے ساتھ بھی سخر کا مصدر ہے سُخْرٌ کی طرح سے مگر یا نسبت کی بنا پر فعل کی قوت میں زیادتی ہو جاتی ہے جس طرح کہ خصوص میں خصوصیۃ کہا گیا ہے اور کسائی و فراء سے منقول ہے کہ مکسور تو ٹھٹھے سے ہے اور مضموم مسخر کرنے اور غلام بنانے سے یعنی انہوں نے ان کو مسخر رکھا اور غلام سمجھا۔ اور پہلا مذہب خلیل اور سیبویہ کا ہے۔" [1]

علامہ محمود آلوسی، روح المعانی میں فرماتے ہیں:۔

"نافع، حمزہ اور کسائی نے سُخْرِیًّا بضم سین پڑھا ہے اور باقی سبعہ نے بکسرِ سین، اور معنی صورتوں میں ایک ہی ہیں یعنی ٹھٹھا کرنا، یہ خلیل، ابو زید انصاری اور سیبویہ کے نزدیک ہے اور ابو عبیدہ، کسائی اور فراء نے مضموم السین کو معنی بلا اجرت خدمت لینے کے اور مکسور السین کو معنی استہزاء کے بیان کیا ہے اور یونس نے کہا ہے کہ جب خدمت لینا مراد ہو تو سین پر ضمہ (پیش) کے سوا اور کچھ نہ آئیگا اور جب ہنسی ٹھٹھا کرنا مراد ہو تو ضمہ بھی روا ہے اور کسرہ (زیر) بھی اور دونوں حالتوں میں یہ مصدر ہے جس میں یا نسبت مبالغہ کے لئے بڑھا دی گئی ہے جیسے کہ احمری میں"۔ [2]

ابو علی فارسی کہتے ہیں کہ:۔

"قرأت کسرِ سین کی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہ بمعنی استہزاء ہے اور کسرہ اس میں اکثر ہے اور

---

[1] تفسیر الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، ج ۳، ص ۵۷ (طبع مصر)

[2] روح المعانی، ج ۱۸، ص ۶۲ (طبع منیریہ مصر)

بھی آیت کے زیادہ لائق ہے، دیکھئے نہیں ارشاد ہے وَکُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ (اور تم ان سے ہنستے تھے)۔ ؎۱ پ۱۸ ع۶ ۲۳/۱۳

سُخْرِیًّا: خدمت گار، تابعدار، علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں :۔

"سُخْرِیًّا جیسا کہ آپ نے ساخرۃ کی طرف نسبت ہے جس کے معنی بس میں کرنے اور کام میں لگانے کے ہیں، راغب کہتے ہیں کہ سخری وہ ہے کہ جس پر زبردستی کی جائے اور وہ اپنے ارادہ سے مسخر ہو جائے اور بعض نے خیال کیا ہے کہ یہ یہاں سُخر سے ہے بمعنی استہزاء کے یعنی تاکہ تونگر فقیر پر ٹھٹھا کرے اور ابو حیان نے اس کو بعید بنایا ہے اور سمین نے کہا ہے کہ یہ موقع کے مناسب نہیں"، ؎۲ ۲۵/۹

سَخَطٌ: غصہ، وہ سخت غصہ جو عقوبت کا مقتضی ہو، سَخَطٌ ہے ، پ۷ ع۸

سَخِطَ: وہ غصہ ہوا (سمع) سَخَطٌ سے جس کے معنی غصہ ہونے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ۱۰ ع۶

فصل الدال المھملۃ

سَدًّا: آڑ، حائل، دیوار، دو چیزوں کے درمیان آڑ اور حائل کو سَدّ کہا جاتا ہے، اصل میں یہ سَدَّ یَسُدُّ کا مصدر ہے جس کے معنی رخنہ کو استوار کرنے اور خلل کو بند کرنے کے ہیں، دیوار، پہاڑ اور بند میں چونکہ یہ صفت موجود ہے اس لئے ان کے لئے بھی سَدّ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، سد ذوالقرنین کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جو تحقیق ہے اس کا اقتباس درج ذیل ہے، فرماتے ہیں :۔

"بحرِ خزر کے مغربی ساحل پر ایک قدیم شہر دربند آباد ہے، یہ ٹھیک اس مقام پر واقع ہے جہاں کاکیشیا کا سلسلہ کوہ ختم ہوتا اور بحرِ خزر سے مل جاتا ہے، اس مقام پر قدیم زمانہ سے ایک عریض و طویل دیوار موجود ہے جو سمندر سے شروع ہو کر تقریباً تیس میل تک مغرب میں چلی گئی ہے اور اس مقام تک پہنچ گئی ہے جہاں کاکیشیا کا مشرقی حصہ بہت زیادہ بلند ہو گیا ہے۔ اس طرح اس دیوار نے ایک طرف بحرِ خزر کا ساحلی مقام بند کر دیا تھا دوسری طرف پہاڑ کا وہ تمام حصہ بھی روک دیا تھا جو ڈھلواں ہونے کی وجہ سے

؎۱ البحر المحیط، ج۶، ص ۳۰۳ (طبع مصر ۱۳۲۸ھ)

؎۲ روح المعانی، ج ۲۵ ص ۲۷

قابلِ عبور ہو سکتا تھا، ساحل کی طرف یہ دیوار دوہری ہے یعنی اگر آذربائیجان سے ساحل ہوتے ہوئے آگے بڑھیں تو پہلے ایک دیوار ملتی ہے جو سمندر سے برابر مغرب کی طرف چلی گئی ہے' اس میں پہلے ایک دروازہ تھا، دروازے سے جب گزرتے تھے تو شہر دربند ملتا تھا، اب یہ صورت باقی نہیں رہی، دربند سے آگے پھر اسی طرح کی ایک دار ملتی ہے لیکن یہ دوہری دیوار صرف دومیل تک گئی ہے، اس کے بعد اکہری دیوار کا سلسلہ ہے، دونوں دیواریں جہاں جاکر ملی ہیں وہاں ایک قلعہ ہے' قلعہ تک پہنچ کر دونوں کا درمیانی فاصلہ سو گز سے زیادہ نہیں رہتا لیکن ساحل کے پاس پانچ سو گز ہے اور اسی پانچسو گز کے عرض میں دربند آباد ہے اس دوہری دیوار کو ایرانی قدیم سے "دوبارہ" کہتے آئے ہیں یعنی دوہرا سلسلہ۔

اس مقام سے جب مغرب کی طرف کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں اور آگے بڑھتے ہیں تو ایک اور مقام ملتا ہے جو درۂ داریال کے نام سے مشہور ہے اور موجودہ زمانہ کے نقشہ میں اس کا محل ولاڈی کیوکز (یونانی کاکیشیا، روسی کیوکز) اور فارسی قفقاز ایک ہی لفظ ہے) اور تفلس کے درمیان دکھایا جاتا ہے' یہ کاکیشیا کے نہایت بلند حصوں سے ہو کر گزرا ہے اور دو زنگ بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے' یہاں بھی قدیم زمانے سے ایک دیوار موجود ہے اور ارمنی کو اپنوں میں اسے "آہنی دروازہ" کے نام سے پکارا گیا ہے' ارمنی زبان میں اس کا قدیم نام "بھاک کورائی" اور "کاپان کورائی" چلا آتا ہے، دونوں ناموں کا مطلب یہ ہے کہ "کورہ درہ"۔ سوال یہ ہے کہ کور سے مقصود کیا ہے؟ کیا یہ گورش کی بدلی ہوئی شکل نہیں ہے جو سائرس (ذوالقرنین) کا اصلی نام تھا جیسا کہ دارا کے کتبۂ اسطخر میں پڑھا جا چکا ہے۔

اب ایک سوال اور غور طلب ہے ذوالقرنین نے جو سد تعمیر کی تھی وہ درۂ داریال کی سد ہے یا دربند کی دیوار یا دونوں؟

قرآن میں ہے کہ ذوالقرنین دو پہاڑی دیواروں کے درمیان پہنچا، اس نے آہنی تختیوں سے کام لیا، اس نے برابر کا حصہ پاٹ کے برابر کر دیا، اس نے پگھلا ہوا تانبا استعمال کیا، تعمیر کی یہ تمام خصوصیات کسی طرح بھی دربند کی دیوار

پر صادق نہیں آتیں، یہ پتھر کی بڑی بڑی سلوں کی دیوار ہے اور دو پہاڑی دیواروں کے درمیان نہیں ہے بلکہ سمندر سے پہاڑ کے بلند حصے تک چلی گئی ہے، اس میں آہنی تختیوں اور پگھلے ہوئے تانبے کا کوئی نشان نہیں ملتا، پس یہ قطعی ہے کہ ذوالقرنین والی سد کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔

البتہ درہ داریال کا مقام ٹھیک قرآن کی تصریحات کے مطابق ہے، یہ دو پہاڑی چوٹیوں کے درمیان ہے اور جو سد تعمیر کی گئی ہے اس نے درمیان کی راہ بالکل مسدود کر دی ہے، چونکہ اس کی تعمیر میں آہنی سلوں سے کام لیا گیا تھا اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جارجیا میں "آہنی دروازہ" کا نام قدیم سے مشہور چلا آتا ہے اسی کا ترجمہ ترکی میں "دامرکپو" مشہور ہو گیا، بہرحال ذوالقرنین کی اصلی سد یہی ہے،، [۱]

(ملاحظہ ہو ذَا الْقَرْنَيْن) ۱۶/۲ ۲۲/۱۸

سِدْرٌ: بیری کا درخت، راغب لکھتے ہیں:۔

"سدر ایسا درخت ہے جو کھانے میں ناکافی ہوتا ہے اس لئے ارشاد ہوتا ہے وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِّن سِدْرٍ قَلِيلٍ (اور جھاؤ اور کچھ بیر تھوڑے سے) اور چونکہ اس کے کانٹے جھاڑ کر اس کے ذریعہ سایہ حاصل کیا جاتا ہے اس لئے یہ ارشادِ الٰہی فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ (بیری کے درختوں میں، جن میں کانٹا نہیں ہے) میں یہ جنت کے سایہ اور اس کی مثال قرار دیا گیا کہ سایہ حاصل کرنے کے لئے بہت کافی ہوتا ہے۔ ۲۸/۲۲ ۲۷/۱۴

سِدْرَةٌ: بیری کا درخت، واحد ہے، سِدْرٌ جمع، ۲۷/۵

سِدْرَةُ الْمُنْتَهَىٰ: سدرۃ المنتہیٰ، پرلے حد کی بیری، سدرۃ المنتہیٰ کیا ہے؟ انسانی فہم و ادراک کی اخیر سرحد پر ایک درخت، اکابر تابعین سے یہی روایت طبری نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کی ہے [۲] یہی وہ مقام ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فیوضِ رحمانی اور نعمائے صمدانی سے مخصوص فرمایا گیا تھا۔ ۲۷/۵

سُدُسٌ: چھٹا حصہ، اسمِ عدد ہے، اَسْدَاسٌ جمع، ۴/۱۲

---

[۱] ملاحظہ ہو ترجمان القرآن، ج ۲، ص ۴۲۷ ر ۴۲۸ و ۴۲۹ (طبع مدینہ پریس بجنور)

[۲] سیرۃ النبی، ج ۳، ص ۳۵۵ (طبع معارف پریس اعظم گڈھ ۱۳۶۱ھ)

سُدًى: بے قید، مہمل کہ نہ کسی بات پر مامور ہو اور نہ کسی چیز سے اسے روکا جائے، اَسْدَاءٌ سے جس کے معنی مہمل چھوڑ دینے کے ہیں، اسم ہے، واحد و جمع دونوں کے لئے مساوی طور پر مستعمل ہے، ۲۹/۱۸

سَدِيْدًا: سیدھا، سَدَادٌ سے جس کے معنی درست و راست ہونے کے ہیں، بروزن فَعِيْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ، ۴/۹، ۲۲/۶

سَدَّيْنِ: دو پہاڑ، دو آڑ، سَدٌّ کا تثنیہ بحالت نصب و جر (ملاحظہ ہو سَدٌّ) ۱۶/۲

فصل الراء المهملة

سِرًّا: چھپی ہوئی بات، بھید، راز، دل میں جو بات چھپی ہو اسے سِرّ کہتے ہیں، اَسْرَارٌ جمع۔ واضح رہے بطور کنایہ اور مجاز کے لفظ سِرّ کا استعمال جماع، نکاح، نکاح کرنے کا اظہار کرنے، نیز زنا کے لئے بھی ہوتا ہے چنانچہ آیت شریفہ لَا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا (ان سے نکاح کا وعدہ نہ کرو چھپ کر) میں سِرّ کو ابن السیدہ نے نکاح کا کنایہ بتایا ہے اور مجاہد و فراء نے زمانہ عدت میں نکاح کی بات چیت کرنے کے معنی لئے ہیں اور ابو الہیثم، حسن بصری، ابو مجلز نے زنا سے تفسیر کی ہے[1] ۱۶/۱، ۱۸/۱۹

سِرًّا ۱۴/۲، ۳/۶، ۹/۱۳، ۱۶/۱۴، ۲۲/۱۶

سَرَّآءَ: نعمت، فراخی، خوشی، اصل میں حالت شادمانی کا نام سَرَّاءٌ ہے، ۴/۵، ۹/۲

سَرَابٍ: چمکتی ہوئی ریت، سراب، شدت گرما میں دوپہر کے وقت دھوپ کی تیزی سے میدان میں جو ریت پانی کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی ہے اور دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی بہ رہا ہے اور مکانات اور درختوں کا عکس اس میں دکھائی دے رہا ہے، اسے سَرَاب کہتے ہیں۔ چونکہ اکثر اس کے نظر پڑنے سے پانی کا دھوکا ہو جاتا ہے اس لئے سَرَاب دھوکا اور فریب کے لئے ضرب المثل ہے۔ ۱۸/۱۱ سَرَابًا ۳۰/۱

سَرَابِيْلَ: کرتے، قمیصیں، پیراہن، سِرْبَالٌ کی جمع، سِرْبَال قمیص کو کہتے ہیں، وہ کسی قسم کی بھی ہو، ۱۴/۱۷

سَرَابِيْلُهُمْ: ان کے کرتے، ان کے پیراہن سَرَابِيْلُ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۳/۱۹

سِرَاجًا: چراغ، دیا، مجازاً آفتاب اور ہر روشن چیز کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، سُرُجٌ جمع، ۱۹/۴، ۲۲/۳، ۲۹/۹، ۳۰/۱

[1] تاج العروس

سَرَاحًا: رخصت کرنا، چھوڑنا، تَسْرِیْحٌ سے جس کے معنی طلاق دینے کے ہیں، اسم ہے، جیسے تَبْلِیْغٌ سے بَلَاغٌ ہے، ابوجعفر بیہقی نے تاج المصادر میں لکھا ہے کہ:۔

"اس مقام پر تحقیق یہ ہے کہ سَرَاحٌ، سَلَامٌ، کَلَامٌ اسماء ہیں، بروزن فَعَالٌ جو مصدر کے معنی دیتے ہیں"

راغب لکھتے ہیں کہ:۔

"ارشاد الٰہی وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا (اور رخصت کرو بھلی طرح سے) تَسْرِیْحُ اِبِلٍ (اونٹوں کو چرنے کے لئے چھوڑنا) سے مستعار ہے جیسے کہ طَلَاقٌ "اطلاقِ ابل" (اونٹوں کے پائے بند کھولنے) سے مستعار ہے"

(ملاحظہ ہو تَسْرِیْحٌ) ب ۲۱/۲۲ ۲۳۔

سُرَادِقُهَا: اس کی قناتیں، سُرَادِقٌ مضاف ھا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، علامہ ابوالسعادات مبارک بن الاثیر جزری نے لکھا ہے کہ ہر وہ شے جو کسی شے کا احاطہ کئے ہوئے ہو خواہ چار دیواری ہو یا شامیانہ یا خیمہ وہ سُرَادِقٌ ہے [۱]

امام سیوطی الاتقان میں فرماتے ہیں:۔

"جوالیقی کا بیان ہے کہ یہ فارسی ہے معرب اصل میں سرادر تھا یعنی (در سرا) دہلیز کسی اور دیگر حضرات یہ کہتے ہیں یہ فارسی کا "سراپردہ" ہے"۔ [۲]

اور علامہ زبیدی نے تاج العروس میں جوالیقی سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ "سرادر" یا "سراطاق" کا معرب ہے لیکن طاق خود معرب ہے۔

راغب اصفہانی مفردات میں رقمطراز ہیں:۔

"سُرَادِقٌ فارسی ہے معرب اور کلامِ عرب میں کوئی ایسا مفرد اسم نہیں ہے کہ جس کا تیسرا حرف الف ہو اور الف کے بعد دو حرف ہوں"

علامہ محمود آلوسی نے لکھا ہے کہ:۔

"اس کے معرب ہونے کے بارے میں تو راغب نے صحیح کہا کیونکہ عامۂ اہلِ لغت اسی پر ہیں لیکن یہ جو کہا ہے کہ کلامِ عرب میں الخ تو علابط، قراقص، جنادف، حلاحل کا آنا اس کی تکذیب کرتا ہے، حالانکہ سب کے سب سرادق کے وزن پر ہیں اور ایسے الفاظ بہت، باوجود اس کثرت کے ایسے فاضل سے غفلت ہوجانا بعید ہے اس لئے غور کرنا چاہئے کہ ان کی مراد کیا ہے"۔ [۳]

امام احمد، امام ترمذی اور امام ابن جریر طبری نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت

---

[۱] النہایہ فی غریب الحدیث والاثر [۲] الاتقان، ج ۱، ص ۱۳۸ (طبع مصر ۱۳۶۸ھ) [۳] روح المعانی، ج ۱۵، ص ۲۴۶

کی ہے کہ "سرادق نار" (سراپردہ آتش) کی چار دیواریں ہیں اور ہر دیوار کی موٹائی چالیس سال کی مسافت کے بقدر ہے[1] سُرَادِقَات جمع ہے، سیبویہ کا بیان ہے کہ جب اس کو کسرہ نہ دیا گیا تو باوجود مذکر ہونے کے اس کی جمع تاء کے ساتھ لائے[2] ۱۵/۱۶

سِرَاعًا : دوڑتے ہوئے، جلدی کرتے ہوئے، دوڑنے والے، جلدی کرنے والے، سَرِیْعٌ کی جمع جو کہ سُرْعَةٌ سے ہے جس کے معنی جلدی کرنے کے ہیں بروزن فَعِیْلٌ بمعنے فاعل ہے جس طرح کہ کرام کریم کی جمع ہے[3] ۲۶/۱۷ ۲۹/۸

سَرَائِرُ : بھید، راز، پوشیدہ باتیں، سَرِیْرَةٌ کی جمع علامہ ابن خالویہ لکھتے ہیں :-

"یاء کو جمع میں ہمزہ کر لیا گیا حالانکہ واحد میں ہمزہ نہ تھی، اس کی وجہ یہ ہے کہ جمع میں یاء سے قبل الف ہے جو ساکن ہے، اب دو ساکن جمع ہوئے تو انہوں نے یاء کو ہمزہ سے بدل کر التقاء ساکنین کی بنا پر اس کو کسرہ دے دیا اور اسی طرح سے ہے قَبِیْلَةٌ اور قَبَائِلُ اور اگر "یاء" اصلی ہوتی جیسے کہ مَعِیْشَةٌ میں ہے تو جمع میں اسے ہمزہ نہ کیا جاتا ہے" ارشاد ہے وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ[4] ۳۰/۱۱

سَرَبًا : زنگ، اَسْرَابٌ جمع، ۱۵/۲۱

سَرِّحُوْهُنَّ : تم ان عورتوں کو رخصت کردو، تم ان عورتوں کو چھوڑ دو، سَرِّحُوْا تَسْرِیْحٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر هُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب، (ملاحظہ ہو تَسْرِیْحٌ) ۲/۱۳ ۲۲/۳

سَرْدٌ : کڑیاں جوڑنا، زرہیں بنانا، سَرَدَ یَسْرُدُ کا مصدر ہے نیز کڑیوں کے لئے بطور اسم بھی مستعمل ہے، ۲۲/۱۸

سُرُرٌ : تخت، سَرِیْرٌ کی جمع ہے، راغب لکھتے ہیں :-

"سَرِیْرٌ یعنی جس پر مسرور سے بیٹھا جائے کیونکہ یہ ارباب نعمت کے ہی پاس ہوتا ہے اس کی جمع اَسِرَّةٌ اور سُرُرٌ ہے۔

۲۳/۶ ۳۰/۱۳ ۲۷/۱۴،۳ سُرُرًا ۲۵/۹

سَرَقَ : اس نے چوری کی (ضرب) سَرِقَةٌ سے جس کے معنی چوری کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، راغب لکھتے ہیں :-

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۸۱ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ) [2] تاج العروس [3] تفسیر کبیر سورۂ ق، ج ، ص ۶۲۴

[4] اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم، ص ۴۹ (طبع دار الکتب المصریۃ)

سَرِقَۃٌ کے معنی ہیں پوشیدہ طور پر اس چیز کا لینا جس چیز کو لینے کا حق نہ ہو، اور شرع میں یہ کسی شئے کے مخصوص جگہ سے اور مخصوص مقدار میں لے لینے کے لئے مستعمل ہے۔"

۱۳/۳ /۴

سِرَّکُمْ: تمہارا بھید، تمہارا چھپا، سِرٌّ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ (ملاحظہ ہو سِرًّا) ۷/۱۸

سَرْمَدًا: ہمیشہ، دائم۔ علامہ زمخشری کشاف میں رقمطراز ہیں:۔

"سرمد کے معنی دائم و متصل کے ہیں، سَرْدٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی متابعت یعنی پے بہ پے اور لگاتار ہونے کے ہیں، اس سے ماہ ہائے حرام کے بارے میں عرب کا محاورہ ہے ثلاثۃ سرد و واحد فرد (تین یعنی ذی قعدہ، ذی حجہ، محرم، پے بہ پے ہیں اور ایک یعنی رجب یکہ ہے) اور میم زائد ہے، اس کا وزن فَعْمَلٌ ہے اور اس کی نظیر دلامص ہے دلاص سے[۱]"، اور بعض نحویوں کا مختار یہ ہے کہ میم اس میں اصلی ہے اور اس کا وزن فَعْلَلٌ ہے کیونکہ درمیان میں میم کی زیادتی قیاس سے نہیں کی جاتی ہے[۲]، قاضی شوکانی نے اسی کو ظاہر بتایا ہے،[۳] ۲۰/۱۰

سُرُوْرًا: سرور، جو خوشی اندر چھپے ہی ہو اس کا نام سرور ہے، یہ سَرَّ یَسُرُّ کا مصدر ہے، علامہ مرتضیٰ زبیدی، بعض اہلِ لغت سے ناقل ہیں کہ "سرور" کی حقیقت یہ ہے کہ فقط قلب میں التذاذ (مزہ پانا) و انشراح (کھلنا) حاصل ہوتا ہے بغیر اس کے کہ ظاہر میں اس کا کوئی اثر ہو اور "حبور" وہ ہے جس کا اثر ظاہر میں دکھائی دیتا ہے[۴]۔۔ ۲۹/۱۹

سِرَّهُمْ: ان کا بھید، ان کا راز، سِرٌّ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۶/۱۲ ۲۵/۱۳

سَرِیًّا: ایک چشمہ، اَسْرِیَۃٌ اور سِرْیَانٌ جمع، جیسے کہ رَغِیْفٌ کی جمع اَرْغِفَۃٌ اور رُغْفَانٌ ہیں،

تاج العروس میں ہے،

"سَرِیٌّ غَنِیٌّ کی طرح سے بمعنی نہر ہے، ثعلب نے یہی کہا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ بمعنی جدول ہے یہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے اور یہی اہلِ لغت کا قول ہے چنانچہ انہوں نے

---

[۱] تفسیر کشاف ج ۳، ص ۱۷۷ (طبع مصر ۱۳۵۴ھ) [۲] روح المعانی، ج ۲۰، ص ۹۳ [۳] فتح القدیر ج ۴، ص ۱۷۰ (طبع مصر ۱۳۵۰ھ)

[۴] روح المعانی، ج ۱۶، ص ۷۹

اس کی تفسیر اس چھوٹی نہر سے کی ہے جو نخلستان کی طرف رواں ہو"۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں :۔

"جدول کو سَرِیٌّ سے اس لئے موسوم کیا کہ پانی اس میں سیر کرتا یعنی رواں ہوتا ہے اس معنی کے اعتبار سے اس کا لام کلمہ یاء ہے، حسن بصری، ابن زید اور جبائی سے مروی ہے کہ سری سے عیسٰی علیہ السلام مراد ہیں اور یہ سرو بمعنی رفعت ہے جیسا کہ راغب نے کہا ہے، اس صورت میں آیہ شریفہ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا کے معنی ہوں گے، یعنی تیرے رب نے تیرے نیچے ایک رفیع الشان، بلند مرتبت لڑکا کر دیا اور صحاح میں اس کے معنی مروت کے ساتھ سخاوت کے مرقوم ہیں، یہ رفعت مراد لینا قدر کے اعتبار سے زیادہ اونچا ہے اور اس معنے کے لحاظ سے لام کلمہ واو ہے"۔[1]

س ر ع ۱۶
۵

سَرِيْعٌ : جلد کرنے والا، سُرْعَةٌ سے جس کے معنی جلدی کرنے کے ہیں بروزن فَعِيْلٌ بمعنے فاعل صفت کا صیغہ ہے، قاموس میں ہے :۔

"اللہ عزوجل کے "سریع الحساب" ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کا حساب لینا لامحالہ واقع ہو کر رہے گا یا ایک حساب اس کو دوسرے حساب سے اور ایک شے اس کو دوسری شے سے ہٹا کر اپنی طرف مشغول نہیں کر سکتی یا اس کے افعال جلد ظہور میں آتے ہیں اور جو وہ ارادہ فرماتے ہیں اس میں کسی بات کی دیر نہیں لگتی، کیونکہ اس کا ہر فعل بغیر کسی چیز کے ارتکاب اور کوشش کے واقع ہوتا ہے پس حق سبحانہ تمام خلق سے ان کے جی اٹھنے اور جمع ہو جانے کے بعد ایک لحظہ میں بغیر کسی قسم کے شمار لگائے اور رکاوٹ کے حساب فرما لیں گے وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَاسِبِيْنَ اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

راغب لکھتے ہیں :۔

"فرمان الٰہی إِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (اور بیشک اللہ جلد لیتا ہے حساب) اور سَرِيْعُ الْعِقَابِ (جلد عذاب کرنے والا ہے) یہ تنبیہ ہے اس پر جس کے متعلق ارشاد ہے إِنَّمَا أَمْرُهٗ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ

[1] روح المعانی ج ۱۶، ص ۷۶

اس کا حکم یہی ہے کہ جب کرنا چاہے کسی چیز کو تو کہے اس کو ہو اور وہ اسی وقت ہو جائے۔")

۲/۹ ۳/۰ ۴/۱۱ ۵/۱۱ ۶/۱۱ ۹/۱۱ ۱۳/۱۲ ۱۹/۱۱ ۱۵/۱۸ ۲۴/۷

فصل الطاء المهملة

سُطِحَتْ: وہ بچھائی گئی، (فتح) سَطْحٌ سے جس کے معنی بچھانے کے ہیں، ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۳۰/۱۳

فصل العين المهملة

سَعَتِہٖ: اس کی وسعت، اس کی گنجائش، سَعَۃٍ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ (ملاحظہ ہو سَعَۃٍ) ۵/۱۶ ۲۵/۷

سُعِدُوْا: وہ نیک بخت بنائے گئے (فتح) سَعْدٌ سے جس کے معنی نیک بخت کرنے کے ہیں، ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب، علامہ ابو جعفر بیہقی تاج المصادر میں لکھتے ہیں :۔

"سَعْدٌ اور سُعُوْدٌ کے معنی مبارک ہونے کے ہیں کہا جاتا ہے سَعَدَ یَوْمُنَا (ہمارا دن مبارک ہوا) نیز سَعْدٌ کے معنی ہیں نیک بخت کرنے کے اور اس معنی میں اہل لغت نے اختلاف کیا ہے، زجاج، ازہری اور فارابی نے تو اس کو جائز رکھا ہے اور ارشادِ الٰہی وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا (اور لیکن جو لوگ نیک بخت کئے گئے) سے جو بضم سین ہے استدلال کیا ہے اور سیبویہ نیز محققین اہل لغت نے اس سے انکار کیا ہے ان کا بیان ہے کہ (اس معنی میں) عرب کا محاورہ اَسْعَدَہُ اللّٰہُ ہے اور یہ روا نہیں کہ سُعِدُوْا سَعَادَۃٌ سے بمعنی نیک بخت ہونا ہو کیونکہ سَعَادَۃٌ شَقَاوَۃٌ کی طرح سے لازم ہے اور اس قرارت کے بارے میں سیبویہ نے کہا ہے کہ یہ لغت قیاس سے خارج ہے یا باب فَعَلَ اور فَعَلْتُہٗ سے ہوگی (یعنی لازم بھی اور متعدی بھی) جیسے کہ غَاضَ (وہ گھٹ گیا) اور غِضْتُہٗ (میں نے اس کو گھٹا دیا) ہے اور اسی طرح سے سَعَدَ (وہ نیک بخت ہوا) اور سَعَدْتُہٗ (میں نے اس کو نیک بخت کیا) ہیں اور مَسْعُوْدٌ میں ان کے لئے کوئی دلیل نہیں کیونکہ جائز ہے یہ مثل اَجَنَّہُ اللّٰہُ فَھُوَ مَجْنُوْنٌ کے ہو (یعنی باب اَسْعَدَ سے مستعمل ہو)" ۱۰۸/۱۲

سُعُرٍ: سودا، جنون، بے عقلی، علامہ سمین لکھتے ہیں:

"سُعُرٍ" مفرد بھی ہو سکتا ہے بمعنی جنون کے کہا جاتا ہے ناقۃٌ مَسْعُوْرَۃٌ یعنی اپنی رفتار میں دیوانی سی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سَعِیْرٌ کی جمع ہو جس کے معنی نار یعنی آگ کے ہیں اور دونوں احتمال منقول ہیں" لہ

اصل میں سَعْرٌ کے معنی آگ بھڑکانے کے ہیں جب انسان کے دماغ میں گرمی بھڑک اٹھتی ہے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے سُعُرٌ کا استعمال سودا اور جنون کے معنی میں اسی اعتبار سے ہے، پ ۲۷ ع ۹، ۱۰

سُعِّرَتْ: وہ دہکائی گئی، وہ بھڑکائی گئی تَسْعِیْرٌ سے جس کے معنی سخت آگ دہکانے کے ہیں، ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ ۳۰ ع ۶

سَعَوْا: وہ لپکے، انہوں نے کوشش کی، سَعْیٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو سَعْیٌ) پ ۱۷ ع ۱۴، پ ۲۲

سَعَۃٍ: کشائش، فراخی، وسعت، طاقت، پہنچ، یہ وَسِعَ یَسَعُ کا مصدر ہے جس کے معنی فراخ ہوتے کے ہیں اس کی تاء واو کے بدلہ میں ہے عِدَۃٌ اور زِنَۃٌ کی طرح اول سے واو کو حذف کر کے آخر میں اس کے عوض تاء لے آئے ہیں، راغب لکھتے ہیں:

"سَعَۃٌ کا استعمال امکنہ (مقامات) کے لئے بھی آتا ہے اور حالت کے لئے بھی اور فعل کے لئے بھی جیسے کہ قُدْرَۃٌ اور جُوْدٌ وغیرہ الفاظ ہیں، چنانچہ مکان کے بارے میں جیسے ارشاد ہے اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ (میری زمین کشادہ ہے) اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً (کیا نہ تھی زمین اللہ کی کشادہ) اور حالت کے بارے میں فرمان الٰہی ہے لِیُنْفِقْ ذُوْ سَعَۃٍ مِّنْ سَعَتِہٖ (چاہیے خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کے موافق) اور ارشاد ہے عَلَی الْمُوْسِعِ قَدَرُہٗ (اور مقدور والے پر اس کے موافق ہے)۔

آیت کریمہ وَمَنْ یُّھَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا کَثِیْرًا وَّسَعَۃً (اور جو کوئی وطن چھوڑے اللہ کی راہ میں پائیگا اس کے مقابلہ میں جگہ بہت اور کشائش) کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ربیع بن انس اور ضحاک سے مروی ہے کہ اس سے وسعتِ رزق مراد ہے اور قتادہ سے روایت کیا گیا ہے کہ اظہارِ دین کی طاقت مراد ہے کیونکہ ان کو مشرکین کی جانب سے دین کے

لہ حواشی سلیمان جمل علی الجلالین، ج ۴، ص ۲۴۲ (طبع مصر ۱۳۵۲ھ)

معاملہ میں سخت تنگی روا رکھتی تھی کہ اظہارِ دین سے روکتے تھے، لہ ٢/١٦ ٥/١١ ١٨/٩ ٢٦/١٧

سَعْیٌ: قصد کرنا، کام کرنا، چلنا، دوڑنا، کمانا، سَعٰی یَسْعٰی کا مصدر ہے یہ سب معانی قاموس میں منقول ہیں اور امام راغب مفردات میں فرماتے ہیں:-

"سَعْیٌ" کے معنی "مَشْیِ سَرِیْعٌ" (تیز روی، لپکنے) کے ہیں جو عَدْوٌ (دوڑنے) سے کم ہے اور کسی معاملہ میں کوشش کے لئے استعمال کیا جاتا ہے خواہ خیر ہو یا شر، اور بیشتر سعی کا استعمال اچھے کاموں کے بارے میں ہوتا ہے"، ١٥/٢ ٢٣/١٧،

سَعْیًا ٣/٣-

سَعٰی: اس نے کوشش کی، وہ دوڑا، اس نے کمایا، سَعْیٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ١/١٤ ٤/٩ ١٥/٢ ١٧/٢٦ ٣٠/١٣-

سَعِیْدٌ: نیک بخت، سَعَادَۃٌ جس کے معنی نیک بخت ہونے کے ہیں، بروزن فَعِیْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ ١٢/٩-

سَعِیْرٌ: دہکتی ہوئی آگ، دوزخ، سَعْرٌ سے جس کے معنی آگ بھڑکانے کے ہیں بروزن فَعِیْلٌ بمعنی مَفْعُوْلٌ ہے (ملاحظہ ہو جَحِیْمٌ) ١٧/٨ ٢١/١٢ ٢٣/١٣،٨ ٢٥/٢ ٢٩/١

سَعِیْرًا ٤/١٢ ٥/٥ ١٥/١١ ١٨/١٧ ٢٣/٥ ٢٦/١٠ ٢٩/١٩ ٣٠/٩-

سَعْیُکُمْ: تمہاری کمائی، تمہاری کوشش، سَعْیٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ ٢٩/١٩ ٣٠/١٧

سَعْیُہٗ: اس کی کمائی، اس کی کوشش، سَعْیٌ مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ١٧/٢ ٢٧/٧-

سَعْیَہَا: اس کی کمائی، اس کی دوڑ، سَعْیٌ مضاف ھا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ ١٥/٢ ٣٠/١٣

سَعْیُہُمْ: ان کی دوڑ، ان کی کوشش، سَعْیٌ مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، ١٥/٢ ١٦/٣-

فصل الفاء

سَفَاھَۃٌ: بے عقلی، بیوقوفی، جہالت، سَفِہَ یَسْفَہُ کا مصدر ہے، ٩/١٦

سَفَرٌ: سفر، دور کی مسافت قطع کرنے کا نام "سفر" ہے اَسْفَارٌ جمع، اصل میں سَفَرٌ کے معنی پردہ ہٹانے اور متفرق کرنے کے ہیں، سفر کو سفر اسی اعتبار

لہ احکام القرآن از امام جصاص رازی، ج ١، ص ٣٠٦ (طبع مصر ١٣٤٧ھ)

سے کہا جاتا ہے کہ اس میں یہ دونوں معانی محفوظ ہیں، علامہ ابن سیدہ محکم میں لکھتے ہیں :۔

"اس نام سے یہ اس لئے موسوم ہوا کہ جس طرح ہوا سوکھے پتوں کو لاتی اور لیجاتی، متفرق کرتی ہے اسی طرح سفر میں بھی آمد و رفت ہوتی ہے" [۱]

اور امام ابو منصور ازہری تہذیب میں رقمطراز ہیں :۔

"سفر کا نام سفر اس لئے پڑا کہ وہ مسافروں کے رخ اور ان کے اخلاق کو ظاہر کرتا ہے اور جو بات ان میں چھپی ہوتی ہے اسے کھول دیتا ہے" [۱]

اور اصطلاحِ شرع میں سفر سے خاص قسم کی قطع مسافت مراد ہے جس سے احکام شرعیہ متغیر ہو جاتے ہیں [۲] ائمہ احناف کے نزدیک "جس سفر سے احکام متغیر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ انسان تین دن رات کی مسافت کا ارادہ کرے، مسافت اونٹ کی رفتار سے ہو یا پیادہ روی سے پر چال درمیانی ہو" [۳]

اور یہی قول امام سفیان ثوری اور امام حسن بن صالح کا ہے [۴]، امام ابوبکر احمد بن علی جصاص رازی فرماتے ہیں :۔

"لغت میں سفر کی کوئی حد معلوم نہیں کہ جس سے فرق ہو سکے کہ کم سے کم سفر یہ ہے اور اس کے علاوہ یہ ہے پس لغت کا معاملہ یہ ٹھہرا، اور علماء اس پر متفق ہیں کہ جو سفر افطار کو مباح کرتا ہے اس کی مقدار شرع میں معلوم ہے، ہاں اس مقدار کے بارے میں وہ باہم مختلف ہیں، ہمارے اصحاب (حنفیہ) تین دن اور تین رات کی مسافت بتاتے ہیں اور دوسرے دو دن کی مسافت اور اور لوگ ایک ہی دن کی مسافت اور اور لغت کا اس بارے میں کوئی حصہ نہیں کیونکہ اس میں کم سے کم سفر کی کسی وقت کے ساتھ اس طرح تحدید ہے ہی نہیں کہ جس سے کم کرنا جائز نہ ہو کیونکہ وہ ایسا اسم ہے جو عادت سے ماخوذ ہے اور ہر وہ چیز جس کا حکم عادت سے ماخوذ ہو اقل قلیل سے اس کی تحدید ناممکن ہے نیز یہ بیان کیا گیا ہے کہ سَفَر، سَفْرٌ سے

[۱] [۲] تاج العروس　[۲] سفر سے جو احکام متغیر ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں: نماز کا قصر کرنا روزہ کے افطار کا مباح ہونا، موزوں پر مسح کی عادت کی مدت کا تین دن تک بڑھ جانا، جمعہ عیدین اور قربانی کے وجوب کا ساقط ہو جانا، بغیر محرم کے آزاد عورت کے نکلنے کا حرام ہونا (ملاحظہ ہو عنایہ شرح ہدایہ از علامہ اکمل الدین بابرتی، ج ۱، ص ۳۹۳)　[۳] ہدایہ باب صلاۃ المسافر

[۴] احکام القرآن از جصاص، ج ۲، ص ۳۱۲ (طبع مصر ۱۳۴۷ھ)

مشتق ہے جس کے معنی کھولنے کے ہیں، عرب کے اس محاورہ سے ہے سفرت المرأۃ عن وجہها (عورت نے اپنا چہرہ کھولا) اور اسفر الصبح (صبح روشن ہوئی) اور سفرت الریح السحاب (ہوا نے بادل کھول دیا) اور مِسْفَرَۃٌ (جھاڑو کے معنی میں ہے کیونکہ وہ مٹی کو جھاڑ کر زمین کو کھولدیتی ہے اور اسفر وجہہ اس کا چہرہ تابناک اور روشن ہوا اور اسی سے ارشاد الٰہی ہے وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَۃٌ (کتنے چہرے اس دن روشن ہیں) یعنی تاباں و درخشاں ہیں پس کسی دور مقام کی طرف جانے کو سَفَر سے موسوم کیا گیا کیونکہ وہ مسافر کے اخلاق و احوال کو کھولتا ہے۔

اور معلوم ہے کہ جب سفر کے معنی وہ ہوئے جو ہم نے بیان کئے تو یہ تھوڑے سے وقت اور ایک دن اور دو دن میں واضح نہیں ہوتے کیونکہ اکثر اس قسم کی مسافت کا ارتکاب کیا جاتا اور اس میں اس کے اخلاق کی وہ باتیں ظاہر نہیں ہو پاتیں کہ جن کو دور کا سفر کھول کر رکھ دیتا ہے۔

پھر اگر عادت کا اعتبار کیا جائے تو ہم یہ جانتے ہیں کہ قریب کی مسافت کو سفر نہیں کہا جاتا اور دور کی مسافت کا نام سفر ہے ہاں اس پر سب متفق ہیں کہ تین دن رات کی مسافت سفر صحیح ہے کہ جس کے بارے میں احکام شرع متعلق ہیں، پس تین دن رات کی مسافت کا سفر ہونا تو ثابت ہو گیا اور اس سے کم کا سفر ہونا ثابت نہیں کیونکہ سفر کے معنی اس میں معدوم اور توقیف (اس سے واقف کرانا) اور اس کی تحدید پر اتفاق مفقود ہے۔

نیز نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایسی حدیثیں مروی ہیں جو چاہتی ہیں کہ احکام شرع میں سفر کے ہونے میں تین دن کی مسافت کا اعتبار ہو من جملہ ان کے ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی عورت بغیر اپنے محرم کے تین دن کا سفر کرے،، [1]

پ ۲/۷ ۳/۴ ۵/۴ ۶/۶ ۱۵/۲۱

سَفَرًا ۱/۱۲

سَفَرِنَا: ہمارا سفر، سَفَرِ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۱۵/۲۱

سَفَرَۃٍ: لکھنے والے، سَافِرٌ کی جمع ہے جیسے کَتَبَۃٌ

[1] احکام القرآن، ج ۱، ص ۲۰۴

کاتبٌ کی ہے، واضح رہے کہ سَفَرٌ کے معنی لکھنے کے بھی آتے ہیں جو اسی اعتبار سے ہیں کہ لکھنے میں وہ شے کھلتی ہے، سَافِرٌ اسی سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے، تفسیر کبیر میں ہے کہ :-

"کتبہ کو سَفَرَةٌ اور کاتب کو سافر اس لئے کہا گیا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس شے کو بیان کرنے والا اور واضح کرنے والا ہے" [1]

ابن ابی حاتم نے بروایت ابن جریج حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ نبطی زبان میں اس کے معنی قرّاء یعنی قرارت کرنے والوں کے ہیں [2] دیکھئے

سَفَرِنَا : ہمارا سفر، سَفَرٌ مضاف نا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، $\frac{15}{21}$

سُفْلٰی : بہت نیچی، سُفُولٌ سے اسم تفضیل کا صیغہ واحد مؤنث، عُلْیَا کی نقیض ہے (ملاحظہ ہو اَسْفَلُ) $\frac{1}{12}$

سَفِهَ : وہ بیوقوف ہوا، اس نے احمق بنایا، اس نے ہلاک کیا (سَمِعَ) علامہ محمود آلوسی زیر آیۂ شریفہ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ "مگر جو بیوقوف ہوا اپنے جی سے یا مگر وہی کہ جس نے احمق بنایا اپنے آپ کو" تحریر فرماتے ہیں :-

"اور سَفِهَ بالکسر (بروزن سَمِعَ) جیسا کہ مبرد و ثعلب کا بیان ہے متعدی بنفسہٖ ہے طرح نَفْسَهٗ، مفعول بہ لیکن سَفُهَ بالضم (بروزن کَرُمَ) سو وہ لازم ہے اور حدیث میں جو آتا ہے کہ الکبران تسفہ الحق و تغمط الناس تو کبر یہ ہے کہ تو حق کا استخفاف کرے اور لوگوں کو خوار رکھے) وہ اس کے متعدی ہونے کا شاہد ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ بھی لازم ہے اور مفعول کی طرف اس کا تعدیہ اس بنا پر ہے کہ وہ اس معنی جہل یا اہمال پر مشتمل ہے جس کی طرف تعدیہ ہوتا ہے یعنی نفس مہمل اور عدم تفکر کی بنا پر اس نے اپنے آپ کو نادان بنایا اور یہ زجاج کا قول ہے یا "اس نے اپنے آپ کو ہلاک کیا" یہ ابو عبیدہ کا قول ہے" [3] $\frac{1}{16}$

سَفَهًا : نادانی، کم عقلی، بیوقوفی سَفِهَ یَسْفَهُ کا مصدر ہے، واضح رہے کہ سَفَهٌ کا استعمال امور اخروی اور دنیاوی دونوں کے بارے میں ہوتا ہے چنانچہ سفہ دنیوی کے متعلق ارشاد ہے وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمْ (اور مت پکڑا دو

[1] تفسیر کبیر ج ۸ ص ۲۰۲ (طبع مصر ۱۳۲۴ھ) [2] الاتقان از امام سیوطی ج ۱ ص ۱۲۸ (طبع مصر) [3] روح المعانی ج ۱ ص ۲۷۷

بے عقلوں کو اپنے مال) اور سورۂ اخروی کے متعلق فرمایا ہے وَاَنَّہٗ کَانَ یَقُوْلُ سَفِیْہُنَا عَلَی اللّٰہِ شَطَطًا (اور یہ کہ ہم میں کا بیوقوف اللہ پر بڑھا کر باتیں کہا کرتا تھا) یہ دین کے بارے میں سفاہت و بیوقوفی کا بیان ہے، ۲۹ ۱۱

سُفَھَآءُ : بے وقوف، کم عقل، بے سمجھ، احمق، سَفِیْہٌ کی جمع، ۲ ۱ ۲ ۱ ۱۲ ۲ ۹ ۹

سَفِیْنَۃُ : کشتی، جہاز، سَفْنٌ سے جس کے معنی پوست اکھیڑنے اور کسی شے کو اوپر سے چھیلنے کے ہیں بروزن فَعِیْلَۃٌ بمعنے فَاعِلَۃٌ ہے چونکہ کشتی سطح آب کو چیرتی جاتی ہے اس لئے اس کا نام "سفینہ" ہوا، سَفَائِنُ اور سُفُنٌ جمع، ۱۵ ۲۲ ۱۶ ۱ ۲۰ ۱۴

سَفِیْھًا : بیوقوف، بے عقل سَفَہٌ اور سَفَاھَۃٌ سے بروزن فَعِیْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ واحد مذکر، ۳ ۲

سَفِیْہُنَا : ہم میں کا بیوقوف، سَفِیْہٌ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۲۹ ۱۱

فصل القاف

سِقَایَۃَ : پانی پلانا، پلانے کی جگہ، پینے کا برتن۔ "سقایہ" کے بارے میں مفسرین و اہل لغت کے اقوال سخت پریشان ہیں کوئی اس کو مکنوٗ یسقی کا مصدر بتاتا ہے اور کوئی اَسْقٰی کا اور کوئی مصدر کو معنے اسم فاعل بیان کرتا ہے اور کوئی کہتا ہے اس مکان کا نام ہے جہاں حاجیوں کو پینے کے لئے پانی دیا جاتا تھا، علامہ سید محمد رشید رضا مصری نے تفسیر المینار میں اس پر بڑی عمدہ تحقیقی بحث لکھی ہے جو درج ذیل ہے فرماتے ہیں:۔

"سقایہ لغت میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی وغیرہ پلایا جاتا ہے اسی معنی میں ہے جَعَلَ السِّقَایَۃَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْہِ (رکھ دیا پینے کا پیالہ اسباب میں اپنے بھائی کے) اسے سقایہ سے اس لئے موسوم کیا گیا کہ اس سے پلایا جاتا تھا اور صواع اس لئے کہا گیا کہ صاع کی طرح اس سے ناپا جاتا تھا، یہ مؤنث بھی استعمال ہوتا ہے اور مذکر بھی لسان میں (اسی طرح دوسری کتابوں میں) مذکور ہے، اور سقایہ وہ مقام ہے جس میں حج کے مواقع وغیرہ پر شراب (پینے کی چیز شربت، پانی وغیرہ) تیار کیا جاتا ہے (اس کے بعد کہا ہے) کہ حدیث میں آتا ہے ما ثر الجاھلیۃ تحت قدمی الا سقایۃ الحاج وسدانۃ البیت (جاہلیت کے قابل ذکر کارناموں میں سے ہر کارنامہ میرے

قدموں تلے ہے بجز حاجیوں کے پانی پلانے کے انتظام اور خانۂ کعبہ کی خدمت گزاری اور پاسبانی کے، کہ قریش حاجیوں کو پانی میں کشمش ڈال کر پلایا کرتے تھے اور حضرتِ عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں اس کے متولی رہے ہیں اور جس حدیث کو صاحبِ لسان نے بیان کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کی بعض روایات میں وارد ہوئی ہے۔

اور نووی نے الاسماء واللغات میں (اس سلسلہ میں) جو فرمایا ہے، حسبِ ذیل ہے :-

سقایۃ العباس رضی اللہ عنہ مسجد حرام (زادہ اللہ شرفاً) میں ایک مقام ہے جس میں لوگوں کے پینے کے لئے پانی کھینچا جاتا ہے، اس کے اور زمزم کے درمیان چالیس ہاتھ کا فاصلہ ہے، ازرقی نے اپنی کتاب تاریخ مکہ میں، نیز علماء نے بیان کیا ہے کہ سقایۃ چمڑے کے حوض تھے جو قصی بن کلاب کے زمانہ میں مکہ کے صحن میں رکھے جاتے تھے اور ان میں اونٹوں کے ذریعہ کنوئیں سے شیریں پانی کھینچا جاتا تھا، پھر قصی نے مرتے وقت سقایہ کا منصب اپنے بیٹے عبد مناف کے سپرد کیا اور وہ برابر عبد مناف کے ہی پاس رہا وہ اسے سرانجام دیتے رہے یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

میں (یعنی علامہ رشید رضا) کہتا ہوں اس مقام پر جو سقایۃ العباس سے موسوم ہے ایک عمارت تعمیر کردی گئی تھی جو اب تک قائم چلی آتی ہے، یہ چاہِ زمزم کی جانبِ جنوب ایک بڑا حجرہ ہے، مؤرخینِ مکہ نے اس کی پیمائش نیز زمزم اور کعبہ مشرفہ سے اس کے فاصلہ کا حال بیان کیا ہے۔

اور اس لفظ کے استعمال سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ اسم حرفہ بن گیا ہے اور اسی طرح حجابۃ جو بیت اللہ کی کلید برداری اور پاسبانی تھی اور یہ دونوں حرفے قریش کے نہایت شاندار کارنامے تھے اور اسی بنا پر اسلام نے ان دونوں کو برقرار رکھا اور یہ بالبداہۃ معلوم ہے کہ حضرتِ عباس رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ انا صاحب السقایۃ اور لوگوں کا بھی ان کے متعلق یہی کہنا اس سے یہ مراد نہیں لیا جائیگا کہ وہ اس مقام کے مالک تھے جہاں وہ پانی رکھا جاتا تھا جو کشمش یا اس میں خرما ڈال کر

شیریں کیا جاتا تھا اور نہ سقایہ سے وہ پانی مراد ہوگا، بلاشبہ اس سے مراد یہی ہے کہ وہ اس کام کے انتظام کے متولی ہیں یعنی کشمش اور خرما لاکر انہیں پانی میں ڈالنا اور اس کے برتنوں کو ان مقامات پر رکھنا جہاں آکر حاجی اس کو پیتے ہیں اور عجیب بات ہے کہ لغوی اور مفسر اس معنی سے غفلت کرے اور کوئی تو یوں کہے کہ وہ اس مکان کا نام ہے جہاں پانی پلایا جاتا تھا اور کوئی سقی یا اسقی کا مصدر بتائے (وغیرہ وغیرہ)" [۱]

آگے چل کر سید صاحب موصوف لکھتے ہیں :-

"موجودہ زمانہ میں حکومت سعودیہ کی توجہ ہر سال لاکھوں حاجیوں کے لئے پانی کی وافر مقدار مہیا کرنے اور اسے صاف ستھرا رکھنے کی طرف بڑھتی جاتی ہے لیکن شربت کا پلانا بہت زمانوں سے چھوٹ گیا ہے کیونکہ حجاج کی کثرت کی بنا پر یہ دشوار بن گیا ہے اور اگر حرمین کے اوقاف کے چوتھائی حصہ کا بھی جو اسلامی اطراف میں موجود ہیں انتظام کر کے حکومت حجاز کی طرف روانہ کیا جائے تو حکومت کے لئے اس کا اعادہ اور مکہ یا منیٰ میں اس کے لئے عام انتظام کرنا ممکن ہے" [۲] پ ۱۳-۱۴

سَقَرُ : آگ، دوزخ کے ایک طبقہ کا نام ہے-

علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس من جواہر القاموس میں رقمطراز ہیں :-

"سقر کے بارے میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ آتش کا نام سقر رکھ دیا گیا ہے، اس لفظ کے اشتقاق کا پتہ نہیں [۳]، اور معرفہ اور عجمہ ہونا منصرف ہونے سے مانع ہے اور بعض کا قول ہے کہ دوزخ کو سقر اس لئے کہا گیا کہ وہ جسم و روح کو تحلیل کر ڈالتی ہے اور یہ عربی نام ہے اہل عرب کے محاورہ سقرتہ الشمس سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں دھوپ نے اسے تحلیل کر دیا اور اسے لو لگ گئی اور جو اسے عربی اسم بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کے غیر منصرف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ معرفہ مؤنث ہے-"

علامہ ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں لکھا ہے :-

---

[۱] تفسیر المنار، ج ۱ ص ۲۱۶، ۲۱۷ (طبع مصر ۱۳۴۶ھ)
[۲] ایضاً ص ۲۱۸، ۲۱۹
[۳] امام سیوطی نے الاتقان میں جوالیقی سے نقل کیا ہے کہ عجمی لفظ ہے (الاتقان، ج ۱ ص ۱۳۸)

"سَقَر علمیت اور تانیث کی بنا پر غیر منصرف ہے اس کے وسط کی حرکت "زینب" کے حرف رابع کے قائم مقام ہے۔" (ج ۸ ص ۱۷۲)

راغب اصفہانی مفردات میں لکھتے ہیں:۔

"چونکہ سقر اصل میں جھلسانے کو چاہتا تھا اس لئے یہ فرمایا کہ وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا سَقَرُ۔ لَا تُبۡقِىۡ وَلَا تَذَرُ۔ لَوَّاحَةٌ لِّلۡبَشَرِ (اور تو کیا سمجھا کیسی ہے وہ آگ، نہ باقی رکھے اور نہ چھوڑے، جلا دینے والی ہے آدمیوں کو) متنبہ کر دیا گیا کہ مشاہدہ میں جو سقر کا احوال تم جانتے ہو اس سے معاملہ جداگانہ ہے۔" پ ۲۹ ع ۱۵

سُقِطَ: وہ گرا دیا گیا (نصر) سُقُوطٌ جس کے معنی گر پڑنے کے ہیں، ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب

امام ابو جعفر احمد بن علی مقری بیہقی اپنی کتاب نادر تاج المصادر میں رقمطراز ہیں:۔

"اور ارشاد الٰہی وَلَمَّا سُقِطَ فِىۤ اَيۡدِيۡهِمۡ یعنی وہ نادم ہوئے اس کے معنی ہوتے ہیں سقط الندم فی ایدیھم (ندامت ان کے ہاتھوں میں گر پڑی) اور ندامت کو ذکر نہیں کیا گیا ہے اور بعض کا قول ہے کہ سُقِطَ معول مالم یسم فاعلہ پر آیا ہے جس طرح کہ رغب فی" فلاں بولا جاتا ہے اور سُقِطتُ نہیں بولا جاتا جس طرح کہ رُغبتُ نہیں بولا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے رُغب فی" اور سقط فی یدہ بمعنی ندم کے اور سقط فی ایدیھم اور اسقط بھی مگر سقط کا استعمال زیادہ بھی ہے اور عمدہ بھی اور بعض نے اُسقِط کا انکار کیا ہے اور اس طرز استعمال کو نہ قرآن سے پہلے سنا گیا، اور نہ عرب اس سے واقف تھے اور یہ ترکیب کسی شے کے اوپر سے نیچے کی طرف آنے اور اس کے زمین پر گرنے کو بتاتی ہے پھر اس کے معنی میں وسعت کی گئی چنانچہ غلط بات کو سَقَطٌ (پڑی گری چیز) کہا جانے لگا کیونکہ انہوں نے اس کو بے ضرورت چیز کے مشابہ قرار دیا۔

اور ہاتھ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ ندامت دل میں پیدا ہوتی ہے اور اس کا اثر ہاتھوں میں ظاہر ہوتا ہے جیسے ارشاد الٰہی ہے فَاَصۡبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيۡهِ عَلٰى مَاۤ اَنۡفَقَ فِيۡهَا (پھر صبح کو رہ گیا ہاتھ نچاتا اس مال پر جو اس میں لگایا تھا) اور فرمایا وَيَوۡمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيۡهِ (اور جس دن کاٹ کاٹ کھلئے گا گنہگار اپنے ہاتھوں

کو) چنانچہ بسا اوقات ہاتھوں کی طرف اس فعل کی نسبت کردی جاتی ہے جو اس سے سرزد نہیں ہوا جیسے ارشادِ الٰہی ہے ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ (یہ اس کی وجہ سے ہے جو آگے بھیج چکے تیرے دو ہاتھ) پ ۹/۸

سَقَطُوْا : وہ گر پڑے، سُقُوْطٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۱۰/۱۳

سَقْفٌ : چھت، سُقُوْفٌ جمع اَلسَّقْفُ الْمَرْفُوْعُ (اونچی چھت) سے مراد آسمان ہے جو زمین کے لئے چھت کی بجائے ہے اور یا عرش عظیم جو تمام آسمانوں کے اوپر ہے، پ ۲۷/۳ **سَقْفًا** پ ۱۷/۳

سُقُفًا : چھتیں، اخفش نے اس کو سَقْفٌ کی جمع بتایا ہے جیسے کہ رَهْنٌ اور رُهُنٌ ہیں اور فراء نے سَقِيْفٌ (اس کے معنی بھی چھت ہی کے ہیں) کی جمع بیان کیا ہے جس طرح سے کہ كَثِيْبٌ اور كُثُبٌ بولتے ہیں۔ فراء نے یہی کہا ہے کہ اگر چاہو تو جمع الجمع بھی قرار دے سکتے ہو کہ سَقْفٌ کی جمع سُقُوْفٌ اور سُقُوْفٌ کی جمع سُقُفٌ ہے۔[1] پ ۲۵/۹

سُقْنٰهُ : ہم نے اس کو ہانک دیا، ہم اس کو ہانک لے گئے، (نَصَر) سُقْنَا سَوْقٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ۂ ضمیر واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو سَائِقٌ) پ ۲۲/۱۴

سُقُوْا : ان کو پلایا گیا، (ضَرَبَ) سَقْيٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَسْقِيْ) پ ۲۶/۶

سَقٰى : اس نے پلایا، سَقْيٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۲۰/۶

سُقْيٰهَا : اس کو پانی پلانا، سُقْيَا سَقْيٌ سے اسم ہے مضاف ہے اور هَا ضمیر واحد مؤنث غائب، مضاف الیہ سُقْيَا کی جمع سُقْيَاتٌ ہے جیسے حُبْلٰى کی حُبْلَيَاتٌ ہے، پ ۳۰/۱۶

سَقَيْتَ : تو نے پلایا، سَقْيٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، پ ۲۰/۶

سَقِيْمٌ : دکھی، بیمار، سُقْمٌ سے جس کے معنی بیمار ہونے کے ہیں، بروزن فَعِيْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ ہے، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں :-

"سَقَمٌ اور سُقْمٌ اس مرض کو کہتے ہیں جو بدن کے ساتھ مخصوص ہو اور "مرض" کبھی بدن میں ہوتا ہے اور کبھی نفس میں جیسے فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (ان کے دلوں میں بیماری ہے) اور ارشادِ الٰہی اِنِّيْ سَقِيْمٌ (میں دکھی ہوں)

[1] تاج العروس

یہ تعریض ہے یا زمانۂ ماضی اور مستقبل کی طرف اشارہ ہے یا اس تھوڑے سے دکھ کی طرف جو فی الحال موجود رہتا ہے کیونکہ انسان کو کوئی نہ کوئی خلل لگا ہی رہتا ہے اگرچہ وہ اسے محسوس نہ کرے۔ $\frac{۲۳}{۹،۷}$

سَقٰهُمْ: اس نے ان کو پلایا، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، (ملاحظہ ہو سَقٰی) $\frac{۲۹}{۱۹}$

فصل الکاف

سُکَارٰی: نشہ میں مست، سکریٰ سے جس کے معنی مست ہونے کے ہیں یا جمع مکسر ہے یا اسمِ جمع، امام تاج الدین ابو محمد بن مکتوم قیسی حنفی نحوی الدر اللقیط میں لکھتے ہیں:-

"سُکَارٰی مضموم کے بارے میں علماء کو اختلاف ہے، کہ آیا وہ جمع تکسیر ہے؟ سیبویہ نے تکسیرِ صفات کے بیان میں کہا ہے" اور کبھی بعض صفات کی فعالیٰ پر بھی تکسیر کرتے ہیں چنانچہ بعض سُکَارٰی اور عُجَالٰی بولتے ہیں فعالیٰ کے جمع ہونے پر یہ سیبویہ کی صاف تصریح ہے اور استاذ ابو الحسن بن الباذش کو وہم ہو گیا جو انہوں نے سیبویہ کی طرف یہ نسبت کر دی کہ یہ اسم جمع ہے نیز یہ کہ ابنیہ کے سلسلہ میں سیبویہ نے اس کو بیان بھی کیا ہے" ابن الباذش کا بیان ہے کہ قیاس بھی یہی ہے کیونکہ یہ ایسے وزن پر آیا ہے جس پر کبھی کوئی جمع آئی ہی نہیں حالانکہ ابنیہ کے سلسلہ میں سیبویہ کی اس کے سوا کوئی تصریح ہی نہیں کہ وہ جمع تکسیر ہے چنانچہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ فعالیٰ کا وزن اسم میں ہوتا ہے جیسے حبارٰی سمانیٰ، کبارٰی اور صفت نہیں ہوتا ہاں صرف اس صورت میں کہ اس کے وزن پر واحد کی تکسیر کر لی جائے جیسے عجالیٰ، سکارٰی اور کسالیٰ ہیں اور سیرافی نے اس کے بارے میں دونوں قول بیان کئے ہیں اور اسی کو ترجیح دی ہے کہ یہ جمع تکسیر ہے نیز یہ کہ سیبویہ کا کلام اسی پر دلالت کرتا ہے۔" [1]

اور امام ابن جنی المحتسب میں فرماتے ہیں:-

"سُکَارٰی بالضم اس کا ظاہر یہ ہے کہ یہ اسم مفرد غیر مکسر ہے جیسے کہ حبارٰی سمانیٰ اور سلامیٰ ہیں نیز یہ بھی جائز ہے کہ مکسر ہو اور ان الفاظ میں سے ہو کہ جو فعالیٰ کے وزن پر

[1] الدر اللقیط من البحر المحیط، ص ۲۵۵ (طبع مصر ۱۳۲۸ھ) بر حاشیہ البحر المحیط

پر آئے ہیں جیسے طُوَادُ، عُرَائِیُّ اور رُخَالٌ میں مگر اتنی بات ہے کہ الف کے ذریعہ سے مؤنث کر لیا گیا ہے جیسے کہ نُقَاوَةٌ کے استعمال میں ھَا کے ذریعہ تانیث کر لی گئی ہے، ابو علی نے اس کو نَقْوَةٌ کی جمع کہا ہے، نیز جس طرح کہ حِجَارَةٌ، ذِکَارَةٌ اور عِبَارَةٌ میں فعال کی تانیث کر لی گئی ہے اسی طرح اس کی بھی تانیث عمل میں آئی ہے[1]۔"

امام ابو بکر جصاص آیتِ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُکٰرٰی کی تفسیر میں رقمطراز ہیں کہ:-

"اس بارے میں اختلاف کیا گیا ہے کہ سکر سے اس آیت میں کیا مراد ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، ابراہیم، قتادہ نے شراب کا نشہ بیان کیا ہے، مجاہد، ابراہیم، قتادہ نے یہ بھی کہا ہے کہ شراب کی حرمت نے اس حکم کو منسوخ کر دیا ہے اور ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے خاص طور پر نیند کا نشہ مراد ہے۔

امام ابو بکر فرماتے ہیں کہ سکر میں صحیح تاویل یہ ہے کہ یہ شراب کا نشہ ہے اس کی دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ سونے والے کو اور جس کی آنکھوں میں نیند بھری ہو اسے سکران نہیں کہا جاتا اور جو شراب میں مست ہو اس کو حقیقت میں سکران کہا جاتا ہے اس لئے لفظ کو حقیقت پر محمول کرنا ضروری ہے اور بغیر کسی دلالت کے مجاز کی طرف پھیرنا روا نہیں دوسری وہ روایت جو سفیان نے عطاء بن السائب سے بواسطہ ابو عبد الرحمٰن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ ایک انصاری نے کچھ لوگوں کی دعوت کی اور پھر انہوں نے مے نوشی کی، پھر حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نمازِ مغرب کے لئے کھڑے ہوئے اور قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کی تلاوت کی تو متشابہ لگنے لگا، اس پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی (نزدیک جاؤ نماز کے جس وقت کہ تم نشہ میں ہو)"[2] س ک ت

سَکَتَ: وہ تھم گیا، اس نے خاموشی اختیار کی، (نصر) سُکُوْتٌ سے جس کے معنی خاموش ہونے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔

راغب لکھتے ہیں:-

"سکوت ترک کلام کے ساتھ مخصوص ہے اور چونکہ سکوت بھی سکون ہی کی ایک قسم ہے اس لئے

---

[1] تاج العروس

[2] احکام القرآن، ج۲، ص ۲۴۴ و ۲۴۵

ارشادِ الٰہی وَلَمَّا سَکَتَ عَنْ مُّوْسَی الْغَضَبُ (اور جب تھم گیا موسیٰ کا غصہ) میں سکوت بطورِ استعارہ سکون ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔"

سَکَرًا: جس چیز کا نشہ ہو، نبیذ، امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں:-

"سلف نے سَکَر کی تاویل میں اختلاف کیا، چنانچہ حسن اور سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ کھجور اور انگور کی جو چیز حرام ہو چکی ہے، سَکَر ہے اور جو اس میں حلال ہے "رزقِ حسن" ہے، اور ابراہیم، شعبی اور ابو رزین سے روایت ہے کہ سَکَر خمر ہے اور جریر نے حضرت عبد اللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ سے بھی بروایت مغیرہ عن ابراہیم یہی روایت کیا ہے اور ابن شبرمہ، ابو زرعہ بن عمرو بن جریر سے راوی ہیں کہ سَکَر شرابِ خرما ہے اور ان سب نے کہا ہے کہ اس کی اباحت تحریمِ خمر سے منسوخ ہو چکی ہے۔

اس کے بعد امام جصاص رازی اپنی سند سے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سَکَر کے معنی نبیذ کے اور رزقِ حسن کے معنی کشمش کے نقل کر کے یہ فرماتے ہیں:-

"جب کہ سلف نے اس کے معنی خمر اور نبیذ نیز خرما یا انگور کی اس چیز کے لئے ہیں کہ جس کا استعمال حرام ہے تو یہ ثابت ہوا کہ یہ اسم سب کے لئے استعمال ہوتا ہے اور ان کا یہ کہنا کہ تحریمِ خمر سے یہ حکم منسوخ ہے، اس بات کو بتاتا ہے کہ آیت اباحتِ سَکَر کی مقتضی ہے اور سَکَر خمر اور نبیذ ہے اور جس کا نسخ ثابت ہے وہ خمر ہے اور نبیذ کی حرمت ثابت نہیں لہٰذا ظاہرِ آیت سے نبیذ کی تحلیل ثابت ہے کیونکہ اس کا نسخ ثابت نہیں۔" [2]

ابنِ مردویہ نے بطریق عوفی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حبشی زبان میں سَکَر کے معنی سرکہ کے ہیں۔[3] $\frac{14}{15}$

سُکِّرَتْ: اس کی نظر بندی کر دی گئی، تَسْکِیْر سے جس کے معنی نظر بندی کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، $\frac{14}{1}$

سَکْرَتِهِمْ: ان کی مستی، ان کا نشہ، ان کی مدہوشی

[1] احکام القرآن، ج ۲، ص ۲۴۴ و ۲۴۵
[2] ملاحظہ ہو احکام القرآن، ج ۳، ص ۲۲۷ و ۲۲۸
[3] الاتقان، امام سیوطی، ج ۱، ص ۱۳۸ (طبع مصر)

سَکْرَتِهِمْ: مضاف ھِمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ

س ک ر

سَکْرَۃٌ: بے ہوشی، مدہوشی، مستی، راغب لکھتے ہیں کہ:-

"سکر وہ حالت ہے جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان پیش آتی ہے اور اکثر اس کا استعمال شراب کے بارے میں ہوتا ہے اور کبھی غضب و عشق کی بنا پر بھی یہ حالت طاری ہو جاتی ہے، شاعر کہتا ہے ع

سکران سکر ھوی و سکر مدام

نشۂ محبت اور شراب کی مستی سے مدہوش ہے

سکرات الموت اسی سے ماخوذ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَآءَتْ سَکْرَۃُ الْمَوْتِ (اور آگئی بیہوشی موت کی)"

علامہ مجدالدین فیروزآبادی بصائر ذوی التمیز فی لطائف کتاب اللہ العزیز میں فرماتے ہیں:-

"نزع کی سختی کے باعث عقل کے گڑبڑ ہو جانے کا نام "سکرۃ الموت" ہے [1] ۲۶/۱۶

سَکَنَ: وہ ٹھہرا، وہ بسا، وہ رہا، اس نے آرام پکڑا، سُکُوْنٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔

علامہ محمد مرتضیٰ زبیدی لغوی تاج العروس میں ابن الکمال سے ناقل ہیں:-

"سکون جس میں حرکت کی صلاحیت ہو، اس کے حرکت نہ کرنے کا نام ہے، پس جس میں متحرک ہونے کی صلاحیت نہ ہو اس سے حرکت کا نہ ہونا سکون نہیں ہوگا اور جو ایسا ہوگا وہ نہ متحرک ہوگا نہ ساکن"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:-

"ارشادِ الٰہی وَلَہٗ مَا سَکَنَ فِی اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ میں ابن الاعرابی نے سَکَنَ کے معنی حَلَّ (وہ فروکش ہوا) کے لئے ہیں اور ثعلب نے کہا ہے کہ ساکن کا استعمال انسان اور بہائم ہی کے لئے خاص ہے، سکن کا ترجمہ ہے حرکت کے بعد ٹھہر گیا اور یہاں اس کے معنی (اور اللہ تعالیٰ دانا تر ہے) پیدا کرنے کے ہیں"

غرض ابن الاعرابی کے قول پر آیت کا ترجمہ ہوگا "اور اسی کا ہے جو بستا ہے رات میں اور دن میں" اور ثعلب کے قول پر یہ معنی ہوں گے "اور اسی کا ہے جو پیدا کیا رات میں اور دن میں" (ملاحظہ ہو اُسْکُنْ) ۲/۸

سَکَنٌ: تسکین، آرام، رحمت، برکت، جس سے

---

[1] تاج العروس، ج ۳، ص ۲۷۵، مادہ سکر

سکون حاصل ہو، بسنے کی جگہ سُکُوْنٌ سے اسم ہے پ۱۱/۲، سکنا پ۱۸/۲، پ۲۱/۲

سَکَنْتُمْ: تم بسے تم آباد ہوئے، تم رہے سُکُوْنٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ۱۳/۱۹، پ۲۵/۱۷

سِکِّیْنًا: چھری، چاقو، سَکَاکِیْن جمع، لفظ سکین مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی اور غالب اس پر تذکیر ہی ہے، راغب لکھتے ہیں کہ اس کا نام سکین اس لئے ہوا کہ مذبوح کی حرکت کو زائل کر دیتی ہے، یہ سُکُوْنٌ سے بروزن فِعِّیْلٌ اسم مشتق ہے، پ۱۲/۱۴

سَکِیْنَتَہٗ: اس کی طرف کی تسکین، اس کی طرف کا اطمینان سَکِیْنَۃٌ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ۱۰/۱۲، پ۲۶/۱۱

سَکِیْنَۃٌ: تسکین، تسلی خاطر، اطمینان، سُکُوْنٌ سے بروزن فَعِیْلَۃٌ مصدر ہے جو اسم کی جگہ استعمال ہوا ہے، جیسے کہ عَزِیْمَۃٌ ہے [1]

علامہ لغوی سید محمد مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں :-

"سکینۃ وہ اطمینان، چین، قرار اور سکون ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندہ کے قلب میں اس وقت نازل فرماتا ہے جب کہ وہ ہولناکیوں کی شدت سے مضطرب ہو جاتا ہے پھر اس کے بعد جو کچھ بھی اس پر گزرے وہ اس سے گھبراتا نہیں، یہ اس کے لئے ایمان کی زیادتی یقین میں قوت اور استقلال کو ضروری کر دیتا ہے، اسی وجہ سے حق سبحانہ نے "یوم الغار" اور "یوم حنین" جیسے قلق و اضطراب کے مواقع پر اپنے رسول اور مؤمنین پر اس کے نازل کرنے کی خبر دی ہے۔" [2]

واضح رہے کہ قرآن مجید سکینۃ کا لفظ چھ جگہ استعمال ہوا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ بجز سورۂ بقرہ کے قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی "سکینہ" آیا ہے اس کے معنی اطمینان کے ہیں [3] سورۂ بقرہ کی جس آیت کا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے استثناء فرمایا ہے وہ آیۂ کریمہ اِنَّ اٰیَۃَ مُلْکِہٖٓ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ التَّابُوْتُ فِیْہِ سَکِیْنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ (طالوت کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ آوے تمہارے پاس ایک صندوق کہ جس میں تسلی خاطر ہے تمہارے رب کی طرف سے) یہاں "سکینہ" سے کیا مراد ہے، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے تو یہاں بھی حضرت عبد اللہ بن عباس

---

[1] غرائب القرآن و رغائب الفرقان معروف بہ تفسیر نیشاپوری ج ۲۶، ص ۲۷ (طبع مصر برحاشیہ تفسیر ابن جریر) [2] تاج العروس

رضی اللہ عنہما سے اطمینان ہی کے معنی روایت کئے ہیں[1]۔ اور یہی صحیح ہیں، اس کے علاوہ اس بارے میں تفسیر کی کتابوں میں جو بہت سی بے سروپا روایتیں منقول ہیں نہ عقلاً صحیح ہیں نہ نقلاً اور پھر سخت متعارض کہ ان کا باہم جمع کرنا غیر ممکن ہے[2] ۲/۲۶ ۹/۲۶ ۱۱/۲۶

فصل اللام

سَلْ: تو پوچھ، تو دریافت کر، سُوَالٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو اِسْئَلْ اور سُوَالٌ) ۲/ب

سَلَاسِل: زنجیریں، سِلْسِلَةٌ کی جمع، ۲۴/۱۳

سَلٰسِلَا ۲۹/۱۹

سُلَالَةٍ: چھنی ہوئی، نچوڑی ہوئی، نچوڑ، خلاصہ سَلٌّ سے جس کے معنی کسی چیز کو کسی چیز سے کھینچنے، سونتنے اور نچوڑنے کے ہیں، اسم مشتق ہے، ۱۸/۱ ۲۱/۱۴

سَلْمٌ: سلامتی، امان سلام، سالم، یہ سَلِمَ یَسْلَمُ کا مصدر ہے اس کے معنی عیوب و آفات سے سلامت رہنے، ان سے چھٹکارا پانے اور بری ہونے کے ہیں، امام راغب مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں :-

"سَلْمٌ اور سَلَامَةٌ کے معنی ہیں ظاہری اور باطنی آفتوں سے الگ رہنے کے، ارشاد ہے بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ یعنی ایسا دل جو دغا سے خالی ہو، یہ باطن کے بارے میں ہے اور مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا (بے عیب ہے کوئی داغ اس میں نہیں) یہ ظاہر کے بارے میں ہے سَلِمَ يَسْلَمُ سَلَامًا وَسَلَامَةً وسلمہ اللہ فرمایا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ (اور لیکن اللہ نے بچا لیا) اور ارشاد ہے اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ (جاؤ ان میں سلامتی سے بے کھٹکے) یہاں سلامتی مراد ہے، اسی طرح اِهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا (اتر سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے) ہے اور حقیقی سلامتی جنت کے سوا اور کہیں نہیں کیونکہ وہاں بقا ہے فنا نہیں، غنا ہے احتیاج نہیں، عزت ہے ذلت نہیں، صحت ہے بیماری نہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ (ان ہی کے لئے ہے سلامتی کا گھر اپنے رب کے ہاں) یہاں

---

[1] الدر المنثور، امام سیوطی، ج۱، ص۳۱۶ (طبع مصر) اور تفسیر فتح القدیر، ج۱، ص۲۳۹

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر المنار، ج۲، ص۴۴۸ (طبع

"سلام بمعنی سلامتی ہے اور وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ (اور اللہ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف) اور يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (جس سے اللہ ہدایت کرتا ہے اس کو جو تابع ہوا اس کی رضا کا سلامتی کی راہیں) ان سب جگہ سلامتی کے معنی ہو سکتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ السلام اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے اور اسی طرح لَهُمْ دار السلام کے بارے میں کہا گیا ہے[1] اور اَلسَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ (سب عیوب سے سالم، امان دینے والا، پناہ میں لینے والا) کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سلام ہے اس لئے موصوف کیا گیا کہ جس طرح خلق کو عیوب و آفات ہوتی ہیں اس کو لاحق نہیں ہوتیں اور فرمایا سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (سلام، بولنا ہے رب مہربان سے) سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (سلامتی تم پر بدلے اس کے کہ تم نے صبر کیا سو خوب ملا عاقبت کا گھر) سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ (سلام ہے الیاس پر) یہ سب (یعنی سلام علیک) لوگوں کی جانب سے تو بذریعہ قول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے فعل یعنی جنت میں جس سلامتی کے ہونے کا سابق میں مذکور ہوا ہے اس کو عطا فرمانا۔

اور آیہ شریفہ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (اور جب بات کرنے لگیں ان سے بے سمجھ لوگ تو کہیں صاحب سلامت) کا مطلب یہ ہے کہ ہم تم سے سلامتی چاہتے ہیں اس صورت میں سَلٰمًا کو نصب اضمار فعل کی بنا پر ہوگا (اور نطلب کو مضمر مانا جائے گا) اور بعض نے کہا ہے کہ قَالُوْا سَلٰمًا کے معنی ہیں اچھی بات کہنے کے، اس صورت میں یہ مصدر محذوف (یعنی قَوْلًا) کی صفت ہوگا اور آیہ شریفہ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ (جب اندر پہنچے اس کے پاس تو بولے سلام، وہ بولا سلام ہے) میں ثانی پر رفع (پیش) اس لئے ہے کہ دعا کے باب میں رفع زیادہ بلیغ ہے، گویا اس ادب کا لحاظ رکھا جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا (اور جب تم کو دعا دے کوئی تو تم بھی دعا دو

[1] اس صورت میں "دار السلام" کے معنی اللہ کے گھر اور "سبل السلام" کے معنی اللہ کی راہوں کے ہوں گے۔

اس سے بہتر)۔

اور آیہ شریفہ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيمًا إِلَّا قِيلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (نہیں سنیں گے وہاں بکواس اور نہ گناہ کی بات مگر ایک بولنا سلام سلام) تو یہ چیز ان کے واسطے صرف قول ہی قول سے نہیں ہوگی بلکہ قول اور فعل دونوں کے ذریعہ ہوگی اور اسی طرح آیہ کریمہ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ أَصْحٰبِ الْيَمِينِ (تو سلامتی پہنچے تجھ کو رہنے والوں سے) ہے۔

اور آیہ شریفہ وَقُلْ سَلٰمٌ (اور کہہ سلام) اس کا ظاہر مطلب تو یہ ہے تو ان پر سلام کر اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا ان کفار سے مطالبہ ہے اور یہ جو فرمایا ہے سَلٰمٌ عَلٰى نُوحٍ فِي الْعٰلَمِينَ (سلام ہے نوح پر سارے جہان والوں میں) سَلٰمٌ عَلٰى مُوسٰى وَهٰرُونَ (سلام ہے موسیٰ اور ہارون پر) سَلٰمٌ عَلٰى إِبْرٰهِيمَ (سلام ہے ابراہیم پر) یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امر کا بیان ہے کہ ان کو اس حیثیت کا بنایا ہے کہ ان کی ثنا کی جاتی رہے گی اور ان کے لئے دعا ہوتی رہے گی"۔

امام سہیلی الروض الانف میں فرماتے ہیں:۔

اکثر اہل لغت اس طرف گئے ہیں کہ رضاع اور رضاعۃ کی طرح سلام اور سلامۃ کے بھی ایک ہی معنی ہیں اور اگر وہ کلام عرب میں تامل کرتے اور ہاء تانیث اس میں جس قسم کی تحدید پیدا کرتی ہے اور اس پر غور کرتے تو ان کا نظر آتا کہ ان دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے۔

اور اللہ جل جلالہ کو سلام کہا جاتا ہے کہ تمام خلق کے لئے اختلال اور تفاوت سے سالم رہنے کو اس نے وسیع اور عام کر دیا ہے کیونکہ ہر چیز نظام حکمت پر چل رہی ہے اسی طرح جن و انس حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے کسی ظلم یا جور کے ہونے سے سلامت ہیں پس اللہ تعالیٰ اپنے تمام افعال میں "سلام" ہے کہ نہ زیادتی ہے نہ ظلم، نہ فرق ہے نہ خلل۔

اور مفسرین میں سے جس نے اس اسم کے متعلق یہ دعویٰ کیا کہ حق سبحانہ کو اس سے اس لئے موسوم کیا جاتا ہے کہ عیوب و آفات سے سالم ہے تو اس نے نامناسب بات کی، سلام وہ ہے جس سے دوسرا سلامت رہے اور سالم وہ ہے جو دوسرے سے سلامت رہے، دیوار

کو بھی نہیں کہا جاتا کہ وہ نکان سے سالم ہے اور نہ پھر کو کہا جاتا ہے کہ وہ زکام سے سالم ہے سالم اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جس پر آفت کا آنا ممکن اور متوقع ہو اور پھر وہ اس سے سلامت رہے اور حق سبحانہ آفتوں کے واقع ہونے اور نقائص کے آنے سے منزہ ہیں اور جس کی یہ صفت ہو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جائیگا کہ وہ ان سے سلامت رہا اور نہ اسے سالم سے موسوم کیا جائیگا، ان لوگوں نے سلام کو سالم کے معنی میں کر دیا جو چیز ہم نے پہلے ذکر کی اکثر سلف کے قول سے وہی مراد ہے اور سلامۃ سلام کے خصائل میں سے صرف ایک خصلت ہے[۱]،،

امام ابن جریر طبری نے قتادہ سے سلام کے معنی یہی نقل کئے ہیں السلام ھو الذی یسلم خلقہ من ظلمہ[۲] (سلام وہ ذات ہے کہ جس کے ظلم سے اس کی مخلوق سالم رہے)

پ ۵/۱۰، پ ۶/۷، ش ۹/۲،۱۲، پ ۱۱/۶،۸، بہ ۱۲/۴،۷، پ ۱۳/۹،۱۶، پ ۱۴/۴،۱۰، پ ۱۶/۳،۴،۵،۶،۱۱، پ ۱۹/۲۰، پ ۲۰/۹، پ ۲۲/۳، پ ۲۳/۴،۷،۸،۹، پ ۲۴/۵، پ ۲۵/۱۴، پ ۲۶/۷،۱۹، پ ۲۷/۱۶، ش ۲۸/۶، پ ۳۰/۲۲

سَلَامًا پ ۱۲/۷، پ ۱۴/۴، پ ۱۶/۷، پ ۱۷/۵، پ ۱۹/۴، پ ۲۶/۱۹، پ ۲۷/۱۴

سَلْسَبِيلًا سلسبیل جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے[۳] جس کے معنی ہیں "بہتا ہوا صاف پانی" جو البیقی کا بیان ہے کہ عجمی لفظ ہے[۴]، ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ میں نے سلسبیل کو قرآن کے سوا اور کہیں نہیں سنا اس صورت پر اس کے اشتقاق کا پتہ نہیں لگایا جا سکتا[۵] اور زمخشری کشاف میں لکھتے ہیں :-

"شراب، سلسل، سلسال و سلسبیل بولا جاتا ہے، اس میں ترکیب کے اندر با زائد کر دی گئی ہے جس سے کلمہ خماسی ہو گیا ہے اور انتہائی خوش گواری پر دلالت کرتا ہے، زجاج کا بیان ہے کہ سلسبیل لغت میں اس چیز کی صفت ہے جس میں انتہائی خوشگواری ہو"[۶]

علامہ ابوحیان، زمخشری کے بیان کو نقل کر کے لکھتے ہیں :-

"اگر زمخشری کی مراد یہ ہے کہ با حقیقت میں زائد کر دی گئی تو درست نہیں کیونکہ علم نحو کے اندر ب ان حروف میں سے نہیں ہے کہ جو زیادت کے لئے مقرر ہیں اور اگر یہ مطلب ہے

[۱] تاج العروس [۲] جامع البیان فی تفسیر القرآن معروف بہ تفسیر ابن جریر، ج ۲۸، ص ۳۴ (طبع میمنیہ مصر) [۳] الاتقان، ج ۱، ص ۱۳۹ (طبع مصر) [۴] ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے یہ روایت کیا ہے (ملاحظہ ہو فتح الباری، ج ۸، ص ۲۴۵) [۵] تفسیر کبیر، ج ۸، ص ۳۸۱ (طبع عامرہ مصر)
[۶] کشاف، ج ۴، ص ۱۷۰ (طبع مصر)

کہ حرف بار اشارِ کلمہ میں آگیا ہے اور سلسل اور سلسال میں نہیں ہے تو صحیح ہے اور یہ الفاظ میں سے ہوگا کہ جو معنی میں متفق ہیں اور مادہ میں مختلف ہیں [1]۔ ۲۹/۱۹

سِلْسِلَةٍ: زنجیر، سَلَاسِل وجمع "سلسلة" کے معنی اصل میں ایک شے کے دوسری شے سے اتصال کے ہیں، زنجیر میں بھی چونکہ کڑیاں ایک دوسرے سے ملی ملی ہوتی ہیں اس لئے اس کو سلسلة کہتے ہیں۔ ۲۹/۵

سُلْطٰنٍ: زور، قوت، حجت، برہان، سند، حکومت، تاج العروس میں ہے:۔

"سلطان" کے معنی حجت و برہان کے ہیں، اسی معنی میں ارشادِ الٰہی ہے لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (نہیں نکل سکنے کے بدوں سند کے) اور کبھی اس سے معجزہ بھی مراد لیا جاتا ہے چنانچہ فرمایا ہے اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (جب بھیجا ہم نے اس کو فرعون کے پاس دیکر کھلی سند (یعنی معجزہ) اور جب "سلطان" کے معنی حجت ہوں تو اس کی جمع نہیں آتی کیونکہ اس صورت میں وہ مصدر کا قائم مقام ہوتا ہے

محمد بن یزید نے کہا ہے کہ سلیط سے جس کے معنی زیتون کے تیل کے ہیں، اس کے روشن کرنے کی بنا پر ماخوذ ہے کیونکہ دلیل ایسی ہونی چاہیے جو روشن ہو، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں ہر جگہ سلطان بمعنی حجت (دلیل) ہے اور بصائر میں ہے کہ حجت کو سلطان اس لئے کہا گیا ہے کہ دلوں پر اس کا دباؤ ہوتا ہے لیکن اکثر اس کا تسلط اہلِ علم و حکمت ہی پر ہوتا ہے اور لیث نے کہا ہے کہ سلطان کے معنی بادشاہ کی طاقت نیز اس شخص کی طاقت کے ہیں جو گو بادشاہ نہ ہو مگر اس کو شاہی طاقت حاصل ہو جیسے کہتے ہیں قد جعلت لك سلطانا علی اخذ حقی من فلاں (فلاں سے میرا حق لینے کے لئے میں نے تیرے لئے سند کردی ہے اور اس کے لام کو ضمہ بھی دیا جاتا ہے، یہ لفظ مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ ابن السکیت کا بیان ہے کہ سلطان مؤنث ہے بولا جاتا ہے قضیت بہ علیہ السلطان اور قد آمنتہ السلطان، ازہری نے کہا ہے کہ چونکہ سلطان کا لفظ

[1] البحرالمحیط، ج۸، ص ۳۹۸

مذکر ہے اس لئے کبھی مذکر بھی استعمال ہوا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ پ ۸/۱۶ ۱۱/۱۲ ، ۹ ، ۱۲/۱۵ ۱۳/۱۶،۱۴ ۱۴/۹،۳ ۱۵/۱۴،۷ ۱۸/۳ ۱۹/۱۷ ۲۲/۹ ۲۳/۹،۶ ۲۴/۱۱،۹،۸ ۲۵/۱۴،۳ ۲۷/۱۲،۵،۳

سُلْطٰنًا پ ۸/۱۱ ۵/۹،۱۸ ۶/۲ ۷/۱۵ ۱۵/۹،۶ ۱۷/۱۶ ۲۰/۷ ۲۱/۷ -

سُلْطٰنُہٗ: اس کا زور، سُلْطَان مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱۴/۱۹

سُلْطٰنِیَہْ: میری حکومت، سُلْطَانِ مضاف، یْ ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، ہْ سکتہ کی ہے، پ ۲۹/۸

سَلَّطَہُمْ: اس نے ان کو زور دیا، اس نے ان کو مسلط کیا، سَلَّطَ تَسْلِیْطٌ سے جس کے معنی مسلط کرنے اور غلبہ دینے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ہُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، پ ۵/۹

سَلَفَ: وہ ہو چکا، وہ گزر گیا (نصر) سَلَفٌ سے جس کے معنی گزرنے اور ہو چکنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب پ ۳/۶ ۴/۱۵،۱۴ ۷/۳ ۹/۱۹

سَلَفًا: گیا گزرا، اصل میں مصدر ہے اور بطور اسم کے متقدم یعنی گزرے ہوئے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، پ ۲۵/۱۱

سَلَقُوْکُمْ: وہ تم سے چڑھ چڑھ بولے، وہ تم سے بڑھ بڑھ کے بولے (ضرب) سَلَقُوْا سَلْقٌ سے جس کے معنی زبان سے ستانے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، پ ۲۱/۱۸

سَلَکَ: اس نے چلائیں (نصر) سَلْکٌ سے جس کے معنی چلانے اور داخل کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۱۶/۱۱

سَلَکَکُمْ: اس نے تم کو چلایا، اس نے تم کو داخل کیا، اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے، پ ۹/۱۶

سَلَکْنٰہُ: ہم نے اس کو گھسا دیا، ہم نے اس کو داخل کر دیا، ہم نے اس کو چلایا، سَلَکْنَا سَلْکٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ ۱۹/۱۵

سَلَکَہٗ: اس نے اس کو چلایا، اس نے اس کو داخل کیا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے۔ پ ۲۳/۱۶

سَلَمٌ: صلح، اسم ہے، مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی، پہ ۲۶/۸

سِلْمٌ: اسلام، اسم ہے، مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، پ ۲/۹

سَلَمٌ: صلح، انقیاد، فرمانبرداری و اطاعت، عاجزی، تسلیم سے بمعنی سپرد کرنے کے، اسم ہے،

(ملاحظہ ہو تَسْلِیْمًا) ۱۴/۹، ۱۰/۵، ۱۸/۱

سَلَمًا: پورا، سالم، سَلِمَ یَسْلَمُ کا مصدر ہے جس کے معنی خالص اور پورے طور پر کسی دوسرے کے لئے ہو جانے کے آتے ہیں، ۲۳/۱۷

سَلَّمَ: اس نے بچا لیا، تَسْلِیْمٌ سے بمعنی بچانے کے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تَسْلِیْمًا ۱/۴

سُلَّمٌ: سیڑھی، زینہ، سیڑھی کے ذریعہ چونکہ آدمی سلامتی کے ساتھ اوپر پہنچ جاتا ہے اس لئے اس کا نام سُلَّمٌ ہوا، سَلَالِمُ اور سَلَالِیْمُ جمع، ۲۷/۷

سَلَّمْتُمْ: تم نے حوالہ کر دیا، تم نے سپرد کر دیا، تم نے سونپ دیا، تَسْلِیْمٌ سے بمعنی سپرد کرنے کے، ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو تَسْلِیْمًا) ۲/۱۴

سَلِّمُوْا: تم سلام کرو، تم سلام بھیجو، تَسْلِیْمٌ سے بمعنی سلام کرنے کے، امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۲۲/۴

سَلْوٰی: سلوٰی ایک پرندہ ہے جس کو بٹیر کہتے ہیں قاموس میں اس کا واحد سَلْوَاۃٌ مرقوم ہے اور صحاح میں اخفش سے منقول ہے کہ میں نے اس کا واحد نہیں سنا، ان کا بیان ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا واحد جمع ہی کی طرح ہے[۱]، ۱/۶، ۹/۱۰، ۱۶/۱۳

سَلْهُمْ: ان سے پوچھ، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو سَلْ) ۲۹/۴

سَلِیْمٌ: چنگا، بے روگ، ستھرا، نروگا، سَلَامَتٌ سے صفت مشبہ کا صیغہ (ملاحظہ ہو سَلَامٌ)

۱۹/۹، ۲۳/۷

سُلَیْمَانُ: سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام مشہور جلیل القدر نبی کا اسم گرامی جو حضرت داؤد علیہ السلام کے فرزند ارجمند تھے اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپ کی ذاتِ بابرکات میں نبوت اور سلطنت دونوں کو مکمل طور پر جمع فرمایا اور ایسی بادشاہی عطا فرمائی جو اگلوں پچھلوں میں سے کسی کو نصیب نہ ہوئی، جن، ہوا اور پرندوں کو آپ کے لئے مسخر فرمایا، سب جانوروں کی بولیاں جانتے تھے، چیونٹی تک کی بات سمجھ لیتے، آپ کے فضائل و کمالات اور آپ کی پیغمبرانہ سیرت کا تذکرہ جابجا قرآن مجید میں تفصیل سے مذکور ہے، حافظ ابوحیان اندلسی البحر المحیط میں لکھتے ہیں:-

"سلیمان عجمی نام ہے علمیت اور عجمہ کی بنا پر غیر منصرف ہے، عجمیت میں اس کی نظیر اس امر میں کہ اس کے بھی آخر میں الف اور نون ہو

[۱] تاج العروس

ھامان، ماھان اور سامان میں اور اس کا غیر منصرف ہونا، علمیت اور الف و نون کی زیادت کی بنا پر نہیں کیونکہ الف و نون کا زیادہ ہونا اشتقاق و تصرف پر موقوف ہے اور عجمی ناموں میں اشتقاق و تصریف کا دخل نہیں ہوتا" [1]

آپ کی والدہ ماجدہ بھی بڑی عابدہ و صالحہ تھیں سنن ابن ماجہ میں حضرتِ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرتِ سلیمان بن داؤد علیہما السلام کی ماں نے حضرتِ سلیمان علیہ السلام سے کہا تھا کہ بیٹا رات میں زیادہ نہ سونا کیونکہ رات میں زیادہ سونا مرد کو قیامت کے دن محتاج کر کے چھوڑتا ہے [2]

فصلِ خصومات میں اصابت رائے کا ملکہ بچپن ہی سے آپ کو عطا ہوا تھا صحیح بخاری میں حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دو عورتیں تھیں جن کے ساتھ ان کے دو بیٹے تھے بھیڑیا آیا اور دونوں میں سے ایک کے لڑکے کو لیکر چلتا بنا جس کو یہ حادثہ پہنچا تھا وہ کہنے لگی تیرے لڑکے کو اٹھا کر لے گیا ہے دوسری بولی نہیں، تیرے لڑکے کو لے گیا ہے چنانچہ حضرتِ داؤد علیہ السلام کے پاس فیصلہ کے لئے پہنچیں، آپ نے بڑی کے حق میں فیصلہ صادر فرمایا پھر وہ حضرتِ سلیمان علیہ السلام کے سامنے آئیں اور ان سے اس واقعہ کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا کہ میرے پاس چھری لاؤ میں اسے کاٹ کر دونوں کو دے دوں، تب چھوٹی کہنے لگی اللہ آپ پر رحم کرے ایسا تو نہ کیجئے یہ اسی کا بیٹا ہے اس پر آپ نے چھوٹی کے حق میں فیصلہ فرما دیا،

نیز صحیح بخاری میں حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ ایک زبردست جن گذشتہ شب اچانک ظاہر ہوا تا کہ میری نماز میں خلل ڈالے، حق تعالیٰ شانہ نے مجھے اس پر قابو عطا فرمایا، میں نے اسے پکڑ لیا اور ارادہ کیا کہ اسے مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون سے باندھ دوں کہ تم سب اسے دیکھ لو، پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان کی دعا یاد آئی رَبِّ هَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنۢ بَعْدِي (اور بخش مجھ کو وہ بادشاہی کہ نہ پھبے کسی کو میرے پیچھے) تو میں نے اس کو ذلیل کر کے لوٹا دیا [3]، امام احمد، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے حضرتِ عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت کیا

---

[1] البحر المحیط، ج ۱، ص ۳۱۸، ۳۱۹ (طبع مصر ۱۳۵۱ھ) [2] سنن ابن ماجہ، ص ۹۵ (طبع فاروقی دہلی)

[3] ان دونوں روایتوں کے لئے ملاحظہ ہو صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، قول اللہ تعالیٰ ووھبنا لداؤد سلیمان۔

سلیمان علیہ السلام نے جب بیت المقدس کی تعمیر کی تو اللہ عز وجل سے تین چیزیں مانگیں، دو چیزیں تو اللہ نے ان کو عطا فرمائیں اور ہمیں امید ہے کہ تیسری ہمارے لئے ہو وہ حکم مانگا جو اس کے حکم کے موافق ہو اور اللہ نے عطا فرمایا، وہ بادشاہی مانگی جو آپ کے بعد کسی کے لئے مناسب ہو اور اللہ نے عطا فرمائی، یہ مانگا کہ جو شخص بھی گھر سے چلے اور اس کا ارادہ اس مسجد میں نماز ادا کرنے کے سوا اور کچھ نہ ہو تو وہ اپنے گناہ سے اس طرح نکل جائے جیسا کہ اس دن جب کہ اس کی ماں نے اسے جنا تھا، ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ چیز اللہ نے ہمیں عطا فرمادی[1]۔

انگشتری سلیمان کا جو قصہ مشہور ہے وہ اسرائیلی فسانہ ہے جس کی کوئی اصل و حقیقت نہیں ہے۔ ب ۱۲

ب ۳ ۶ ب ۱۹ ۷ ب ۶ ۱۷ ب ۱۶، ۱۷، ۱۸ ۱۹ ب ۸ ۲۲ ب ۱۲ ۲۳

فصل المیم

سَمٌّ: ناکہ، سوراخ، ہر تنگ سوراخ کو سَمّ کہتے ہیں جیسے کہ سوئی کا ناکہ اور ناک اور کان کا بندھا ہوا سوراخ ہوتا ہے، سُمُوْمٌ جمع، ب ۸ ۱۲

سَمَاء: آسمان، ابر، بارش، امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں :-

"ہر شے کا جو بالا ہے وہ سماء ہے، بعض نے کہا ہے کہ ہر سماء اپنے نیچے کی نسبت سے سماء اور اپنے اوپر کی نسبت سے ارض ہے بجز سماء علیا کے کہ وہ سماء ہی ہے، ارض نہیں ہے، اور آیت شریفہ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (اللہ وہ ہے جس نے بنائے سات آسمان اور زمین بھی اتنی ہی) کو اسی پر محمول کیا ہے۔

نیز مطر (بارش، مینہ) کو سماء سے موسوم کیا گیا کیونکہ وہ اسی سے نکلتا ہے بعض نے کہا ہے کہ جب تک زمین پر نہ گرے سماء سے موسوم ہے ایسا اسی اعتبار سے ہے جو سابق میں مذکور ہوا اور نبات (ہر اگنے والی چیز) کا نام سماء رکھا تو اس بنا پر رکھ گیا کہ وہ مطر سے جو کہ سماء ہے وجود میں آتا ہے اور یا اس لئے کہ زمین سے مرتفع ہوتا ہے۔

اور وہ سماء جو ارض کے مقابل ہے مؤنث چلے در کبھی مذکر بھی آتا ہے اور واحد اور جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ ارشاد ہے ثُمَّ

[1] البدایہ والنہایہ، ج۲، ص ۲۶ (طبع مصر ۱۳۵۱ھ)

اِسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ (پھر قصد کیا آسمان کی طرف، سو ٹھیک کر دیا ان کو) اور کبھی اس کی جمع میں سمٰوٰت بھی کہا جاتا ہے فرمایا خَلَقَ السَّمٰوٰتِ (پیدا کیا آسمانوں کو) قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ (پوچھ کون ہے رب آسمانوں کو) اور اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ (آسمان پھٹ جائیگا اس دن میں) فرمایا تو مذکر استعمال کیا اور اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (جب آسمان پھٹ جائے) اور اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (جب آسمان چر جائے) کہا تو مونث استعمال کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نخل اور شجر اور ان کے قائم مقام دیگر اسماء اجناس کی طرح ہے کہ مذکر بھی استعمال کئے جاتے ہیں اور مؤنث بھی[1] اور واحد نیز جمع کے لفظ سے ان کی تعبیر کی جاتی ہے۔

جو سماء کہ بمعنی مطر (یعنی بارش) ہے وہ مذکر ہی استعمال ہوتا ہے اور اس کی جمع اَسْمِیَةٌ آتی ہے۔"

اور ابن خالویہ لغوی لکھتے ہیں :-

"ہر وہ شے جو تم پر بلند ہو سماء ہے اور اسی لئے گھر کی چھت سماء سے موسوم ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ یعنی ان کافروں میں سے جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد کرنے میں جس کو بھی یہ خیال ہو کہ اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہ فرمائے گا، فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ (اسے چاہئے کہ ایک رسی تان لے) اِلَى السَّمَآءِ یعنی گھر کی چھت میں ثُمَّ لْيَقْطَعْ پھر گلا گھونٹ ڈالے) فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ اب دیکھے کچھ جاتا رہا اس کی اس کی اس تدبیر سے اس کا غصہ"[2]

امام نووی تہذیب الاسماء والصفات میں رقمطراز ہیں:-

"سماء یہی سقف معروف (آسمان) ہے، سُمُوّ سے مشتق ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں اس میں دونوں لغتیں ہیں، تذکیر بھی اور تانیث بھی،

[1] واضح رہے کہ مفرداتِ راغب کے مطبوعہ نسخہ میں طباعت کی غلطی کی وجہ سے عبارت اس طرح چھپ گئی ہے ووجہ ذلک انہا کالنخل فی الشجر و مایجری مجراہ من اسماء الجنس الذی یذکر ویؤنث، لیکن تاج العروس میں یہ عبارت اس طرح منقول ہے ووجہ ذلک انہ کالنخل و الشجر وما یجری مجراہما من اسماء الاجناس التی تذکر وتؤنث، ہم نے اسی عبارت کو سامنے رکھ کر ترجمہ کیا ہے۔

[2] کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم، ص ۳۷، ۳۸ (طبع دار الکتب المصریہ ۱۳۶۰ھ)

ابوالفتح ہمدانی نے کہا ہے تذکیر تین وجوہ میں سے کسی ایک وجہ کی بنا پر ہوتی ہے اول یہ کہ جہت کے معنی ہوں، دوسرے باعتبار لفظ کے تیسرے اس بنا پر کہ وہ جمع مذکر ہے خواہ جمع واقع ہوئی ہو یا نہ ہو اس صورت میں یہ سماءؔ کی جمع ہوگا جیسے عطا عطاءؔ کی جمع ہے، ابوالفتح نے اس کو جمع سے ہی موسوم کیا ہے جو اہلِ لغت کی اصطلاح ہے لیکن اہلِ نحو و صرف اس کو اسمِ جمع یا اسمِ جنس سے موسوم کرتے ہیں اور اس کو جمع نہیں کہتے، ابوالفتح کا بیان ہے کہ تانیث دو وجہوں سے ہوتی ہے ایک یہ کہ وہ ان اسماء کے باب سے ہے جو تانیث کے لئے موضوع ہیں جیسے اتان اور عناق ہیں دوسرے یہ کہ وہ اہلِ حجاز کی لغت پر سماءؔ کی جمع ہے کیونکہ وہ اس قسم کو مؤنث استعمال کرتے ہیں چنانچہ ھٰذہ الصخر ھٰذہ التمر اور ھٰذہ السعیر کو بمعنی صخور اور تمور بولتے ہیں۔“ [۱]

۱ — ۲، ۳، ۴ ۔ ۲ — ۱، ۴ ۔ ۳ — ۹ ۔ ۶ — ۲ ۔ ۷ — ۵، ۷، ۱۰، ۱۸ ۔ ۸ — ۲، ۱۲

۹ — ۲، ۱۰، ۱۶، ۱۸ ۔ ۱۱ — ۸، ۹، ۱۲ ۔ ۱۲ — ۴، ۵ ۔ ۱۳ — ۸، ۱۶، ۱۷، ۱۸

۱۴ — ۲، ۸، ۱۴، ۱۷ ۔ ۱۵ — ۱۰، ۱۱، ۱۷، ۱۸ ۔ ۱۶ — ۱۱ ۔ ۱۷ — ۱، ۲، ۳، ۷، ۹، ۱۱

۱۷ — ۱۵، ۱۶ ۔ ۲۰ — ۱، ۲، ۱۴، ۱۶ ۔ ۲۱ — ۲، ۶، ۸، ۱۰، ۱۴، ۱۹ ۔ ۲۳ — ۱۹ ۔ ۲۴ — ۷، ۱۴، ۱۶

۲۵ — ۷، ۱۳، ۱۴، ۱۷ ۔ ۲۶ — ۱۵، ۱۸ ۔ ۲۷ — ۲، ۳، ۴، ۸، ۱۱، ۱۲، ۱۴، ۱۹

۲۹ — ۱، ۲، ۵، ۷، ۹، ۱۱، ۱۳، ۲ ۔ ۳۰ — ۱، ۴، ۶، ۷، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۱

۳۰ — ۱۳، ۱۶

سَمّٰعُوْنَ: خوب کان لگا کر سننے والے، جاسوس، سَمْعٌ سے مبالغہ کا صیغہ جمع مذکر سَمَّاعٌ کی جمع، واضح رہے کہ خوب کان لگا کر سننا کبھی تو جاسوسی کے لئے ہوتا ہے اور کبھی قبول کرنے اور ماننے کے لئے، چنانچہ سَمَّاعٌ کا استعمال جاسوس اور مطیع دونوں کے لئے ہوتا ہے، یہاں بھی دونوں معنی بن سکتے ہیں بعض مفسرین نے پہلے معنی اختیار کئے ہیں اور بعض نے دوسرے، ۶ ب ۱۳

سِمَانٌ: موٹی، سَمِیْنٌ کی جمع (ملاحظہ ہو سَمِیْنٌ) ۱۲ ب ۹

سَمْعٌ: قوتِ سامعہ، کان، سننا، پہلے دونوں معنی کے اعتبار سے اسم ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے سَمِعَ یَسْمَعُ کا مصدر، امامِ راغب مفردات میں تحریر فرماتے ہیں:-

”کان کی وہ قوت کہ جس سے آوازیں دریافت کی جاتی ہیں، سَمْعٌ ہے اور اس کے فعل کو بھی

[۱] تہذیب الاسماء واللغات، ج ۱، ص ۱۵۶ (طبع منیریہ مصر)

سَمْعٌ کہتے ہیں سَمِعَ سَمْعًا آتا ہے اور کبھی سمع سے کان مراد لیا جاتا ہے جیسے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ (اللہ نے مہر کر دی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر) اور کبھی بلفظ سماع کی طرح اس کا فعل (یعنی سننا) مراد ہوتا ہے جیسے اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (وہ تو سننے سے برطرف کر دیئے گئے ہیں) اور ارشاد ہے اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ (یا توجہ سے سماعت سے کام لے دل لگا کر) اور کبھی سمجھنا اور کبھی ماننا اس سے مراد لیا جاتا ہے بولتے ہو اِسْمَعْ مَا اَقُوْلُ لَكَ (سن جو میں تجھ سے کہتا ہوں) اور لَمْ تَسْمَعْ مَا قُلْتُ (تو نے نہیں سنا جو میں نے کہا) تمہارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تو سمجھا نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا (اور جو کوئی پڑھے ان پر ہماری آیتیں تو کہیں ہم سن چکے اگر ہم چاہیں تو ہم بھی کہہ لیں) اور فرمایا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (سنا ہم نے اور نہ مانا) یعنی ہم نے تیری بات کو سمجھا اور تیرے حکم کو نہ مانا اور اسی طرح ارشاد سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (ہم نے سنا اور قبول کیا) ہے، یعنی ہم نے سمجھا اور حکم مانا اور آیت شریفہ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (اور ان جیسے مت ہو جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا اور وہ سنتے نہیں) میں یہ بھی معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ "ہم نے سمجھا حالانکہ وہ سمجھتے نہیں"، اور یہ بھی کہ "ہم نے سمجھا حالانکہ وہ اس کے مطابق عمل نہیں کرتے" اور جب کسی نے اس کے مطابق عمل نہ کیا تو وہ گویا اس شخص کے حکم میں ہوا کہ جس نے سنا ہی نہیں اور اس کے بعد ارشاد فرمایا وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا (اور اگر اللہ جانتا ان میں کچھ بھلائی تو ان کو سنا دیتا اور اگر ان کو اب سنا دے تو ضرور بھاگیں) یعنی ان کو سمجھا نا بایں طور کہ ان میں وہ قوت کہ جس سے وہ سمجھ لیتے، عطا فرما دیتا۔

اور ارشاد وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ (کہتے ہیں سن نہ سنایا جائیو) یہ دو طرح پر بولا جاتا ہے ایک انسان پر بہرا ہونے کی بد دعا کے لئے، دوسرے اس کے لئے دعا کے واسطے[ع] بس اول کی مثال تو جیسے اَسْمَعَكَ اللّٰهُ ہے یعنی اللہ تجھے بہرا کر دے اور دوسرے کی یہ کہ کہا جاتا ہے

ع پہلی صورت میں غَيْرَ مُسْمَعٍ کے معنی ہوں گے "کچھ سنائی نہ دے" اور دوسری صورت میں "گالی نہ سنائی جائے"

اَسْمَعْتُ فُلَانًا (میں نے فلانے کو سنائی) جب کہ تم نے اس کو گالیاں دی ہوں، اور اس کا استعمال گالی دینے کے بارے میں متعارف ہے در حقیقت یہ ہے کہ اہلِ کتاب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہی کہا کرتے تھے اس گمان میں ڈالنے کے لئے کہ وہ آپ کی تعظیم کرتے اور آپ کے حق میں دعا کرتے تھے۔

اور ہر وہ مقام کہ جہاں اللہ نے اہلِ ایمان کے لئے سمع کا اثبات فرمایا ہے یا کافروں سے اس کی نفی کی ہے یا سننے پر رغبت دلائی ہے، وہاں مقصود معنی پر دھیان کرنا اور اس میں غور و فکر کرنا ہے جیسے اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا (یا ان کے کان ہیں جن سے سنتے ہیں) اور صُمٌّ بُكْمٌ (بہرے ہیں گونگے) اور فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ (ان کے کانوں میں ہے بوجھ)

اور جب اللہ تعالیٰ کو آپ سمع سے موصوف کیجیے گا تو اس سے مراد اللہ کا مسموعات کا علم اور ان کو جزا دینے کا ارادہ فرمایا ہے جیسے قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا (سن لی اللہ نے بات اس عورت کی جو جھگڑتی تھی تجھ سے اپنے خاوند کے حق میں) اور لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا (بے شک اللہ نے سنی ان کی بات جنہوں نے کہا)

اور آیہ شریفہ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ (البتہ تو نہیں سنا سکتا مردوں کو اور نہیں سنا سکتا بہروں کو اپنی پکار) یعنی تم انہیں سمجھا نہیں سکتے کیونکہ وہ اپنی بدعملی کی بنا پر قوتِ عاقلہ کو جو کہ انسانیت کی مخصوص حیات ہے گم کر دینے میں مردوں کی طرح سے ہیں۔

اور ارشاد ہے اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ (کیا عجیب دیکھتا اور سنتا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ اس شخص کی زبان سے نکلے گا جو اس کی عجائبِ حکمت پر مطلع ہوگا اور اس کے بارے میں مَآ اَبْصَرَهٗ وَمَآ اَسْمَعَهٗ نہیں کہا جائیگا کیونکہ سابق میں یہ مذکور ہو چکا کہ حق تعالیٰ شانہٗ کو صرف اسی صفت سے موصوف کیا جا سکتا ہے جو ذکرِ مسموع میں وارد ہوا ہو۔

اور کفار کے بارے میں جو ارشاد ہے اَسْمِعْ بِهِمْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا (کیا خوب سنتے اور دیکھتے ہوں گے جس دن آئیں گے ہمارے پاس) اس کے معنی یہ ہیں کہ جو چیزیں اپنی جانوں پر ظلم کرنے

اور غور و فکر کے ترک کر دینے کی بنا پر آج ان سے
عمی اور گم ہیں اس دن ان کو سن رہے ہوں گے
اور دیکھ رہے ہوں گے۔"

سَمْعٌ (بمعنی کان) کا استعمال واحد اور جمع دونوں کے
لئے ہوتا ہے ارشاد ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ
وَعَلٰى سَمْعِهِمْ (اللہ نے مہر کر دی ان کے دلوں پر
اور ان کے کانوں پر) کیونکہ حسب تصریح صحاح یہ اصل
میں مصدر ہے، جمع اَسْمَاعٌ اور جمع قلت اَسْمُعٌ اور
جمع الجمع اَسَامِعُ ہے ۱۱/۹ ۱۲/۲ ۱۴/۲،۱۷ ۱۵/۴ ۱۸/۵ ۱۹/۱۵
۲۶/۱۷ ۲۹/۲،۱۱

سَمْعًا ۱۶/۲ ۲۶/۳

سَمِعَ: اس نے سنا، سَمْعٌ اور سَمَاعَةٌ سے ماضی
کا صیغہ واحد مذکر غائب، ۳/۱۰ ۲۸/۱

سَمِعَتْ: اس (عورت) نے سنا، سَمْعٌ سے ماضی
کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۱۲/۱۴

سَمِعْتُمْ: تم نے سنا، سَمْعٌ سے ماضی کا صیغہ جمع
مذکر حاضر، ۵/۱۷

سَمِعْتُمُوْهُ: تم نے اس کو سنا، اس میں واو اشباع
کا ہے اور ہُ ضمیر واحد مذکر غائب، ۱۸/۸

سَمْعُكُمْ: تمہارے کان، تمہاری قوت سماعت،
سَمْعَ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ،

۷/۱۱ ۲۴/۱۷

سَمِعْنَا: ہم نے سنا، ہم نے سمجھا، سَمْعٌ سے ماضی
کا صیغہ جمع متکلم، ۱/۱۱ ۳/۸ ۴/۱۱ ۵/۴ ۷/۶ ۹/۱۷،۱۸ ۱۲/۵
۱۵/۲،۱۳ ۲۰/۷ ۲۱/۱۵ ۲۳/۱۰ ۲۶/۴ ۲۹/۱۱

سَمِعُوْا: انہوں نے سنا، سَمْعٌ سے ماضی کا صیغہ
جمع مذکر غائب، ۷/۱ ۱۸/۱۷ ۲۰/۹ ۲۳/۱۴ ۲۹/۱،۴

سَمْعِهٖ: اس کا کان، اس کی قوت سماعت
سَمْعِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف
الیہ، ۲۵/۱۹

سَمِعَهٗ: اس نے اسے سنا، سَمِعَ صیغہ ماضی
ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، ۲/۶

سَمْعُهُمْ: ان کے کان، سَمْعُ مضاف هُمْ ضمیر جمع
مذکر غائب مضاف الیہ، ۱/۱،۲ ۱۴/۲۰ ۲۴/۱۷
۲۶/۳

سَمْكَهَا: اس کا ابھار، اس کی چھت، اس
کی بلندی، سَمْكَ مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب
مضاف الیہ، سَمْكٌ اصل میں سَمَكَ يَسْمُكُ
کا مصدر ہے اس کے معنی بلند کرنے کے ہیں چھت
بھی چونکہ بلند ہوتی ہے اس لئے اس کو بھی سَمْكٌ
کہتے ہیں، ۳۰/۴

سَمٰوٰتٍ: آسمان، سَمَاءٌ کی جمع (ملاحظہ ہو

سَمّٰهُم) ۱/۳،۴،۱۳،۱۴ ۲/۴ ۳/۲،۸،۱۱،۱۷ ۴/۲،۴،۵
و، ۱۰، ۱۱ ۵/۱۵،۱۶ ۶/۳،۷،۱۰ ۷/۳،۶،۷،۸،۱۵،۱۹
۸/۱۴ ۹/۱۰،۱۳ ۱۰/۱۱ ۱۱/۳،۶،۱۰،۱۱،۱۲،۱۵ ۱۲/۱،۹،۱۰
۱۳/۵،۶،۷،۸،۱۳،۱۴،۱۵،۱۷،۱۹ ۱۴/۶،۷،۱۲،۱۳،۱۶،۱
۱۴/۱۷ ۱۵/۵،۶،۱۱،۱۲،۱۴،۱۶،۱۹ ۱۶/۷،۹،۱۰ ۱۷/۲،۳،۵،
و، ۱۷/۹،۱۵ ۱۸/۴،۵،۱۱،۱۲،۱۵،۱۶ ۱۹/۳،۶،۱۷ ۲۰/۱،۳،۱۷
۲۱/۲،۴،۵،۶،۱۰،۱۱،۱۲،۱۴ ۲۲/۲،۷،۹،۱۳،۱۷
۲۳/۴،۵،۱۰،۱۴،۱۵ ۲۴/۱،۲،۳،۶،۹،۱۱،۱۶
۲۵/۲،۳،۴،۶،۷،۱۳،۱۴،۱۵،۱۷،۱۸،۱۹،۲۰
۲۶/۱،۴،۹،۱۰،۱۴،۱۷ ۲۷/۴،۶،۱۲،۱۷ ۲۸/۲،۴،۶،
۲۸/۹،۱۱،۱۳،۱۵،۱۸ ۲۹/۱،۹ ۳۰/۲،۱۰

سَمُوْم: لُو، تیز بھاپ، وہ گرم ہوا جو زہر کا سا اثر کرے سموم کہلاتی ہے، مؤنث ہے، سَمَائِم جمع، ۱۴/۳ ۲۷/۳،۱۵

سَمُّوْهُمْ: تم ان کا نام لو، سَمُّوا تَسْمِيَةٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب،
راغب اصفہانی مفردات میں لکھتے ہیں:-
"آیتِ شریفہ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ قُلْ سَمُّوْهُمْ (اور مقرر کرتے ہیں اللہ کے لئے شریک کہہ ان کا نام لو) سے یہ مراد نہیں ہے کہ لات عزّیٰ وغیرہ ان کے ناموں کا ذکر کردیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ جن کو تم معبود کہتے ہو ان کے متعلق تحقیق ہو اور نیز یہ کہ ان اسماء کے معانی آیا ان میں موجود بھی ہیں، اسی لئے بعد میں ارشاد ہے اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ (یا اللہ کو بتلاتے ہو جو وہ نہیں جانتا زمین میں یا کرتے ہو اوپری اوپر باتیں)"
(ملاحظہ ہو تَسْمِيَةٌ) ۱۳/۱۱

سَمِيًّا: ہمنام، نظیر، امام راغب لکھتے ہیں:-
"آیتِ کریمہ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا (کسی کو پہچانتا ہے تو اس کے نام کا) یعنی اس کی کوئی نظیر جانتے ہو جو اس کے نام کا مستحق ہو یا اس کی صفت سے متصف کہ حقیقۃً اس کا استحقاق رکھتا ہو اور یہ معنی نہیں کہ "آیا کسی کو پاتے ہو جو اس کے نام سے موسوم ہو" کیونکہ اللہ کے بہت سے اسماء ہیں جن کا غیر پر بھی اطلاق ہوتا ہے لیکن اللہ کے لئے جب ان کا استعمال ہو تو وہ معنی نہیں ہوتے جو غیر کے لئے استعمال کرتے وقت ہوتے ہیں" ۱۶/۴،۷

سَمَّيْتُمُوْهَا: تم نے ان کا نام رکھ لیا ہے، سَمَّيْتُمْ تَسْمِيَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، واو اشباع کا اور ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے،

جو جمع کے لئے استعمال کی گئی ہے، راغب لکھتے ہیں :۔
"آیت کریمہ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَا (کچھ نہیں پوجتے ہو سوائے اس کے مگر نام ہیں جو رکھ لئے ہیں تم نے) کے معنی یہ ہیں کہ جن ناموں کا تم ذکر کرتے ہو ان کے مسمیات نہیں ہیں بلکہ یہ اسماء ایسے ہیں جو بغیر مسمّٰی کے ہیں کیونکہ ان ناموں کے اعتبار سے بتوں کے بارے میں جو وہ اعتقاد رکھتے ہیں اس کی حقیقت ان میں پائی نہیں جاتی "

پ۶ ۱۲ / ۱۵ ۲۷ / ۵

سَمَّيْتُهَا : میں نے اس کا نام رکھا، سَمَّيْتُ تَسْمِيَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب، (ملاحظہ ہو تَسْمِيَةٌ) ۳ / ۱۲

سَمِيْعٌ : سننے والا، سَمْعٌ سے بروزن فَعِيْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ، اسمائے حسنیٰ میں سے ہے، جب یہ حق تعالیٰ شانہٗ کی صفت واقع ہو تو اس کے معنی ہیں "ایسی ذات جس کی سماعت ہر شے پر حاوی ہے"

۱ / ۱۵، ۱۶ ۲ / ۶، ۱۲، ۱۶ ۳ / ۲، ۱۲ ۴ / ۳ ۵ / ۱۴ ۶ / ۸ ۷ / ۱ ۸ ۹ / ۱۴، ۱۶ ۱۰ / ۴، ۱۳، ۱ ۱۱ / ۱، ۲، ۱۳ ۱۲ / ۲، ۱۴ ۱۳ / ۱۸ ۱۴ ۱۵ / ۱ ۱۶ ۱۷ / ۵، ۱۷، ۱ ۱۸ / ۱۹، ۱۴ ۱۹ / ۱۵ ۲۰ / ۱۳ ۲۱ / ۲، ۱۲ ۲۲ / ۱۲ ۲۳ ۲۴ / ۱۷، ۱۱، ۱۹

۲۵ / ۲، ۱۴ ۲۶ / ۱۳ ۲۸ / ۱

سَمِيْعًا پ۵ / ۱۶، ۵ ۶ / ۱ ۲۹ / ۱۹

سَمَّيْتُمُوْ : اس نے تمہارا نام رکھا، سَمّٰی تَسْمِيَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، (ملاحظہ ہو تسمیۃ) ۱۷ / ۱۷

سَمِيْنٍ : فربہ، موٹا تازہ، سِمَنٌ سے جس کے معنی فربہ ہونے کے ہیں، بروزن فَعِيْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ، سِمَانٌ جمع ۲۶ / ۱۹

فصل النون

سِنٌّ : دانت، اَسْنَانٌ جمع، پ۶ / ۱۱

سَنَا : چمکدار روشنی، بعض اہلِ لغت نے اس کو "بجلی کی چمک" کے ساتھ مخصوص کیا ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ لفظ عام ہے، بجلی کی کوند ہو یا آگ کی چمک، ہر تیز روشنی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے[1] حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے ایک نظم کہی ہے جس میں ان الفاظ کو شمار کرایا ہے جن کو معرب بتایا گیا ہے اس میں سنا بھی مذکور ہے[2] لیکن امام سیوطی نے لکھا ہے کہ مجھے یہ پتہ نہیں چلا کہ کسی اور نے بھی ایسا کہا ہو[3] ۱۸ / ۱۲

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاج العروس [2] یہ نظم فتح الباری، ج۱۰، ص ۲۰۳، ۲۰۴، طبع مصر میں مذکور ہے [3] الاتقان، ج۱، ص ۱۳۸

سَنَابِلَ: بالیں، خوشے، سُنْبُلٌ کی جمع ۳ ۳ پ

سُنْبُلٰتٍ: بالیں، خوشے۔ سُنْبُلَةٌ کی جمع، پ ۱۲ ۱۶

سُنْبُلَةٍ: بال، خوشہ، پ ۳ ۴

سُنْبُلَةٍ: اس کی بال، اس کا خوشہ، سُنْبُلِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، پ ۱۲ ۱۶

سُنَّتَنَا: ہمارا دستور، سُنَّةَ مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ (ملاحظہ ہو سُنَّةَ) پ ۱۵ ۸

سُنْدُسٍ: باریک ریشم، لاہی، باریک دیبا، علامہ سیوطی الاتقان میں لکھتے ہیں:-

"جوالیقی نے کہا ہے کہ فارسی میں اس کے معنی باریک دیبا کے ہیں اور لیث کہتے ہیں کہ ارباب لغت اور مفسرین میں کسی کا اس میں اختلاف نہیں کہ یہ معرب ہے، شیدلہ نے اس کو ہندی بتایا ہے"[1] پ ۱۵ ۱۶ پ ۲۵ ۱۶ پ ۲۹ ۱۹

سُنَنٌ: راہیں، طریقے، سُنَّةٌ کی جمع پ ۴ ۵

سَنَةٌ: سال، برس، سِنُوْنَ، سَنَهَاتٌ، سَنَوَاتٌ جمع سَنَةٌ کی اصل سَنْهَةٌ تھی جَبْهَةٌ کی طرح پھر اس کا لام کلمہ حذف کر کے اس کی حرکت نون کی طرف نقل کر دی گئی تو سَنَةٌ باقی رہ گیا اور بعض کا قول ہے کہ اس کی اصل سَنْوَةٌ تھی، واؤ کے ساتھ (اور جس طرح کہ ہا کو حذف کیا گیا) واو کو حذف کر دیا گیا ہے، علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے قاموس میں اس کو باب ہا میں تو اس بنا پر ذکر کیا کہ اس کا لام کلمہ ہا ہے اور معتل میں دوبارہ اس لیے بیان کیا کہ اس کا لام کلمہ واؤ ہے اور دونوں وجہیں صحیح ہیں گو بعض نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے، کیونکہ تصریف لفظی دونوں کی شاہد ہے[2] امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں:-

"السنة، اس کی اصل کے بارے میں دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ اس کی اصل سَنْهَةٌ ہے کیونکہ وہ بولتے ہیں سانہت فلانا یعنی میں نے فلاں سے سال کے سال معاملہ کیا، نیز (تصغیر میں) سُنَيْهَةٌ کہتے ہیں، بعض نے کہا ہے کہ اسی سے لَمْ يَتَسَنَّهْ ہے یعنی سالوں کے اس پر گزر جانے سے نہیں بدلا اور اس کی طراوت نہیں گئی، اور کہا گیا ہے کہ اس کی اصل واؤ

[1] الاتقان، ج ۱، ص ۱۳۸ (طبع مصر)

[2] تاج العروس، باب الہاء، فصل السین

سے ہے کیونکہ سَنَوَاتٌ بولتے ہیں اور اسی سے سَانَہْتُ ہے اور ہا وقف کے لئے ہے جیسے کہ کِتَابِیَہْ اور حِسَابِیَہْ میں ہے۔"

ابن السکیت جو لغت کے امام ہیں، فرماتے ہیں:۔

"اہل عرب کے یہاں سَنَة بارہ مہینوں کا نام ہے انہوں نے سَنَة کو دو حصوں (شتاء اور صیف) میں تقسیم کر دیا ہے اور سنہ کی ابتداء اول شتاء (ابتداء سرما) سے شروع کی کیونکہ وہ مذکر ہے اور صیف (گرما) مؤنث ہے، پھر شتاء کے بھی دو حصے کئے، نصفِ اول کا نام شتوی ہے اور نصفِ آخر کا ربیع، پس شتوی بھی تین مہینے کا ہوا اور ربیع بھی تین مہینے کا، اور تین مہینے صیف کے رکھے اور تین قیظ کے۔" [1]

سنہ کی دو قسمیں ہیں، ایک قمری یا ہلالی، دوسرے شمسی، قمری سال کا شمار رویتِ ہلال سے ہے سال میں بارہ مرتبہ چاند ہلال بن کر افقِ آسمان پر نمودار ہوتا ہے جس سے سنہ قمری کے بارہ مہینے شمار ہوتے ہیں اور شمسی سنہ آفتاب کے بارہ برجوں کو قطع کرنے کی مدت کا نام ہے [2]، احکامِ شرعیہ میں سنہ قمری معتبر ہے۔

عَامٌ اور سَنَةٌ میں آیا کوئی فرق ہے یا نہیں تو واضح رہے کہ قاموس میں عَامٌ کی تشریح میں لفظِ سَنَةٌ اور سَنَةٌ کی تشریح میں لفظِ عَامٌ مذکور ہے۔

علامہ سید مرتضیٰ زبیدی لغوی اپنے شیخ (محمد بن الطیب فاسی لغوی شارحِ قاموس) سے ناقل ہیں کہ "ان دونوں کے اتحاد پر ہی مصنف (قاموس) گئے ہیں لہٰذا انہوں نے ان میں سے ہر ایک کی تفسیر دوسرے لفظ سے کی ہے" لیکن دیگر علماءِ عربیت نے ان دونوں کے باہم فرق بیان کیا ہے چنانچہ علامہ موہوب بن احمد جوالیقی فرماتے ہیں کہ:۔

"عوام الناس عَامٌ اور سَنَةٌ میں باہم فرق نہیں کرتے اور دونوں کے ایک ہی معنی قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے اور صحیح وہ ہے جس کے متعلق مجھے احمد بن یحییٰ سے اطلاع ملی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ سَنَةٌ جس دن

---

[1] تاج العروس فصل السین من باب الواو والیاء

[2] بطرس بستانی نے دائرۃ المعارف میں قاموس کے حوالہ سے سنہ شمسی کی مذکورہ بالا تحدید نقل کی ہے لیکن مجھے قاموس میں نہیں ملی (ملاحظہ ہو دائرۃ المعارف، لفظ سنۃ، ج ۱۰، ص ۱۴۳ (طبع الہلال، مصر ۱۸۹۸ء)

سے بھی تم شمار کرو (آئندہ سال کے) اسی دن تک ہے اور عام بغیر "شتاء" اور "صیف" کے نہیں ہوتا، سنۃ عام ایک شے سے متعلق نہیں ہیں لہٰذا جب تم آج سے لے کر آج ہی دن تک شمار کرو گے تو وہ سنۃ ہوگا، اس میں نصف شتا اور نصف صیف داخل ہو جائے گا اور عام جب تک کہ صیف اور شتاء (دونوں موسم کامل طور پر) نہ ہوں، نہیں ہوتا، چنانچہ اول میں تو چوتھائی (اس برس کا) اور چوتھائی (اگلے برس کا) اور نصف (اس سال کا) اور نصف (اس سال کا) آجائیگا، اور جب یہ قسم کھائے کہ لا یکلمہ عاماً (اس سے ایک عام کے لئے بات نہ کرے گا تو کچھ اس میں کا اور کچھ اس میں کا شامل نہیں ہوگا بلکہ شتاء اور صیف ہی مراد ہوں گے پس لفظِ عام، سنۃ سے اخص ہے اور اس بنا پر تم کہو گے کہ ہر عام، سنۃ ہے اور ہر سنہ عام نہیں ہے۔"

اور علامہ ازہری کہتے ہیں :-

"عام وہ سال ہے جو موسم سرما اور موسم گرما کے ساتھ آتا ہے اور اس بنا پر عام، سنۃ کی نسبت سے اخص مطلق ہے اور جب کسی دن سے لے کر اسی دن تک (سال کا) شمار کرو تو وہ سنۃ کہلائے گا اور اسی میں کبھی نصف گرما اور نصف سرما بھی ہوگا اور عام میں صیف و شتاء لگاتار ہوتے ہیں۔"

اور امام سہیلی الروض الانف میں ان کے باہمی فرق میں یہ رقمطراز ہیں :-

"سنہ، عام سے لمبا ہوتا ہے یہ آفتاب کے دوروں میں سے ایک دورہ ہے اور برخلاف سنۃ کے عام کا استعمال عربی مہینوں کے لئے ہوتا ہے۔" سلہ

اور امام راغب اصفہانی نے ایک اور فرق بیان کیا ہے :-

"عام، سنہ کی طرح ہی سے ہے لیکن بسا اوقات سنۃ کا استعمال اس سال کے لئے ہوتا ہے جس میں سختی یا قحط ہو اور اسی لئے قحط کی تعبیر لفظِ سنہ سے کی جاتی ہے اور عام کا استعمال اس برس کے لئے ہوتا ہے جس میں فراخی اور سرسبزی ہو ارشاد ہے فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَ

عہ اہل عرب نے سال کی جو دو حصوں میں تقسیم کی ہے اس کا بیان ہے شتاء سے (موسم سرما) نصفِ اول مراد ہے اور صیف (موسم گرما) سے نصفِ ثانی۔

عہ اس اصطلاح کے لئے ملاحظہ ہو بغلِ سے ہول - سلہ ان تینوں حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو تاج العروس، فصل العین من باب المیم۔

فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ (ایک برس اس میں مینہ برسے گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑیں گے"۔)

ا ۲ ب ۲ ت ۱۷ ث ۲۰ ج ۲۱ ح ۲۶ خ ۲۹

سِنَةٌ: اونگھ، غفلت، غنودگی، وَسِنَ يَوْسَنُ کا مصدر ہے، اس کے معنی غنودگی سے بیہوش ہونے کے آتے ہیں، سِنَة اصل میں وَسْنٌ تھا عِدَةٌ کی طرح سے، اس کی ہار واؤ محذوف کے بدلہ میں ہے، ۲ ب

سُنَّةٌ: راہ، رسم، دستور، طریقہ جاریہ، اسم ہے سُنَنٌ جمع، سَنَّ کا استعمال متعدد معانی میں ہوتا ہے، منجملہ ان کے دستور جاری کرنے کے معنی بھی ہیں چنانچہ تاج المصادر میں مرقوم ہے:-

"السن ونهادی نهادن ومنه الحدیث سَنَّ لَكُمْ مُعَاذٌ"۔

سنة اسی معنی کے اعتبار سے اس کا اسم ہے۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:-

"سنة النبی سے مراد وہ طریقہ ہے جس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انتخاب فرماتے تھے اور سنة اللہ کا استعمال حق تعالیٰ کے دستور حکمت اور طریقۂ طاعت کے لئے ہوتا ہے جیسے سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (رسم پڑی ہوئی اللہ کی جو چلی آتی ہے پہلے سے، اور تو ہرگز نہ دیکھے گا اللہ کی رسم کو بدلتے) اور وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (اور ہرگز نہ پائے گا اللہ کا دستور ٹلتا) یہ اس پر تنبیہ ہے کہ شریعتوں کے احکامِ فروعی گرچہ صورتیں مختلف ہیں لیکن جو غرض کہ ان سے مقصود ہے یعنی نفس کی پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ کے ثواب اور اس کے قرب تک رسائی کے لئے آراستگی، وہ مختلف و متغیر نہیں ہوتی"۔

ب ۹ ت ۱۴ ج ۱۵ ح ۲۳ خ ۲۴ د ۲۶

سِنِيْنَ: سال، برس، قحط، سَنَةٌ کی جمع، مصباح میں ہے کہ:-

"سَنَةٌ کی جمع، جمع مذکر سالم کی طرح آتی ہے چنانچہ سِنُوْنَ اور سِنِيْنَ بولا جاتا ہے اور اضافت کے لئے نون حذف ہو جاتا ہے، اور ایک لغت (بولی) میں تمام حالتوں میں یار برقرار رہتی ہے اور نون کو حرفِ اعراب قرار دیا جاتا ہے جس کو نکرہ ہونے کی حالت میں تنوین دی جاتی ہے اور اضافت میں حذف نہیں کیا جاتا گویا کہ وہ اصول کلمہ میں ہے اور اسی لغت پر یہ حدیث ہے، اللّٰھم اجعلھا سِنِيْنَ كَسِنِيْنَ يُوْسُفَ

سابق میں راغب کی تصریح گزر چکی ہے کہ سَنَۃٌ کا استعمال بسا اوقات سالِ قحط کے لئے ہوتا ہے وَلَقَدْ اَخَذْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ (اور ہم نے پکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں) میں سنین سے سالہائے قحط ہی مراد ہیں۔ تاج العروس میں تصریح ہے کہ یہ اس کے مجازی معنی ہیں، پ ۹/۶، پ ۱۱/۶، پ ۱۲/۱۶،۱۵، ۲، پ ۱۵/۱۳، ۱۶، پ ۱۶/۱۱، پ ۱۸/۶، پ ۱۹/۱۵،۱۶، پ ۲۱/۴

فصل الواو

سُوْءٌ: برائی، آفت، گناہ، برا کام، عیب، سَوْءٌ سے اسم ہے، علامہ سید مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے کہ یہ آفات و امراض کا ایک جامع نام ہے[1] امام راغب فرماتے ہیں:-

"سُوْءٌ ہر وہ چیز ہے جو انسان کو غم میں ڈال دے خواہ دنیوی امور میں سے ہو یا اخروی امور سے، احوالِ نفسیہ میں سے ہو یا احوال بدنیہ میں سے یا ان حالات میں سے ہو کہ جو جاہ مال کے چھوٹ جانے اور دوست کے بچھڑ جانے سے پیدا ہوتے ہیں"

قرآن مجید میں اس کا استعمال جن معانی میں ہوا ہے امام سیوطی نے ان کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے، فرماتے ہیں:-

"سُوْءٌ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے، شدت کے لئے یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (وہ کرتے تھے تم پر سخت عذاب) کونچیں کاٹنے کے لئے وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ (اور اس کو ہاتھ نہ لگاؤ بری طرح یعنی ناقہ کی کونچیں نہ کاٹ ڈالنا) زنا کے لئے مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءً (اور کچھ سزا نہیں ہے ایسے شخص کی جو چاہے تیرے گھر میں برائی یعنی زنا) برص کے لئے بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ (سفید بغیر عیب یعنی برص کے) عذاب کیلئے اِنَّ الْخِزْیَ الْیَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ (بیشک رسوائی آج کے دن اور برائی منکروں پر ہے) شرک کے لئے مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ (ہم تو کرتے نہ تھے کچھ برائی یعنی شرک) گالی گلوچ کے لئے لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ (اللہ پسند نہیں کرتا کسی بری بات کو یعنی کسی کی دشنام طرازی کو) وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ (اور کھولیں) اپنی زبانیں برائی کے ساتھ) گناہ کے لئے یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ (کرتے ہیں برا

[1] تاج العروس، فصل السین من باب الھمزۃ

کام جہالت سے) بِئْسَ (برا ہے) کے معنی میں: وَلَهُمْ سُوْءُ الدَّارِ (اور ان کے لئے ہے برا گھر) ضرر کے لئے وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ (اور دور کردیتا ہے سختی) وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ (اور مجھ کو برائی کبھی نہ پہنچتی) قتل و ہزیمت کے لئے لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ (نہ پہنچی ان کو کچھ آنچ) ؎۱

۱/۶ ۲/۵ ۳/۱۱ ۴/۹،۱۴ ۵/۱۳،۱۵ ۶/۱ ۷/۱۲ ۸/۷،۱۷ ۹/۶،۱۱،۱۳
۱۰/۱۱ ۱۲/۵،۶،۱۳،۱۷ ۱۳/۱،۸،۹،۱۲ ۱۴/۱۰،۱۳،۱۹،۲۱
۱۶/۱۰ ۱۹/۱۲،۱۹ ۲۰/۱،۷ ۲۱/۱۸ ۲۲/۱۴ ۲۳/۱۷ ۲۴/۲،۳،۵،۱۰،۱۱
۲۶/۶ ۲۸/۷

سَوْءٌ: برا ہونا، سَاءَ يَسُوْءُ کا مصدر ہے۔

۱۱/۱ ۱۶/۵ ۱۷/۵،۶ ۱۹/۲ ۲۶/۹،۱۰

سَوَآءٌ: برابر، اسم مصدر ہے بمعنی استوا یعنی دونوں طرف سے بالکل برابر ہونے کے، نہ اس کا تثنیہ بنایا جاتا ہے نہ جمع، ؎۲

امام سیوطیؒ اتقان میں لکھتے ہیں:-

"سواء بمعنی مستوی (برابر) ہونا ہے، کسرہ کے ساتھ اس میں قصر ہوگا جیسے مَكَانًا سُوًى (جگہ برابر یعنی صاف اور ہموار) اور فتحہ کے ساتھ مد ہوگا جیسے سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ (برابر ہے ان کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے) اور بمعنی وسط بھی آتا ہے، اس صورت میں بھی فتحہ کے ساتھ مد ہوگا جیسے فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ (بیچوں بیچ دوزخ کے) اور بمعنی تمام کے بھی، اس صورت میں بھی ایسا ہی ہوگا جیسے فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً (چار دن میں پورا ہوا) اور وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ (اور بتلادے ہم کو پوری راہ) بھی اس معنی میں ہوسکتا ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ بمعنی غیر (سوائے) کے نہیں آیا ہے اور کہا گیا ہے کہ آیا ہے چنانچہ البرہان میں ؎۳ آیت فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (وہ بہک گیا غیر راستہ کو) کو اسی سے قرار دیا ہے، حالانکہ یہ وہم ہے اور اس سے بہتر تو کلبی کا قول ہے جو ارشادِ الٰہی وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى (اور نہ تو سوائے اس جگہ کے) کے بارے میں ہے کہ سوی استثنائیہ ہے اور مستثنیٰ محذوف ہے ای مکانا سوی ھذا المکان، کرمانی نے اس کو اپنی کتاب عجائب میں بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں بُعد ہے

؎۱ الاتقان، ج۱، ص ۱۴۲ (طبع مصر ۱۳۴۳ھ) ؎۲ روح المعانی، ج۱۲، ص ۱۱۹ (طبع مصر)

؎۳ البرہان فی مشکلات القرآن، علامہ ابوالمعالی عزیزی بن عبدالمالک المعروف بہ شیدلہ کی منہ یہ تصنیف ہے۔

کیونکہ سوی استثنائیہ بغیر مضاف ہوئے استعمال ہی نہیں ہوتا"۔ [۱]

١/١٣،١ ۳/١٥ ۳/۳ ٥/٩ ٦/٧، ١٣، ١٤ ٩/١٤ ١٠/۳ ١٣/٨، ١٥
١٤/١٦ ١٧/٧، ١٠ ١٩/١١ ٢٠/٦ ٢١/٧ ٢٢/١٨ ٢٣/٦، ١١ ٢٤/١٦ ٢٥/١٦، ١٨
٢٧/۳ ٢٨/٧، ١٣

سَوْاٰتِكُمْ: تمہاری شرمگاہیں، سَوْاٰتِ، سَوْاَۃٌ کی جمع مضاف ہے، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، (ملاحظہ ہو سَوْاَۃٌ) پ

سَوْاٰتِهِمَا: ان دونوں کی شرمگاہیں، سَوْاٰتِ مضاف هُمَا ضمیر تثنیہ غائب، مضاف الیہ،

٩/٧، ١٠ ١٦/١٦

سُوَاعًا: ایک بت کا نام، مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:-

"اس لفظ کا مشتق منہ کلام عرب میں نہیں ملتا ممکن ہے کہ سوع سے مشتق ہو جس کے معنی زمانہ کے ہیں" [۲]

قرآن مجید میں سورۂ نوح کے اندر وَدّ، سُوَاع، یَغُوث، یَعُوق اور نَسر کے نام آئے ہیں، ابن جریر طبری اور ابن المنذر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہ وہ بت تھے جن کی حضرت نوح علیہ السلام کے عہد میں پرستش کی جاتی تھی، [۳] بعد میں زمانہ جاہلیت کے اندر عرب کے مختلف قبیلوں میں بھی ان کی پوجا کا سلسلہ جاری تھا، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ارض القرآن میں اصنام عرب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ایک غیر مرفوع روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بت گزشتہ بزرگوں کے مجسمے تھے جن کو اہلِ عرب نے بعد میں پوجنا شروع کر دیا تھا، ممکن ہے کہ ان میں بعض ایسے بھی ہوں لیکن زیادہ صحیح خیال یہ ہے کہ اصل میں یہ مختلف ستاروں کی خیالی صورتیں تھیں، نسر کے متعلق تو یہ تحقیق ثابت ہے کہ وہ ایک آسمانی شکل کا نام ہے، اسی پر دوسرے بتوں کو بھی قیاس کرنا چاہئے، بعد میں مرورِ زمانہ سے ان کی اصلیتیں ذہنوں سے اتر گئیں اور وہ صرف پتھر اور مٹی کا ڈھیر بن کر رہ گئے چنانچہ لات، عزیٰ اور منات کی یہی صورت تھی، لات گول سپید پتھر تھا اور اس پر ایک عمارت بنی تھی، عزیٰ ایک درخت تھا، اس کے نیچے ایک بت تھا، چاروں طرف چہار دیواری تھی، منات پتھر کی ایک چٹان تھی

[۱] الاتقان ج ۱ ص ۱۶۳ (طبع مصر) [۲] ارض القرآن ج ۲ ص ۲۳۶ (طبع معارف پریس) [۳] تفسیر امام ابن جریر طبری ج ۲۹ ص ۵۳ و درالدر المنثور امام سیوطی ج ۶ ص ۲۶۹ (طبع میمنیہ مصر)

دوسرے بتوں کی مختلف صورتیں تھیں۔
وَدّ دراز قد مرد کی صورت ایک تہبند کمر میں لپیٹے، ایک چادر اوڑھے، گلے میں تلوار حمائل، کمان لٹکی ہوئی، ایک طرف ترکش پڑا ہوا، سامنے نیزہ، اس میں جھنڈا بندھا ہوا، ستارہ جبار کی تقریباً یہی شکل ہے۔ سواع کی شکل عورت کی تھی، آسمان میں مرأۃ مسلسلہ، ذات الکرسی وغیرہ عورت کی شکلیں ہیں۔ یغوث (فریادرس) کی شکل شیر کی تھی، ستارہ اسد ہوگا، ایک فریادرس اور مددگار کی صورت شیر سے بہتر کیا خیال کی جاسکتی ہے؟ یعوق (مصیبتوں کو روکنے والا) کی صورت گھوڑے کی تھی، ستاروں کی ایک شکل فرس بھی ہے، عربوں کے نزدیک تو فرس حقیقتاً ان کے مصائب کا چارہ گر ہے، نسر ایک پرندوں کی شکل پر تھا، نسر طائر اور واقع ستاروں کی دو مشہور شکلیں ہیں، بابل میں نفرک کی جو سنگی صورت ملی ہے وہ بالکل گدھ کی شکل ہے"۔ [۱]

لیکن ہمارے نزدیک اس سارے بیان میں اتنی حقیقت تو بلاشبہ صحیح ہے کہ نسر طائر اور نسر واقع آسمان میں ستاروں کی دو مشہور شکلوں کے نام ہیں، باقی اس سے زیادہ جو کچھ ہے اس کے پیچھے جب تک تاریخی شواہد نہ ہوں قیاس آرائی سے زیادہ اس کی کیا وقعت ہے؟ چنانچہ سید صاحب نے بھی اس کو "زیادہ صحیح خیال" ہی فرمایا ہے، نیز اس کے قیاس ہونے کی بھی بایں الفاظ تصریح کردی ہے کہ:۔

"نسر کے متعلق تو بہ تحقیق ثابت ہے کہ وہ ایک آسمانی شکل کا نام ہے، اسی پر دوسرے بتوں کو بھی قیاس کرنا چاہئے۔"

گویا یہ قیاس بھی مطرد نہیں کہ بعض میں تو بہ تکلف چلتا ہے اور بعض میں سرے سے اس کی گنجائش ہی نہیں رہتی، ہوا یہ کہ اولاً نسر سے ذہن نسر واقع اور نسر طائر کی طرف منتقل ہوا، پھر وَدّ اور سواع کے بارے میں قیاس سے کام لیا تو تیر نشانہ پر بیٹھتا نظر آیا، چونکہ یہاں زمینی صورتوں اور آسمانی شکلوں میں مشابہت نظر آئی اس لئے ان دونوں کے بارے میں معنوی مناسبت کو نظر انداز کیا گیا، یغوث اور اسد، یعوق اور فرس میں بہ تکلف معنوی مناسبت پیدا کی گئی اور شیر کو جو حیوان مفترس اور حقیقت میں ایک خونخوار درندہ ہے، فریادرس بناکر ستارۂ اسد کی خیالی صورت کا بت قرار دیا گیا، لات، عزّیٰ اور منات میں

---

[۱] ارض القرآن، ج ۲، ص ۲۳۷، ۲۳۸

قیاس کیا کام دیتا اس لئے یہ کہہ دیا کہ "مرورِ زمانہ سے ان کی اصلیتیں ذہنوں سے اتر گئیں اور وہ صرف پتھر اور مٹی کا ڈھیر بن کر رہ گئے" ہم پوچھتے ہیں کہ اگر عرب کے بت اصل میں مختلف ستاروں کی خیالی صورتیں تھیں، تو بتایا جائے کہ لات، عزّیٰ اور منات کن ستاروں کی خیالی صورتیں ہیں؟ نیز ستارہ جبار کی خیالی صورت کی مورت کا نام وَدّ کس مناسبت سے پڑ گیا؟ تاریخی چیزوں میں محض قیاس کیسے کام چل سکتا ہے پھر یہ امر بجائے خود اپنی جگہ ثبوت طلب ہے کہ یغوث کی شکل شیر کی اور یعوق کی صورت گھوڑے کی اور نسر کی مورت پرندہ کی تھی، سید صاحب نے لکھا ہے کہ "بتوں کی یہ شکلیں فتح الباری تفسیر سورہ نوح میں مذکور ہیں[1]"، لیکن دشواری یہ ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی جو فتح الباری کے مصنف ہیں وہ خود اس بات پر اعتماد نہیں کرتے، چنانچہ حافظ صاحب نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے درج ذیل ہے فرماتے ہیں:-

وحکی الواقدی قال	اور واقدی نے بیان کیا ہے
کان ود علی صورۃ	کہ وَدّ مرد کی شکل پر تھا اور
رجل وسواع علیٰ	سواع عورت کی شکل پر
صورۃ امرأۃ و	اور یعوق گھوڑے کی شکل پر
یغوث علی صورۃ	اور نسر پرندہ کی شکل پر اور
فرس ونسر علی صورۃ	یہ بیان شاذ ہے اور مشہور
طائر وھذا شاذ	یوں ہے کہ یہ سب بت
والمشھور انھم کانوا	انسانی شکل کے تھے اور
علی صورۃ البشر وھو	یہی ان آثار کا مقتضی ہے
مقتضی ما تقدم من	جو ان کی پوجا کی وجہ
الآثار فی سبب	کے سلسلہ میں گزر چکے
عبادتھا[2]	ہیں۔

ایسی حالت میں واقدی کے بیان کی خصوصاً آثار کی سلف کی موجودگی میں جو وقعت ہو سکتی ہے، ظاہر ہے۔

اور بالفرض اگر واقدی کا بیان صحیح بھی تسلیم کیا جائے تب بھی اس کے معارض نہیں کہ یہ بت گزشتہ بزرگوں کے مجسمے تھے کیونکہ ممکن ہے کہ یہ معنوی طور پر ان کی صفات کے مجسمے ہوں، وَدّ مردانگی میں کامل شخص کا مجسمہ اور سواع عبادت میں کامل عورت کی مورت اور یغوث مرد شجاع کی صورت اور یعوق سبقت لے جانے والے اور توانا کی شکل اور نسر بڑی عمر والے بزرگ کی

[1] ملاحظہ ہو حاشیہ ارض القرآن، ج ۲، ص ۲۳۸

[2] فتح الباری شرح صحیح بخاری ج ۸، ص ۵۴۳ (طبع مصر ۱۳۲۶ھ)

تشبیہ، چنانچہ علامہ بقاعی کی یہی رائے ہے۔[1]

علاوہ ازیں یہ خیال زیادہ صحیح اس وقت قرار دیا جا سکتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ بت پرستی کے شروع ہونے سے پہلے ستاروں کی خیالی صورتیں متعین ہو چکی تھیں اور بحیثیت دیوتا کے ان کی پرستش کی جاتی تھی حالانکہ خود سید صاحب ابتدائِ بحث میں فرما چکے ہیں کہ :-

"مذہب کی ابتدائی تاریخ کا مظہر اعظم پرستی" عرب میں موجود تھی، صحیح بخاری میں عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ عرب کے مشہور بت لات، ود، یغوث وغیرہ پہلے زمانہ کے بزرگوں کے نام ہیں، بعد میں اہلِ عرب ان کی مورتیں بنا کر پوجنے لگے، قرآنِ مجید ذیل کی آیتِ پاک میں اسی مذہب کی تردید کرتا ہے :-

اَلَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ (اعراف) — خدا کے سوا اور جنکو پکارتے ہو تمہاری ہی طرح مخلوق ہیں۔

اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (مریم) — آسمان اور زمین میں جو چیز بھی ہے وہ خدا کے سامنے غلام بن کر آنے والی ہے۔[2]

صحیح بخاری کی جس روایت کا حوالہ سید صاحب نے دیا ہے وہ بروایتِ عطا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس طرح مروی ہے کہ وہ بت جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں تھے بعد میں عرب میں رائج ہو گئے چنانچہ وَدّ دومۃ الجندل میں کلب کا بت تھا ہذیل کا سواع تھا، یغوث پہلے مراد کا تھا، پھر سبا کے نزدیک جرف میں بنی غطیف کا ہوا، یعوق ہمدان کا تھا اور نسر حمیر میں سے آل ذی الکلاع کا، یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک مردوں کے نام تھے، جب وہ مر گئے تو شیطان نے ان کی قوم کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ جن مجالس میں یہ لوگ بیٹھے تھے وہاں ان کے مجسمے کھڑے کر کے ان مجسموں کو ان ہی کے نام پر موسوم کر دیا جائے چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا، اس وقت ان کی پرستش ہوئی نہیں تا آنکہ یہ لوگ مر کھپ گئے اور ان مجسموں کے متعلق خصوصی معلومات جاتی رہی تب ان کی پوجا ہونے لگی[3] گو حسبِ تصریحِ ائمہ، بخاری کی یہ روایت منقطع ہے[4]

---

[1] الفتوحات الالٰہیہ بتوضیح تفسیر الجلالین للدقائق الخفیہ معروف بہ حاشیہ جمل علی الجلالین، ج ۴، ص ۴۱۴ (طبع مصر ۱۳۵۷ھ)

[2] ارض القرآن، ج ۲، ص ۱۹۔

[3] صحیح بخاری کتاب التفسیر سورہ نوح، باب ودا ولا سواعا ولا یغوث ویعوق۔

[4] ملاحظہ ہو ارشاد الساری مقدمہ فتح الباری، ج ۲، ص ۴، ۱۰۵ (طبع منیریہ مصر ۱۳۴۸ھ) اور عمدۃ القاری، ج ۹، ص ۲۴۰ (طبع مصر)

لیکن مفسرین سلف میں سے عکرمہ، ضحاک، قتادہ اور ابن اسحٰق سے بھی اسی کے قریب قریب منقول ہے[1]

ابن ابی حاتم نے عروہ بن زبیر سے جو مشہور تابعی ہیں، روایت کیا ہے کہ یہ پانچوں حضرت آدم علیہ السلام کی صلبی اولاد میں سے تھے[2] ابو الشیخ نے کتاب العظمۃ[3] میں اور عمر بن شیبہ نے کتاب مکہ میں محمد بن کعب قرظی کا بھی یہی قول نقل کیا ہے[4]

ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ لوگوں کا خیال ہے یہ مجوسی تھے، ان کے مجسمے طوفان میں غرق ہو گئے تھے، جب پانی خشک ہوا تو ابلیس نے ان کو نکال کر زمین میں پھیلایا لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ان کو مجوس کہنا غلط ہے کیونکہ مجوسیت اس کے زمانۂ دراز کے بعد پیدا ہوئی ہے[5]

امام سہیلی التعریف والاعلام فیما ابہم فی القرآن من الاسماء والاعلام میں لکھتے ہیں کہ :-

"مجھے یہ پتہ نہیں کہ یہ نام عربوں تک کس طرح پہنچے، آیا ہندوستان کی طرف سے آئے کیونکہ یہ کہا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد بت پرستی کا مبدا یہی لوگ تھے یا شیطان نے عرب کو اس کا الہام کیا"

علامہ محمد بن علی معروف بابن عسکر نے اس کتاب پر ایک ذیل لکھا ہے جس کا نام ہے التکمیل والاکمال اس میں انہوں نے تصریح کی ہے کہ امام موصوف کا یہ بیان تفسیر شیخ الاسلام بقی بن مخلد سے ماخوذ ہے اس میں مذکور ہے کہ "یہ نام ہندوستان پہنچے تو اہل ہند نے اپنے بتوں کو ان اسماء سے موسوم کیا، پھر عرب کی سرزمین میں عمرو بن لحی نے ان ناموں کو داخل کیا ہے"[6]

ابو المنذر ہشام بن محمد بن السائب الکلبی المتوفی ۲۰۶ھ کی کتاب الاصنام، استاذ احمد زکی پاشا کی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ مصر میں شائع ہو چکی ہے جو عرب کی بت پرستی کی تاریخ پر دو راول کے مسلمان مؤرخین کی قدیم یادگار ہے، ہشام بن الکلبی اگرچہ حدیث میں معتبر نہیں لیکن تاریخ و نسب کا بڑا علامہ تھا، اس نے اپنے باپ محمد بن السائب الکلبی سے نقل کیا ہے کہ عمرو بن لحی کاہن تھا اسے جن نظر آتا تھا، جن نے اس سے کہا تھا کہ تہامہ سے جدہ کے ساحل پر جا، وہاں تجھے تیار شدہ بت ملیں گے، انہیں وہاں سے

---

[1] تفسیر حافظ ابن کثیر ج ۴ ص ۴۲۶ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ)
[2] الاتقان، از امام سیوطی، ج ۱، ص ۱۴۲ (طبع مصر)
[3] روح المعانی، ج ۲۹، ص ۷۷ (طبع مصر)
[4] فتح الباری ج ۸، ص ۵۴۲
[5] ایضاً
[6] ایضاً

لاکر عرب کو ان کی پرستش کی دعوت دے اہل عرب تیری دعوت کو مان لیں گے چنانچہ وہ جدہ پہنچا، بتوں کو کھود کر اپنے ساتھ لیا اور حج کے موقع پر سارے عرب کو ان کی پرستش کی طرف دعوت دی، عوف بن عذرہ نے جو بنی کلب میں سے تھا اس کی دعوت کو قبول کیا اور عمرو نے اسے وَدّ دے دیا، عوف اسے اپنے ساتھ لیکر دومۃ الجندل آیا، بنو مضر بن نزار نے بھی عمرو کی بات مانی تو اس نے ہذیل کے ایک شخص کو جسے حارث بن تمیم بن سعد بن ہذیل بن مدرکہ بن الیاس بن مضر کہا جاتا تھا، سواع کو سپرد کیا چنانچہ سواع بطن نخلہ میں اس مقام پر تھا جس کو رہاط کہا جاتا ہے، مضر کے آس پاس جو لوگ رہتے تھے اس کی عبادت کرتے تھے، چنانچہ عرب کے ایک شاعر نے کہا ہے ؎

تراھم حول قیلھم عکوفا
کما عکفت ھذیل علی سواع

(تو ان کو اپنے بادشاہ کے گرداگرد اس طرح جھکا ہوا دیکھے گا جس طرح کہ ہذیل سواع کے آگے جھکے ہوں[1]")

۲۹/۱۰

سُوَال: مانگنا، پوچھنا، سَأَلَ يَسْأَلُ کا مصدر ہے امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں :-

"سوال کے معنی ہیں معرفت کی استدعا یا اس چیز کی استدعا جو معرفت تک پہنچا دے، نیز مال کی استدعا یا اس چیز کی استدعا جو مال تک پہنچا دے، معرفت کی استدعا کا جواب زبان سے ہوتا ہے اور ہاتھ بذریعہ کتابت یا اشارت اس کا قائم مقام ہوتا ہے اور مال کی استدعا کا جواب ہاتھ سے ہوتا ہے اور زبان وعدہ کی صورت میں یا انکار کی شکل میں اس کی قائم مقام ہوتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ کہنا کس طرح صحیح ہے کہ سوال معرفت کے لئے ہوتا ہے حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے سوال کریگا جیسے وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ (اور جب کہیگا اللہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے) تو کہا جائیگا کہ یہ لوگوں کو بتلانے اور ان کو سرزنش دینے کے لئے ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں لانے کے لئے کیونکہ وہ تو علام الغیوب ہے لہٰذا یہ بھی معرفت کے سوال سے خارج نہیں رہتا۔

معرفت کے لئے سوال کبھی تو آگاہی حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے اور کبھی سرزنش کے لئے

[1] ملاحظہ ہو کتاب الاصنام، ص ۵۴ تا ۵۷ (طبع دار الکتب المصریہ ۱۳۴۳ھ)

جیسے ارشادِ الٰہی ہے وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ (اور جب زمین میں جیتی گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائیگا)، اور کبھی مسئول کو جتلانے اور تنبیہ کرنے کے لئے نہ کہ خود اپنی علم واطلاع کے لئے۔

سوال جب کہ معلوم کرنے کے لئے ہو تو مفعول ثانی کی طرف اس کا تعدیہ کبھی تو بنفسہٖ ہوگا اور کبھی بواسطہ حرف جر، چنانچہ کہو گے سالتہ کذا و سالتہ عن کذا و بکذا اور عن کے ذریعہ تعدیہ زیادہ ہے ارشاد ہے وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ (وہ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں) وَيَسْئَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ (اور تجھ سے پوچھتے ہیں ذوالقرنین کو) وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ (تجھ سے پوچھتے ہیں حکم غنیمت کا) وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي (اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو) اور فرمایا سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ (مانگا ایک مانگنے والے نے عذاب پڑنے والا)

اور جب سوال مال کی استدعا کا ہو تو تعدیہ بنفسہٖ بھی ہوتا ہے اور بذریعہ مِنْ بھی جیسے وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ (اور جب مانگنے لگو بیبیوں سے کچھ چیز کام کی تو مانگو پردہ کے باہر سے) اور وَاسْئَلُوا مَا أَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوا مَا أَنْفَقُوا (اور تم مانگ لو جو تم نے خرچ کیا اور وہ کافر مانگ لیں جو انھوں نے خرچ کیا) اور فرمایا وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (اور مانگو اللہ سے اس کا فضل)

فقیر کو بھی جب وہ کسی چیز کی استدعا کرے تو سائل کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (اور سائل کو مت جھڑک) اور لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ"

اور امام ابوجعفر بیہقی، تاج المصادر میں رقمطراز ہیں:۔

"سَأَلْتُ کے بارے میں دو لغتیں ہیں، ہمزہ کی تحقیق یعنی اس کو ثابت رکھنا اور یہی لغت شائع ہے اور اس سے اِسْأَلْ ہوگا اور اس کی تخفیف اور اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اس کو اس باب (یعنی فَتَحَ يَفْتَحُ ہی سے رہنے دیجئے) (دوسرے باب کی طرف نقل نہ کیجئے اور دوسری یہ کہ اسے باب فَعَلَ يَفْعَلُ سے قرار دیجئے اور خِفْتُ أَخَافُ کی طرح سِلْتُ أَسَالُ کہئے اس قول پر عین کلمہ واؤ ہوگا اور امر دونوں سے سَلْ آئے گا۔

سَئَلَ ایسا فعل ہے جس کا تعدیہ دو مفعولوں کی طرف ہوتا ہے اور مفعول ثانی تین طرح پر ہوتا ہے،

اول یہ کہ اس کی طرف تعدیہ بغیر کسی حرف ظاہر یا مضمر کے ہو جیسے کہ راجز (رجز خواں) کا قول ہے ع سَألت عمروا بعد بکر حقا، دوم یہ کہ فعل کا اس کی طرف تعدیہ کسی حرف کے اضمار کے ساتھ ہو جیسے حق تعالیٰ کا قول ہے وَلَا یَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا (اور نہ پوچھے گا دوست دوست کو) کہ معنی عن حمیم ہے (عن مضمر ہے) اور اظہار بھی جائز ہے جیسے وَاسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْیَةِ (اور پوچھ ان سے حال بستی کا) سوم یہ کہ مفعول ثانی کے موقع پر استفہام واقع ہو جیسے سَلْ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ (پوچھ بنی اسرائیل سے کس قدر عنایت کیں ہم نے ان کو) اور وَاسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَا اَجَعَلْنَا (اور پوچھ دیکھ جو رسول بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے کبھی ہم نے رکھے ہیں)

نیز اس میں ایک مفعول پر بھی اقتصار جائز ہے اور یہ دو طرح پر ہوتا ہے ایک یہ کہ متعدی بنفسہ ہو جیسے وَاسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ دوسرے یہ کہ (باء اور عن) دو حرف کے ذریعہ اس کا تعدیہ ہو باء کے ذریعہ جیسے سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ واقع اور عن کے ذریعہ جیسے سال عن زید۔

علامہ ابوالسعادات مبارک بن محمد معروف بابن الاثیر جزری ارقام فرماتے ہیں کہ:۔

"کتاب اللہ اور حدیث میں دو طرح کا سوال ہے ایک تو وہ جو ان چیزوں کی وضاحت کرنے اور سیکھنے کے لئے ہے کہ جن کی ضرورت پیش آتی ہے ایسا سوال مباح ہوگا یا مستحب یا مامور بہ اور دوسرا وہ کہ جو تکلف و تعنّت (غلطیاں ڈھونڈنا) کے طریق پر ہے، ایسا سوال مکروہ اور ممنوع ہے اور ہر وہ سوال جو اس قسم کا ہو اور اس کے جواب سے سکوت واقع ہو وہ سائل کے لئے سرزنش اور زجر ہے اور اگر اس کا جواب آیا تو عقوبت اور سخت گرفت ہے[1] ۲۳/۱۱

سُوْاٰی: بُرا فعل، بروزن فُعْلیٰ اَسْوَأ کی تانیث ہے جس طرح سے کہ اچھے عمل کا نام حُسْنیٰ ہے اسی طرح فعلِ بد کا نام سُوْاٰی ہے یہ بسبب صفت ہونے کے افعل التفضیل پر محمول ہے[2] اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مصدر ہو بروزن فُعْلیٰ جیسے کہ رُجْعیٰ ہے اس سے مراد جہنم ہے[3] ۲۱/۱۴

سَوْءَةٌ: لاش، عیب، فضیحت، علامہ زمخشری

---

[1] النہایہ فی غریب الحدیث والاثر فصل السین مع الہمزة [2] تاج العروس [3] ملاحظہ ہو البحر المحیط ج ۷، ص ۱۷۰ (طبع مصر)

فرماتے ہیں کہ سَوْاٰۃٌ کے معنی فضیحت کے ہیں کیونکہ اس میں برائی ہوتی ہے۔[1] امام راغب نے لکھا ہے فرج (شرمگاہ) کا سَوْاٰۃٌ سے کنایہ کیا گیا ہے اور علامہ ابن الاثیر کا بیان ہے کہ :-

"اصل میں سَوْءَۃٌ کے معنی فرج (شرمگاہ) کے ہیں، بعد میں اس کو ہر اس شے کے معنی میں نقل کر لیا گیا کہ جب وہ ظاہر ہو تو اس سے حیا آنے لگے خواہ قول ہو یا فعل۔" [2]

لیث کہتے ہیں کہ :-

"اس کا اطلاق مرد کی شرمگاہ پر بھی ہوتا ہے اور عورت کی شرمگاہ پر بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا (کھل گئیں ان پر شرمگاہیں ان کی) اور سوءۃ ہر وہ عمل یا امر ہے کہ عیب ناک ہو۔" [3]

یہاں سَوْءَۃٌ سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق علامہ ابوحیان لکھتے ہیں :-

"یہاں سوءۃ سے مراد بعض نے کہا ہے کہ عورت ہے اور اہتمام کے لئے خاص طور پر اسے ذکر کیا گیا۔ گو سارے جسم کا چھپانا مقصود ہے نیز اس کے ستر کی زیادہ تاکید ہے اور کہا گیا ہے کہ پوری لاش مراد ہے کیونکہ میت سب کی سب عورت ہے اور اسی بنا پر اسے کفن میں لپیٹا جاتا ہے، ابن عطیہ نے کہا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ سوءۃ سے یہی حالت مراد لی جائے جو کہ مجموعی طور پر دیکھنے والے کو بری لگتی ہے۔" [4]

س و د

سُوْدٌ : کالے، اَسْوَدُ کی جمع (ملاحظہ ہو اَسْوَدَ) ۲۲/۱۶

سُوَرٍ : سورتیں، سُوْرَۃٌ کی جمع، باجماع علماء معتبرین قرآن مجید کی کل سورتوں کی تعداد ایک سو چودہ ہے۔

واضح رہے کہ اول کی سات سورتیں بقرہ سے لیکر براءۃ تک سبع طوال کہلاتی ہیں کیونکہ یہ لمبی سورتیں ہیں، ان کے بعد کی سورتیں مئین سے موسوم ہیں کہ ان میں سے ہر سورت سو آیت سے زیادہ کی یا اس کے قریب قریب ہے، پھر جو سورتیں ہیں ان کو مثانی کہا جاتا ہے، یا تو اس لئے کہ یہ مئین کے بعد ہیں لہذا مئین اوائل (پہلی) ہوئیں اور یہ

---

[1] تفسیر کشاف، ج ۱، ص ۳۳۴ (طبع مصر ۱۳۵۴ھ)
[2] نہایہ، ج ۲، ص ۲۰۵ (طبع مصر) فصل السین مع الواو
[3] تاج العروس
[4] البحر المحیط، ج ۳، ص ۴۶۵-۴۶۶

ثوانی (دوسری) ہیں اور یا اس لئے کہ ان کے مضامین مکرر ہیں، یہ وہ سورتیں ہیں جن کی تعداد سو سے کم ہے، مثانی کے بعد جو چھوٹی سورتیں ہیں انہیں مفصل کہتے ہیں کیونکہ ان سورتوں میں بسم اللہ کے ذریعہ کثرت سے فصل واقع ہے نیز محکم بھی ہیں کہ ان کی تفصیل کر دی گئی ہے [1]

پھر مفصل بھی طِوال، اوساط اور قصار، تین ٹکڑوں میں منقسم ہیں اور ان کی تعیین میں علماء باہم مختلف ہیں، علامہ زین بن نجیم مصری بحر الرائق شرح کنز الدقائق میں لکھتے ہیں کہ :-

"ہمارے اصحاب (فقہاء حنفیہ) جس پر ہیں وہ یہ ہے کہ سورۃ الحجرات سے لیکر والسماء ذات البروج تک طوال ہیں اور وہاں سے لیکر لم یکن تک اوساط اور لم یکن سے آخر قرآن تک قصار ہیں، نقایہ میں اسی کی تصریح کی ہے [2]" ۱۴

سُوْرٌ : دیوار، فصیل، شہر پناہ، شہر کی چار دیواری کو سُوْر کہتے ہیں، اَسْوَار اور سِیْرَان جمع جیسے نُوْر کی جمع اَنْوَار اور کُوْز کی جمع کِیْزَان ہے، ۲۶ / ۱۸

سُوْرَةٌ : سورت۔ علامہ زمخشری کشاف میں رقمطراز ہیں :-

"سورۃ، قرآن کے متعینہ حصہ کا نام ہے، یہ کم سے کم تین آیت کا ہے، اور اس کا واؤ اگر اصلی ہے تو یا سورۃ المدینہ پر موسوم ہے جس کے معنی شہر کی چار دیواری کے ہیں کیونکہ یہ بھی قرآن کا ایک محدود ٹکڑا ہے جو مستقل طور پر احاطہ کئے ہوئے ہے جیسے وہ شہر کہ جس کے گرد فصیل کھنچی ہوتی ہے، اور یا اس لئے کہ فنونِ علمیہ اور انواع اقسام کے فوائد پر حاوی ہے جس طرح کہ شہر پناہ اپنے اندرون کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔

اور یا اس سورۃ سے موسوم ہے جس کے معنی رتبہ کے ہیں، یہ دو معنی کی بنا پر ہو سکتا ہے :

(۱) اس لئے کہ سورتیں بھی بمنزلہ درجوں اور مرتبوں کے ہیں کہ جن پر قاری ترقی کرتا جاتا ہے، نیز خود سورتیں طوال، اوساط اور قصار پر مرتب ہیں۔

(۲) اور یا اس لئے کہ دین میں ان کی رفعتِ شان اور جلالتِ مرتبت مسلم ہے۔

اور اگر اس کے واؤ کو ہمزہ سے بدلا ہوا قرار دیا جائے تو جس طرح کہ سُؤْرَۃ کے معنی کسی شے کے بقیہ اور بچے ہوئے حصہ کے ہیں، یہ بھی قرآن کا ایک ٹکڑا اور حصہ ہے [3]

---

[1] ملاحظہ ہو الاتقان ج ۱ ص ۶۳، ۶۴ (طبع مصر ۱۳۴۳ھ) [2] البحر الرائق ج ۱ ص ۳۶۰ (طبع مصر) [3] تفسیر کشاف ص ۴۷

پ۱/۳ پ۲/۱۴ پ۴/۱۲،۱۷ پ۹/۱۱،۵ پ۱۵/۴ پ۱۸/۵ پ۲۶/۷

سَوْط: چمڑے کا کوڑا، اَسْوَاطٌ اور سِیَاطٌ جمع

سَوْطٌ کے معنی اصل میں کسی شے کے باہم خلط ملط ہونے کے ہیں، کوڑے کو سوط اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے تسمے آپس میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں[۱]۔ ابن درید کا بیان ہے کہ جب کوڑے لگائے جاتے ہیں تو کوڑا چونکہ گوشت کو خون سے خلط ملط کر دیتا ہے اس لئے اس کا نام سوط ہوا[۲]۔ پ۳۰/۱۴

سَوْفَ: عنقریب، جلد، اب، آخر، امام راغب مفردات میں فرماتے ہیں:-

"سوف حرف ہے جو افعال مضارع کو استقبال کے ساتھ خاص کر کے حال سے علیحدہ کر دیتا ہے جیسے سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ (دم لو، بخشواؤں گا تم کو اپنے رب سے) اور ارشاد الٰہی فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (اب آگے جان لوگے) اس پر تنبیہ ہے کہ جو چیز وہ طلب کر رہے ہیں گو فی الوقت حاصل نہیں مگر بعد میں وہ لامحالہ ہو کر رہے گی اور یہ ڈھیل اور تاخیر کے معنی کا مقتضی ہے۔"

اور امام سیوطی لکھتے ہیں:-

"سوف، سین کی طرح ہے، بصریوں کے نزدیک زمانہ کے لحاظ سے سین سے زیادہ وسیع ہے کیونکہ حروف کی کثرت معنی کی کثرت پر دلالت کرتی ہے اور دیگر علماء کے نزدیک یہ سین کا مرادف (ہم معنی) ہے البتہ لام کے داخلہ کے سلسلہ میں سین اس سے علیحدہ ہے جیسے لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ (اور آگے دیگا تجھ کو) ابو حیان نے کہا ہے کہ حرکات کے پے در پے نامناسب ہونے کے باعث سین پر لام کا آنا ممتنع ہے جیسے کہ سیتدحرج ہے پھر باقی میں بھی یہی قاعدہ جاری ہو گیا، ابن بابشاہ کا بیان ہے کہ سوف کا غالب استعمال وعید اور تہدید میں ہے اور سین کا وعدہ میں، اور کبھی سوف وعدہ میں استعمال ہوتا ہے اور سین وعید میں۔" [۳]

پ۵/۲،۵،۷،۱۴،۱۸ پ۶/۱،۷،۱۲ پ۷/۷،۱۴ پ۸/۳ پ۹/۶،۷ پ۱۱/۱۰ پ۱۲/۸،۱۴ پ۱۳/۵ پ۱۴/۱،۶،۱۳ پ۱۶/۲،۷،۸ پ۱۹/۲،۴،۷ پ۲۱/۳،۷ پ۲۳/۹ پ۲۴/۱،۱۳ پ۲۵/۱۰،۱۳ پ۲۷/۷ پ۳۰/۹،۷،۱۱،۱۶،۲۱،۲۶

سُوْقِ: پنڈلیاں، سَاقٌ کی جمع۔ پ۲۳/۱۲

سُوْقِہٖ: کھیتی کی نالیں، اس کی جڑیں اس کے تنے، سُوْقِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ

[۱] تفسیر کشاف ج۱، ص ۴۸ وطبع مصر ۱۳۵۴ھ [۲] مفردات راغب [۳] تاج العروس [۴] الاتقان، ج۱، ص ۱۶۳ (طبع مصر)

۲۶/۱۲

سَوَّلَ: اس نے بات بنائی، اس نے اچھا کر کے دکھایا، تَسْوِیْلٌ سے جس کے معنی نفس کے اس چیز کو کہ جس پر وہ حریص ہے، مزین کرنے اور بری کو اچھی شکل میں پیش کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب

۲۶/۷

سَوَّلَتْ: اس نے بات بنائی، اس نے اچھا کر کے دکھایا، تَسْوِیْلٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۱۲/۱۲، ۱۳/۴، ۱۶/۱۴

سُؤْلَكَ: تیری تمنا، تیرا سوال، سُؤْلٌ اس حاجت کو کہتے ہیں جس کی طبیعت کو حرص ہو، سُؤْلٌ مضاف ک ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، امام راغب لکھتے ہیں:-

"سُؤْلٌ، اُمْنِیَّۃٌ کے قریب قریب ہے لیکن اُمْنِیَّۃٌ (تمنا) اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس کو انسان نے مقرر کیا ہو، اور سُؤْلٌ اس تمنا کو کہا جاتا ہے جو طلب بھی کی جا چکی ہو گویا سُؤْلٌ اُمْنِیَّۃٌ کے بعد ہوتا ہے۔"

علامہ جار اللہ زمخشری، رقمطراز ہیں:-

"سُؤْلٌ بروزن فُعْلٌ بمعنی مَفْعُوْلٌ ہے جیسے کہ خُبْزٌ بمعنی مَخْبُوْزٌ اور اُکُلٌ بمعنی مَاْکُوْلٌ ہے[1]۔ ۱۶/۱۱

سُوًی: صاف، درمیانی، راغب لکھتے ہیں:-

"جس کی دونوں طرفیں برابر ہوں، وہ سُوًی ہے یہ وصف ہو کر بھی مستعمل ہے اور ظرف ہو کر بھی، اور اصل میں یہ مصدر ہے۔" ۱۶/۱۲

سَوِیٌّ: سیدھا، درست، صحیح، بروزن فَعِیْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ ہے، امام راغب لکھتے ہیں:-

"سَوِیٌّ اس کو کہا جاتا ہے جو مقدار اور کیفیت دونوں حیثیت سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا (تین رات تک بھلا چنگا) اور فرمایا مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ (کون ہیں سیدھی راہ والے) اور رجل سوی وہ ہے جس کے اخلاق بھی اور خلقت بھی افراط و تفریط کے اعتبار سے معتدل ہوں۔"

ابوالہیثم کا بیان ہے کہ یہ بروزن فَعِیْلٌ بمعنی مُفْتَعِلٌ یعنی مُسْتَوِیْ ہے جو کہ خلق اور عقل میں انتہا کو پہنچا ہوا ہو[2]، اَسْوِیَاءُ جمع، ۱۶/۱۴

سَوِیًّا ۱۶/۴، ۵، ۶ ۲۹/۲

سَوّٰی: اس نے پورا پورا بنایا، اس نے برابر کیا،

---

[1] تفسیر کشاف، ج ۲، ص ۳۳۳ (ط مصر ۱۳۵۴ھ)
[2] تاج العروس

تَسْوِيَةٌ سے جس کے معنی کسی چیز کے بلندی یا پستی میں
برابر بنانے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب،
۲۹/۱۸ ۳۰/۱۲

سَوَّيْتُهُ: میں نے اس کو پورا پورا بنایا، میں نے
اس کو برابر کیا، سَوَّيْتُ تَسْوِيَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد
متکلم، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، ۱۴/۳ ۲۳/۱۴

سَوّٰكَ: اس نے تجھ کو پورا پورا بنایا، اس نے
تجھ کو برابر کیا، اس میں کَ ضمیر واحد مذکر حاضر ہے،
۱۵/۱۴ ۳۰/۷

سَوّٰهُ: اس کو برابر کیا، اس کو پورا پورا بنایا،
اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، ۲۱/۱۴

سَوّٰهَا: اس کو برابر کیا، اس کو پورا پورا بنایا اس
میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، امام راغب
لکھتے ہیں:-
"آیۂ شریفہ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (اور قسم ہے جی کی
اور جیسا کہ اس کو ٹھیک بنایا) میں ھا سے ان
قوتوں کی طرف اشارہ ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے
نفس کا قائم رکھنے والا بنایا، چنانچہ فعل کو ان
ہی کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ دوسرے
مقام پر مذکور ہے کہ فعل کی نسبت جس طرح فاعل
کی طرف درست ہے اسی طرح آلہ، نیز ان تمام
اشیاء کی طرف بھی کہ جن کی فعل کو احتیاج ہوتی ہے
منسوب کرنا صحیح ہے جیسے کہ سیف قاطع
(شمشیر برندہ) ہے اور یہ وجہ اس کے قول سے
بہتر ہے جس نے یہ کہا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ
مراد ہیں کیونکہ مَا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے تعبیر
نہیں کی جاتی کہ وہ جنس کے لئے وضع کیا گیا ہے
اور نہ صحیح روایت میں اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا
استعمال سننے میں آیا ہے" ۳۰/۱۶/۴

سَوّٰهُنَّ: اس نے ان کو ٹھیک کر دیا، اس نے ان کو
پورا پورا بنایا، اس میں هُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب ہے،
۱/۳

فصل الهاء

سُهُولِهَا: اس کے نرم مقامات، سُهُولٌ سَهْلٌ
کی جمع جس کے معنی نرم زمین کے ہیں، مضاف ہے،
ھا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، ۵/۱۲

فصل الياء المثناة

سِيْءَ: وہ غمگین ہوا، اسے برا معلوم ہوا، وہ ناخوش ہوا
سُوْءٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ
ہو سُوْءٌ) ۱۲/۷ ۳۰/۱۶

سَیِّئٌ: بد، برا، سُوْءٌ سے صفت مشبہ کا صیغہ، ۲۲/۷، سَیِّئًا ۱۱/۲

سَیِّاٰتِ: برے کام، گناہ، سَیِّئَۃٌ کی جمع (ملاحظہ ہو سَیِّئَۃٌ) ۴/۴، ۹/۱۱، ۱۱/۸، ۱۰/۷،۲، ۱۲/۱۰،۱، ۱۲/۱۳،۱۲، ۱۴/۱۳،۱۲، ۲۲/۱۴، ۲۴/۲،۴،۱۰، ۲۵/۲۰،۱۸،۴

سَیِّاٰتِکُمْ: تمہارے گناہ، تمہارے اعمالِ بد، سَیِّاٰتِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۵/۲، ۳/۵، ۹/۱۸، ۲۵/۲۰

سَیِّاٰتِنَا: ہماری برائیاں ہمارے گناہ، سَیِّاٰتِ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، ۴/۱۱

سَیِّاٰتِہٖ: اس کی برائیاں اس کے گناہ، سَیِّاٰتِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، ۲۸/۱۵،۱۷

سَیِّاٰتِھِمْ: ان کی برائیاں، ان کے گناہ، سَیِّاٰتِ مضاف، ھِمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۴/۱۱، ۶/۱۳، ۱۹/۴، ۲۰/۱۳، ۲۶/۲،۵،۹

سَیَّارَۃٌ: کارواں، قافلہ، چلنے والے مسافر، سَیَّارٌ کا مونث جو کہ سَیْرٌ سے صفت کا صیغہ ہے اس کی تانیث جمع کے معنی کے لحاظ سے ہے، ۱۲/۳، ۷/۱۲

سِیْٓئَتْ: وہ بری کر دی گئی، ان کو برا معلوم ہوا سُوْءٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مونث غائب (ملاحظہ ہو یُسِیْٓئَتْ) ۲۹/۲

سِیْحُوْا: تم پھر لو، تم سیاحت کرو، (ضَرَبَ) سَیْحٌ سے جس کے معنی زمین پر چلنے اور سفر کرنے کے ہیں، امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۱۰/۱

سَیِّدًا: سردار، سِیَادَۃٌ سے جس کے معنی سرداری کرنا اور سردار ہونے کے ہیں، صفتِ مشبہ کا صیغہ سَادَۃٌ جمع، راغب اصفہانی رقمطراز ہیں:۔

"سَیِّدٌ کے معنی "متولی سواد" یعنی جماعت کے متولی کے ہیں، اور اسی کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے چنانچہ سید القوم بولا جاتا ہے اور سید الثوب یا سید الفرس نہیں بولا جاتا، اور کہا جاتا ہے القوم یسودھم اور چونکہ تہذیب النفس ہونا متولی جماعت کی شرط ہے اس لئے ہر اس شخص کو کہ جو اپنی ذات کے اعتبار سے برگزیدہ ہو سید کہا جاتا ہے، اسی معنی میں ارشاد ہے وَسَیِّدًا وَّحَصُوْرًا (اور سردار ہوگا اور عورت کے پاس نہ جائے گا) اور فرمایا وَّاَلْفَیَا سَیِّدَھَا (اور دونوں نے پایا اس کے خاوند کو) یہاں شوہر کو اپنی بیوی کا نگراں ہونے کے باعث سید سے موسوم کیا گیا ہے۔"

۱۲/۳

سَيِّدَهَا: اس کا شوہر، اس کا خاوند، سَيِّدَ مضاف ھا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ۔

۱۲/۱۴

سَيْر: چلنا، سَیر کے معنی زمین پر چلنے کے ہیں یہ سَارَ یَسِیْرُ کا مصدر ہے جو ضَرَبَ یَضْرِبُ سے آتا ہے، ۲۲/۸ ۔ سَيْرًا ۲۷/۲

سُيِّرَتْ: وہ چلائی گئی، وہ چلائے گئے، تَسْيِيْرٌ سے جس کے معنی دلانے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، راغب لکھتے ہیں:۔

"تَسْيِيْرٌ کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو سائر یعنی جو چلنے والے کے امر و اختیار اور ارادہ سے ہو جیسے هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ (وہ تو ہے جو تم کو پھراتا ہے) اور دوسرے وہ جو بذریعہ قہر و تسخیر ہو جیسے کہ پہاڑوں کی تسخیر ہے وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (اور جب پہاڑ چلائے جائیں)"

(ملاحظہ ہو بُسَّتْ) ۱۱/۱ ۳/۱

سِيْرَتَهَا: اس کی چال، اس کی سیرت، اس کی حالت، جس حالت پر کہ انسان یا غیر انسان ہوتا ہے خواہ وہ اس کی طبعی ہو یا اکتسابی، اس کا نام سِيرة ہے سَيْرٌ سے اسم ہے، سَيْر مضاف ھا ضمیر واحد مؤنث غائب، مضاف الیہ، ۱۶/۱

سِيْرُوْا: تم پھرو، تم چلو، تم سیر کرو، سَيْرٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، راغب نے لکھا ہے کہ:۔

"ارشادِ الٰہی سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ (سیر کرو ملک کی) میں کہا گیا ہے کہ زمین پر سیاحت جسمی مراد ہے اور بعض نے فکر کو جولاں کرنے اور اس کے احوال کی نگرانی کرنا بیان کیا ہے جس طرح کہ خبر میں مروی ہے کہ اولیاء کے وصف میں کہا گیا ہے ابدانہم فی الارض سائرۃ وقلوبہم فی الملکوت جائلۃ (ان کے بدن تو زمین پر رواں ہیں اور ان کے دل ملکوت میں جولاں ہیں) اور بعض نے اس کو بہ قوتِ تمام اس طرح عبادت میں لگنے پر محمول کیا ہے کہ جو ثواب تک رسائی کر دے۔"

۵/۷ ۸/۷ ۱۱/۱۴ ۱۴/۲ ۲۰/۲ ۸/۱۲ ۸/۲۲

سِيْقَ: وہ ہانکا گیا (نَصَرَ) سَوْقٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو سَائِقٌ)

۵/۲۴

سَيْلُ: بہاؤ، سیلاب، یہ اصل میں سَالَ يَسِيْلُ کا مصدر ہے جس کے معنی بہنے کے ہیں، پھر مصدر بطورِ اسم سیلاب کے معنی میں استعمال ہونے لگا،

اس کی جمع سُئُوْلٌ آتی ہے قرآنِ مجید میں اس کا استعمال بطور اسم ہی ہوا ہے، ۱۳/۸ ، ۲۰/۲۰

سُئِلَ: (اس مرد سے) پوچھا گیا، سوال کیا گیا، سُؤَالٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب ۱/۱۴

سُئِلَتْ: (اس عورت سے) پوچھا گیا، سوال کیا گیا، سُؤَالٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب ۳۰/۹

سُئِلُوْا: ان سے سوال کیا گیا، سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۲۱/۱۸

سِيْمَاهُمْ: ان کا چہرہ، ان کی نشانی، سِیْما کے معنی نشانی اور علامت کے ہیں، یہ اصل میں وِسْمٰی تھا، واو کو فاءِ کلمہ کی بجائے عین کلمہ کی جگہ پر رکھا گیا جس طرح کہ ما اطیبہ اور ایطبہ بولتے ہیں تو سِوْمٰی ہوا پھر واو کے ساکن اور ماقبل کے مکسور ہونے کی وجہ سے واو کو یاء کر لیا گیا اور سِیْمٰی ہو گیا سِیْمٰی مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۳/۵ ، ۸/۱۲، ۱۳ ، ۲۶/۱۲، ۸ ، ۲۷/۱۲

سِيْنَاءَ: سیناء مشہور پہاڑ ہے، علامہ یاقوت حموی معجم البلدان میں لکھتے ہیں:۔

"سِیْنَا بکسر اول اور فتحہ بھی آتا ہے، شام میں ایک موضع کا نام ہے جس کی طرف طُور کی نسبت کی جاتی ہے اور طورِ سیناء کہا جاتا ہے یہ وہی پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا اور اسی مقام پر ان کو ندا کی گئی تھی، یہ گھنے درختوں کا ہے۔

ہمارے شیخ ابوالبقاء کا بیان ہے کہ یہ مشہور پہاڑ کا نام ہے جب سین کو فتحہ دیا جائیگا تو اس کی ہمزہ قطعی طور پر تانیث کے لئے ہو گی کیونکہ الحاق اور تکثیر کے لئے ہمزہ کا ہونا باطل ہے اس لئے فَعْلَالٌ غیر مضاعف میں نہیں آیا جیسے کہ زَلْزَالٌ اور قَلْقَالٌ ہے اور سین کا کسرہ بھی جائز ہے، اس صورت میں یاء اس میں زائد ہو گی اور فیعال کے وزن پر ہو گا جیسے کہ دِیْبَاج اور دِیْمَاس ہیں اور ممکن ہے کہ یاء اصلی ہی ہو علیاء کی طرح ہو اور اس صورت میں ہمزہ کے برائے الحاق ہونے کی بنا پر اسے علیاء کی طرح رکھا گیا ہے۔

اور اگر تم یہ دریافت کرو کہ پھر منصرف کیوں نہیں ہوا؟ تو ہم کہیں گے کہ یہ تعریف و تانیث کے اجتماع کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ ایک جگہ کا نام ہے اور یا اس امر میں کہ اس کی تانیث بغیر علامت

کے ہے شل دمشق کے ہے اور اس مقام کے نام کے لیے سِينِينَ بھی آیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ طُورِ سِينِينَ (اور قسم ہے طور سینین کی)۔

عربی زبان میں کوئی ایسا اسم کہ جو س، ی، ن سے مرکب ہو، بجز اس حرف کے کہ جس کا نام سین ہے نہیں ہے۔" [1]

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی تحریر کرتے ہیں:۔

"اکثر اس پر ہیں کہ سیناء عربی نہیں ہے بلکہ یا تو نبطی ہے یا حبشی اور اس کے اصلی معنی اچھے یا مبارک کے ہیں، بعض اس کا عربی ہونا بھی تجویز کرتے ہیں، یا تو سناء یا لمد سے کہ جس کے معنی رفعت کے ہیں یا سنا بالقصر سے کہ جس کے معنی نور کے ہیں، ابو حیان نے اس پر یہ بحث کیا ہے کہ دونوں مادے مختلف ہیں کیونکہ سناء ہو یا سنا (دونوں) کا عین کلمہ نون ہے اور سیناء کا عین کلمہ یاء ہے مگر یہ اس طرح رد کر دیا گیا ہے کہ جو اس کا قائل ہے وہ اس کا وزن فیعال بتاتا ہے اور عین کلمہ نون اور یاء کو زائد اور ہمزہ کو واو سے تبدیل شدہ قرار دیتا ہے۔" [2]

اور شیخ سلیمان جمل، علامہ سہیلی سے ناقل ہیں کہ:

"صحیح یہی ہے کہ سیناء عجمی نام ہے، عرب جب اس کو بولنے لگے تو ان کے تلفظ مختلف ہو گئے چنانچہ انہوں نے سَيْنَاء کو حمراء کی طرح سے اور سِينَاء علباء کی طرح سے اور سِينِينَ قِنْدِيل کی طرح سے کہا۔" [3]

واضح رہے کہ جس طرح اس کے تلفظ میں اختلاف ہے اسی طرح اس کے معنی میں بھی اختلاف ہے، بعض نے اس کے معنی مبارک کے، بعض نے حسن یعنی اچھے کے، بعض نے گھنے درختوں والے کے بیان کیے ہیں اور بعض نے اس کو مشہور پہاڑ کا نام بتایا ہے، امام ابن جریر طبری ان سب اقوال کو اپنی تفسیر میں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

"صحیح قول اس بارے میں یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ سیناء اسم ہے، طور کی طرف اس کی اضافت ہے جس کے ذریعہ وہ مشہور ہے جس طرح سے کہ جبل طی کہا گیا ہے کہ طی کی طرف ان کی اضافت ہے اور اگر اس بارے میں بات وہ ہوتی جو کہ ان لوگوں نے بیان کی

[1] معجم البلدان، ج ۵، ص ۲۰۱ (طبع مصر ۱۳۲۴ھ)

[2] روح المعانی، ج ۱۸، ص ۲۰ (طبع مصر)

[3] حاشیۃ الجمل علی الجلالین، ج ۳، ص ۱۸۷ (طبع مصر)

ہے جنہوں نے اس کے معنی جبل مبارک (کوہِ مبارک) کے بیان کئے ہیں یا جنہوں نے کہ اس کے معنی حسن (اچھا) کے بتائے ہیں تو طور پر تنوین ہونی چاہئے تھی اور سیناء اس کی صفت ہوتی، علاوہ ازیں سینا بمعنے مبارک یا حسن کلامِ عرب میں مشہور نہیں، کہ اس کو پہاڑ کی صفت قرار دیا جائے لیکن بات اس سلسلہ میں نشاء اللہ وہی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمائی ہے کہ سینا پہاڑ ہے جو اس نام سے مشہور ہے، حضرت موسٰی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی پر خطاب کیا گیا تھا اور یہاں یہ وہ پہاڑ مبارک بھی ہے نہ کہ سیناء کے معنی مبارک کے ہیں[۱]"۔ ۲۰ب

سِینِیْنَ: سینین، کوہِ سینا کو سینین بھی کہا جاتا ہے، ۹۵ب

سَیِّئَۃٌ: برائی، گناہ، فعل بد، حَسَنَۃٌ کی ضد ہے، سَیِّئَۃٌ اصل میں سَیْوِئَۃٌ تھا، واو کو یٰ سے بدل کر یاء کا یاء میں ادغام کر دیا گیا ہے، راغب لکھتے ہیں:-

"حَسَنَۃٌ اور سَیِّئَۃٌ دو قسم پر ہیں، ایک باعتبار عقل و شرع جیسے وہ کام کہ جن کا مذکور آیتِ شریفہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشْرُ اَمْثَالِھَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَلَا یُجْزٰٓی اِلَّا مِثْلَھَا (جو کوئی لاتا ہے ایک نیکی تو اس کے لئے اس کا دس گنا ہے اور جو کوئی لاتا ہے، ایک برائی سو سزا پائیگا اسی کے برابر) میں ہے، دوسرے حَسَنَہ اور سَیِّئَہ باعتبار طبع، کہ طبیعت پسند کرے یا گراں جانے، جیسے ارشاد ہے فَاِذَا جَآءَتْھُمُ الْحَسَنَۃُ قَالُوْا لَنَا ھٰذِہٖ وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَۃٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰی وَمَنْ مَّعَہٗ (پھر جب پہنچی ان کو بھلائی، کہنے لگے یہ ہے ہمارے لائق اور اگر پہنچی برائی تو نحوست بتلانے لگے موسٰی کی اور اس کے ساتھ والوں کی"۔

۸ب/۹، ۸ب/۳، ۸ب/۸، ۸ب/۷، ۹ب/۲،۹، ۱۱ب/۸، ۱۳ب/۹،۷، ۱۸ب/۲، ۱۹ب/۱۹، ۲۰ب/۳،۹،۱۲، ۲۱ب/۷، ۲۴ب/۱۰،۱۹، ۲۵ب/۵،۲-

سَیِّئُہٗ: اس کی بُری چیز، سَیِّئُ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ (ملاحظہ ہو سَیِّئٌ) ۱۵ب/۴

---

[۱] تفسیر امام ابن جریر، ص ۱۰، ص ۱۸ (طبع مصر)

باب الشین المعجمة

فصل الالف

شَآءَ: اس نے چاہا، اس نے ارادہ کیا (مَشِیۡئَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، شَآءَ اصل میں شَیِئَ تھا، یَ متحرک، ماقبل مفتوح، اس لئے یَ کو اَ سے بدل لیا گیا۔

امام راغب لکھتے ہیں :۔

"اکثر متکلمین کے نزدیک مَشِیۡئَۃٌ بالکل ارادہ کی طرح ہے، اور بعض کے نزدیک مشیئۃ تام ہے، اصل میں کسی شے کے ایجاد کرنے اور چاہنے کا گو عرف میں اس کا استعمال ارادہ ہی کی جگہ ہوتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مشیئۃ کے معنی ایجاد کرنے کے ہیں اور لوگوں کی طرف سے مشیت کے معنی چاہنے کے، ان کا بیان ہے کہ (کسی شے کے متعلق) اللہ تعالیٰ کی مشیت ہونا اس امر کا مقتضی ہے کہ (اس) شے کا وجود عمل میں آجائے اور اللہ کے ارادہ کا ہونا اس کا مقتضی نہیں کہ مراد لامحالہ وجود پذیر ہو کر ہی ہے دیکھئے نہیں ارشاد ہے یُرِیۡدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡيُسۡرَ وَلَا يُرِيۡدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ (اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری) اور وَمَا اللّٰهُ يُرِيۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعِبَادِ (اور اللہ بے انصافی نہیں چاہتا بندوں پر) حالانکہ یہ معلوم ہے کہ کبھی کبھی تنگی بھی ہوتی ہے اور لوگوں کے مابین ظلم بھی۔

یہ لوگ ان دونوں کے مابین یہ فرق بتاتے ہیں کہ انسانی ارادہ کبھی بغیر ارادہ الٰہی کے تقدم کے بھی حاصل ہو جاتا ہے چنانچہ انسان کا ارادہ ہوتا ہے کہ اسے موت نہ آئے اور اللہ تعالیٰ اس سے اِبا فرماتا ہے لیکن مشیتِ انسانی بغیر مشیتِ الٰہی کے وجود میں نہیں آتی کیونکہ ارشاد ہے وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّآ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ (اور تم نہیں چاہو گے مگر جو چاہے اللہ) مروی ہے کہ جب یہ آیت اتری لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّسۡتَقِيۡمَ (جو کوئی چاہے تم میں سے کہ سیدھا چلے) تو کافر کہنے لگے معاملہ تو ہمارے

اختیار میں ہے چاہیں سیدھے چلیں چاہیں نہ چلیں اس پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر امور تمام تر اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف نہ ہوتے اور ہمارے افعال کی اس پر تعلیق وانحصار نہ ہوتا تو لوگ اپنے تمام کاموں میں ان شاء اللہ کے ذریعہ استثناء کی تعلیق پر متفق نہیں ہو سکتے تھے جیسے سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ، سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا، يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ، اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ، قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ، وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا، وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔"

۱/۲،۹ ۲/۱۱ ۳/۱،۲ ۵/۹ ۶/۱۱ ۷/۱۰،۱۹ ۸/۱،۲،۳،۵ ۹/۸

۱۰/۱۰ ۱۱/۷،۱۰،۱۵ ۱۲/۳،۹،۱۰ ۱۳/۵ ۱۴/۷،۱۱،۱۹ ۱۵/۱۲،۱۷،۲۱ ۱۸/۲،۱۷

۱۹/۱۳ ۲۰/۳،۶ ۲۱/۱۹ ۲۳/۷ ۲۴/۶،۱۶ ۲۵/۲،۸ ۲۶/۱۲ ۲۹/۱۳،۱۶،۲۰

۳۰/۲،۵،۷،۱۲

شَاخِصَةٌ: کھلی کی کھلی رہ جانے والی۔ شُخُوْصٌ سے جس کے ٹھیٹ معنی آنکھوں کے کھلے کے کھلے رہ جانے کے ہیں، اسمِ فاعل کا صیغہ واحد مؤنث غائب، (ملاحظہ ہو تَشَخَّصُ) ۱۷/۷

شَارِبُوْنَ: پینے والے، شُرْبٌ سے اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مذکر، شَارِبٌ کی جمع بحالتِ رفع (ملاحظہ ہو اِشْرَبُوْا اور شُرْبٌ) ۱۷/۱۵

شَارِبِيْنَ: پینے والے، شُرْبٌ سے اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مذکر، شَارِبٌ کی جمع بحالتِ نصب و جر

۲۳/۶ ۲۶/۶

شَارِكْهُمْ: تو ساجھا کر ان سے تو ان کا شریک ہو جا، شَارِكْ مُشَارَكَةٌ سے جس کے معنی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہونے کے ہیں، امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، راغب لکھتے ہیں :-

"شِرْكَةٌ اور مُشَارَكَةٌ کے معنی دو ملکوں کے ملجانے کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ کسی ایسی شے کا پایا جانا جو دو یا دو سے زائد کے لئے ہو خواہ وہ شے ذات ہو یا وصف جیسے کہ حیوان ہونے میں انسان اور گھوڑے کا باہم شریک ہونا یا ایک گھوڑے کا دوسرے گھوڑے کے ساتھ کمیت یا مشکی ہونے میں شریک ہونا" ۱۵/۷

شَاطِئٌ: کنارہ، شَوَاطِئُ جمع، ۲۰/۳

شَاعِرٌ: شاعر، شعر کہنے والا، شَعَارَۃٌ سے جس کے معنی شاعر ہونے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، شُعَرَآءُ جمع، (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو شِعْرٌ) ۱۷/۱، ۲۳/۶، ۲۷/۴، ۲۹/۶

شَافِعِيْنَ: سفارش کرنے والے، شَفَاعَۃٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، شَافِعٌ کی جمع بحالتِ نصب جر، (ملاحظہ ہو شَفَاعَۃ) ۱۹/۹، ۲۹/۱۶

شَاقُّوْا: وہ مخالف ہوئے، مُشَاقَّۃٌ شِقَاقٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَشَاقُّوْنَ اور شِقَاقٌ) ۹/۱۶، ۲۶/۸، ۲۸/۴

شَاكِرٌ: قدردان، حق ماننے والا، شُكْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، امام راغب لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو جب شکر سے متصف کیا جائے تو اس سے اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر انعام فرمانا اور جو کچھ عبادت کہ انہوں نے دا کی ہے اس کی جزا دینا مراد ہوتا ہے (ملاحظہ ہو شُكْرٌ اور شَكَرَ) شَاكِرًا ۵/۱۸، ۱۴/۲۲، ۲۹/۱۹

شَاكِرُوْنَ: حق ماننے والے شکر گذار، شُكْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، شَاكِرٌ کی جمع بحالت رفع، ۱۷/۶

شَاكِرِيْنَ: شکر گزار، شکر کرنے والے، احسان ماننے والے، شُكْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر شَاكِرٌ کی جمع بحالتِ نصب وجر، ۴/۶، ۷/۱۲-۱۴، ۹/۹، ۱۴/۷-۹، ۸/۱۱، ۲۴/۴

شَاكِلَتِهٖ: اس کا ڈھنگ، شَاكِلَۃٌ شَكْلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث مضاف ہے، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، علامہ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں :-

"شاکلہ کے معنی اس طریقہ اور روش کے ہیں کہ جو اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے، فرار کا بیان یہی ہے اور یہ شکل سے ماخوذ ہے، کہا جاتا ہے لست علی شکلی ولا شاکلتی (تو میرے طریقے اور روش پر نہیں ہے) شکل کے معنی مثل اور نظیر کے ہیں اور شکل بالکسر کے معنی ہیئت کے ہیں، بولتے ہیں جاریۃ حسنۃ الشکل (اچھی شکل کی لڑکی)" [1]

راغب اصفہانی رقمطراز ہیں :-

"ارشاد الٰہی کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاكِلَتِهٖ (ہر ایک کام کرتا ہے اپنے ڈھنگ پر) ع ہر کسے آں کند کز وشاید یعنی اس سجیۃ (طبیعت) پر کہ جس کا تم نے اسے پابند کیا ہے، کیونکہ سجیۃ کا غلبہ

[1] البحر المحیط، ج ۶، ص ۶۸

انسان پر چھائے رہتا ہے جیسا کہ میں نے الذریعہ الی مکارم الشریعہ میں بیان میں کیا ہے، یہ آیت اسی طرح کی ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد کل میسّر لما خلق لہ (ہر ایک کے لئے وہی چیز آسان ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے) ۱۵/۹

شٰمِخٰتٍ: اونچے، بلند، شُمُوخٌ سے جس کے معنی بلند ہونے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث شَامِخَۃٌ کی جمع، ۲۹/۲۱

شَاْنٍ: دھندا، فکر، حال، کسی اہم معاملہ یا حال کو خواہ برا ہو یا بھلا شَاْن کہتے ہیں، شُئُوْنٌ جمع، ۱۱/۱۲ ۲۷/۱۲ ۳۰/۵

شَاْنِهِمْ: ان کا کام، ان کا معاملہ، شَاْن مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۸/۱۵

شَانِئَكَ: تیرا دشمن، شَانِئٌ شَنَأَ سے جس کے معنی دشمن رکھنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر مضاف ہے، کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۳۰/۳۳

شَاوِرْهُمْ: تو ان سے مشورہ کر، شَاوِرْ مُشَاوَرَۃٌ سے جس کے معنی باہم مشورہ کرنے کے ہیں امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب

ب

شَاهِدٌ: گواہ، حاضر ہونے والا، بتانے والا، شَہَادَۃٌ اور شُہُوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء گرامی میں سے ہے کیونکہ آپ قیامت میں امت کے گواہ اور دنیا میں تعلیم ربانی کے بتانے والے ہیں (ملاحظہ ہو شَہَادَۃ) ۱۲،۱۳/۱۱ ۱/۲۶ ۱/۳ ، شَاهِدًا ۳/۲۲ ۹/۲۶ ۱۳/۲۹

شَاهِدُوْنَ: گواہ، حاضر ہونے والے، شَہَادَۃٌ اور شُہُوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، شَاهِدٌ کی جمع بحالت رفع، ۹/۲۳

شَاهِدِيْنَ: گواہ، ماننے والے، شہادت دینے والے، شَہَادَۃٌ اور شُہُوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، شَاهِدٌ کی جمع بحالت نصب و جر، ۱۳،۱۷/۳ ۵/۷ ۹/۱۰ ۵،۶/۱۷ ۸/۲۰

فصل الباء الموحدة

شُبِّهَ: وہی صورت بنادی گئی، مانند کردیا گیا، تَشْبِیْہٌ سے جس کے معنی کسی چیز کو کسی چیز کے مانند کر دینے کے ہیں، ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ ۲/۶

فصل التاء المثناة

شِتَاءِ: جاڑا، موسم سرما، اَشْتِیَۃٌ جمع بعض علماء نے شِتَاءٌ کو شَتْوَۃٌ کی جمع بتلایا ہے (ملاحظہ ہو سَنَۃ) ۳۰/۳۱

شَتّٰی: طرح طرح، جدا جدا، مختلف، متفرق، پراگندہ، بعض کے نزدیک یہ لفظ مفرد ہے اور بعض نے اس کو شَتِیْتٌ کی جمع بیان کیا ہے۔ ۱۶/۱۱ ۲۸/۵ ۳۰/۱۷

فصل الجیم المعجمۃ

شَجَرٌ: درخت، اَشْجَارٌ جمع۔ ۸/۱ ۱۴/۹ ۲۳/۴ ۲۷/۱۱،۱۵

شَجَرَ: اختلاف ہوا، جھگڑا ہوا (نصر) شُجُوْرٌ سے جس کے معنی آپس میں جھگڑنے اور اختلاف کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ۵/۶

شَجَرَۃٌ: درخت، واحد مونث ہے، اس کی جمع شَجَرَاتٌ آتی ہے۔ ۱/۲ ۵/۹ ۱۳/۱۹ ۱۵/۶ ۱۶/۶ ۱۸/۱۰،۱۱ ۲۰/۷ ۲۱/۱۲ ۲۳/۶،۹ ۲۵/۱۶ ۲۶/۱۱

شَجَرَتَهَا: اس کا درخت۔ شَجَرَۃٌ مضاف ھا ضمیر واحد مونث غائب، مضاف الیہ، ۲۷/۱۵

شَجَرَهَا: اس کا درخت، شَجَرَ مضاف ھا ضمیر واحد مونث غائب، مضاف الیہ، ۳۰/۲

فصل الحاء المہملۃ

شُحَّ: خود غرضی، کنجوسی، بخل، حرص، راغب لکھتے ہیں کہ "شح وہ بخل ہے جس میں حرص ہو اور عادت بن گیا ہو" اردو میں اس کے لئے خود غرضی کا لفظ موزوں ہے، یہ مصدر ہے اس کا فعل باب عَلِمَ، ضَرَبَ اور نَصَرَ تینوں سے آتا ہے، ۵/۱۶ ۲۸/۴ ۲۸/۱۶،۱۲

شُحُوْمَهُمَا: ان دونوں کی چربی، شُحُوْمٌ شَحْمٌ کی جمع جس کے معنی چربی کے ہیں، مضاف ہے، ھُمَا ضمیر تثنیہ مونث غائب، مضاف الیہ، ۸/۵

فصل الدال المہملۃ

شِدَادٌ: سخت، زبردست، مضبوط، شَدِیْدٌ کی جمع (ملاحظہ ہو اَشِدَّاءُ اور شَدِیْدٌ) ۱۲/۱۶ ۲۹/۱۹ شِدَادًا ۳۰

شَدَدْنَا: ہم نے قوت دی، ہم نے مضبوط کیا (نصر و ضرب) شَدٌّ سے جس کے معنی مضبوط باندھنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع متکلم، راغب نے لکھا ہے کہ شِدَّۃٌ کا استعمال باندھنے کے لئے بھی

ہوتا ہے اور بدن کے بارے میں بھی اور نفس کی قوتوں کے متعلق بھی اور عذاب کے واسطے بھی، ب ۲۳/۱۱ ب ۲۹/۲

شُدُّوْا: تم مضبوط باندھو، شَدٌّ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر. ب ۲۶/۵

شَدِیْدٌ: سخت مستحکم، پکا، شَدٌّ سے بروزن فَعِیْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ، واضح رہے کہ شَدِیْدٌ کے معنی بخیل کے بھی آتے ہیں جیسے وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (اور آدمی مال کی محبت میں بخیل ہے) اس صورت میں فَعِیْلٌ بمعنے مفعول بھی ہوسکتا ہے گویا مشدود یعنی بندھا ہوا ہے اور بمعنی فاعل بھی کہ اس نے اپنی تھیلی باندھ رکھی ہے۔

ب ۲/۴،۸،۱۰ ب ۳/۹،۱۰ ب ۶/۵ ب ۷/۲ ب ۸/۲ ب ۹/۱۶،۱۷ ب ۱۰/۲،۳
ب ۱۱/۱۲ ب ۱۲/۷،۱۹ ب ۱۳/۷،۸،۱۳،۱۴ ب ۱۵/۱ ب ۱۷/۸ ب ۱۸/۴ ب ۱۹/۱۸
ب ۲۲/۱۲،۱۳،۱۴ ب ۲۳/۱۱ ب ۲۴/۴،۸ ب ۲۵/۳،۴ ب ۲۶/۱۰،۱۶ ب ۲۷/۵،۱۹
ب ۲۸/۴،۵ ب ۳۰/۱۰،۲۵

شَدِیْدًا ب ۳/۱۴ ب ۹/۱۱ ب ۱۵/۶،۱۲ ب ۱۹/۱۷ ب ۲۱/۱۸ ب ۲۴/۱۸
ب ۲۸/۳،۱۸ ب ۲۹/۱۱

فصل الراء المهملة

شَرٌّ: برائی، شر جس سے سب کو نفرت ہو وہ شر ہے، اس کی تحقیق سابق میں لفظِ خیر کے ضمن میں گزر چکی ہے اور وہیں اس کے انواع کا بھی مذکور ہوچکا ہے، شُرُوْرٌ جمع، ب ۲/۱۰ ب ۴/۹ ب ۶/۱۳ ب ۹/۱۷ ب ۱۰/۳ ب ۱۱/۷
ب ۱۳/۳ ب ۱۵/۹،۱۲ ب ۱۶/۸ ب ۱۷/۱۳،۱۶ ب ۱۹/۱ ب ۲۳/۱۳ ب ۲۵/۱
ب ۲۹/۷،۱۹ ب ۳۰/۲۳،۲۸،۲۹

شَرًّا ب ۱۸/۸ ب ۳۰/۲۴

شَرَابٌ: پینے کی چیز، ہر وہ چیز کہ جس کو چبانا نہ پڑے بلکہ پیا جائے، عربی میں اس کے لئے شراب کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اَشْرِبَةٌ جمع، ب ۱۱/۹ ب ۱۴/۱۲
ب ۱۴/۸،۱۵ ب ۱۵/۱۶ ب ۲۳/۱۳ شَرَابًا ب ۲۹/۱۹ ب ۳۰/۱

شَرَابِكَ: تیرے پینے کی چیز، شَرَابِ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، ب ۳/۲

شَرَابُهٗ: اس کے پینے کی چیز، شَرَابُ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ب ۲۲/۱۴

شَرِبَ: اس نے پیا، شُرْبٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، (ملاحظہ ہو اِشْرَبُوْا) ب ۲/۱۷

شُرْبٌ: پینا، شَرِبَ یَشْرَبُ کا مصدر ہے، ب ۲۷/۱۵

شِرْبٌ: پانی پینے کی ایک باری، پانی کا ایک حصہ، شُرْبٌ سے اسم ہے، اَشْرَابٌ جمع، ب ۱۹/۱۲
ب ۲۷/۹

شَرِبُوْا: انہوں نے پیا، شُرْبٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ب ۲/۱۷

شَرَحَ: اس نے دل کھولا شَرْحٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، اصل میں شَرْحٌ کے معنی گوشت وغیرہ کے پھیلنے کے ہیں "شرح صدر" کا مطلب سینہ کا نورِ الٰہی سے کشادہ ہونا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسکین و تقویت کا پانا ہے (ملاحظہ ہو اِنشرح) ۲۲/۱۳، ۲۰/۲۵، ۱۷/۳۰

شَرِّدْ: تو ایسی سزا دے کہ دوسرے دیکھ کر بھاگ جائیں، تَشْرِیْدٌ سے جس کے معنی ایسی سزا دینے کے ہیں کہ دوسرے دیکھ کر بھاگ جائیں، امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۱۰/۳

شِرْذِمَةٌ: تھوڑے سے آدمی، قلیل جماعت شَرَاذِمُ اور شَرَاذِیْمُ جمع، ۸/۹

شَرَرٍ: شرارے، چنگاریاں، شَرَرَۃٌ واحد، ۲۱/۲۹

شَرَعَ: اس نے راہ ڈالی، (فتح) شَرْعٌ سے جس کے معنی صاف راستے پر چلنے اور راہ ڈالنے کے آتے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب،

راغب لکھتے ہیں:-

"ارشادِ الٰہی شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ (راہ ڈالدی تمہارے لئے دین میں) میں ان اصول کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں ساری ملتیں برابر ہیں اور جن کا نسخ صحیح نہیں جیسے حق تعالیٰ شانہ کی معرفت اور اسی طرح کے وہ امور کہ جن کو آیہ کریمہ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (اور جو کوئی یقین رکھے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور کتابوں پر اور رسولوں پر اور قیامت کے دن پر) بتلا رہی ہے۔"

حضرت الاستاذ علامہ محمود حسن خاں ٹونکی مدظلہم نے اسی آیت سے یہ نکالا ہے کہ شریعتِ سماویہ کی ابتدا حضرتِ نوح علیہ السلام کے عہد سے ہوئی ہے، اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:-

"نوح علیہ السلام کے عہد سے شریعتِ سماویہ یعنی اسلام کی ابتدا ہوئی ہے قال سبحانہ تعالیٰ شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا الاٰیۃ، یہ آیت جو پچیسویں پارے میں ہے صاف تاریخ ہے ابتداءِ شریعت اسلام کی۔

نوح علیہ السلام سے پہلے دین و مذہب محض فطرتی تھا یعنی خالقِ عالم ذاتِ واحد ہے اور بس اسی کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا ہے وَمَا کَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَاخْتَلَفُوْا یہ اختلاف بعثتِ انبیاء علیہم السلام کے بعد خلق اللہ نے پیدا کیا ہے:" ۲/۲۵

شُرَّعًا: پانی کے اوپر ظاہر ہونے والے شارع کی جمع، جو شَرَعَ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے، شَرَعَ کے معنی ظاہر ہونے اور پانی کے اندر آنے کے بھی آتے ہیں، پ ۹

شَرَعُوْا: انہوں نے راہ ڈالی، شَرَعَ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۲۵

شِرْعَةً: دستور، شَرَعَ سے اسم ہے امام راغب لکھتے ہیں :-

"شَرَعَ کے معنی ہیں صاف راستہ پر چلنے کے، کہا جاتا ہے شرعت طریقا اور شرع مصدر ہے بعد میں اسے طریق واضح (صاف راستہ) کا اسم قرار دیا گیا، چنانچہ شِرْعٌ، شَرْعٌ اور شَرِیْعَةٌ استعمال ہونے لگا نیز طریقہ الٰہیہ کے لئے اس کا استعارہ کر لیا گیا ارشاد ہے شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا، یہ دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ایک تو وہ راہ کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مسخر فرما رکھا ہے کہ وہ اسی طریق کا طالب ہے جو بندوں کی مصلحتوں اور شہروں کی آبادی کی طرف عائد ہو ارشاد الٰہی وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (اور ہم نے بلند کر دیئے درجے بعض کے بعض پر کہ ٹھہراتا ہے ایک دوسرے کو خدمتگار) میں اسی کی طرف اشارہ ہے، دوسرے وہ دین کہ جس کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا اور حکم دیا ہے کہ انسان اپنے اختیار سے اس کا قصد کرے جس میں شرائع کا اختلاف اور نسخ واقع ہوتا ہے آیۂ شریفہ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا پھر تجھ کو رکھا ہم نے ایک رستہ پر دین کے کام کے تو اسی پر چل) نے اسی کو بیان کیا ہے۔"

اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی "تاج العروس" میں رقمطراز ہیں :-

"مفسرین کے اقوال شرعۃ اور منہاج کی تفسیر میں مختلف ہیں، بعض نے کہا ہے کہ شرعۃ دین اور منہاج طریق ہے، اور بعض کا قول ہے کہ دونوں کے معنی طریق ہی کے ہیں، اور طریق سے مراد یہاں دین ہی ہے لیکن جب لفظ مختلف ہوں تو متعدد الفاظ کو اس لئے لایا جاتا ہے تاکہ اس قصہ اور معاملہ کی تاکید ہو جائے، عنترہ کہتا ہے ع

اقوی و اقفر بعد ام الهیثم

کہ اقوی اور اقفر دونوں کے معنی ایک ہی

ہیں خلوت کے، لیکن دو لفظوں کا ہونا خلوت کے معنی کی تاکید کرتا ہے، حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نے کہا ہے کہ شرعۃ اور منہاج کے معنی سبیل اور سنت (راہ اور طریقے) کے ہیں اور مفردات میں آپ سے یہ منقول ہے کہ شرعۃ وہ ہے جس کو قرآن لیکر آیا اور منہاج وہ ہے جو سنت میں وارد ہوا، قتادہ نے شرعۃ و منہاجا کی تفسیر میں کہا ہے کہ دین ایک اور شریعت مختلف۔[1]

ب ۶ / ۱۱

شَرْقِيًّا: شرقی، مشرق کی سمت والا، شرق کے معنی جانب مشرق کے ہیں جس طرف سے سورج نکلتا ہے اور یٔ اس میں نسبت کے لئے ہے، ب ۱۶

شَرْقِيَّةً: شرقی، مشرق کی سمت والی اس میں تاء تانیث کی ہے، ب ۱۸ / ۱۱

شِرْكٌ: شرک، ساجھا، ساجھی بنانا، شریک ٹھہرانا، شرکۃ اور اشراک سے اسم ہے۔

مولانا شاہ عبد القادر صاحب دہلوی موضح القرآن میں سورۂ بقرہ میں زیر آیہ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ رقمطراز ہیں:-

"شرک یہ کہ اللہ کی صفت کسی اور میں جانے مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے یا وہ جو چاہے کر سکتا ہے، یا ہمارا بھلا یا برا کرنا اس کے اختیار میں ہے اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے مثلاً کسی چیز کو سجدہ کرے اور اس سے حاجت مانگے اس کو مختار جان کر۔"

اور سورۂ نساء میں زیر آیہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ ب ۵ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"اوپر سے ذکر تھا منافقوں کا جو پیغمبر کے حکم پر راضی نہ ہوا اور جدی راہ چلے یہ آیت فرمائی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے پس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔"

اور سورۂ انعام میں زیر آیہ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ فرماتے ہیں:-

"شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجئے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے۔"

اور اسی سورۃ میں زیر آیہ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ

[1] فصل الشین من باب العین

مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا لکھتے ہیں :-

"اب جاننا چاہیے کہ اللہ کی نیاز دینی یہ کہ اس کی
راہ میں جن کو دلوا دے ان کو دینا اس کا فائدہ
اس کو پہنچ پہنچنا اس کی حکم برداری ہے اور
چیز سے فقیر کو فائدہ اور ثواب سے فائدہ دینے
والے کو، پھر جو کسی بزرگ کے واسطے کچھ دے
اگر اسی دھلع پر دے، شرک ہے جس پر اللہ نے
الزام دیا مگر اس بزرگ کو اپنی جگہ ٹھہرا دے کہ
اس کی طرف سے اللہ کی راہ میں جن کو کہا ہے
ان کو دے تو حکم برداری اللہ کی اور چیز فقیر کو
اور ثواب اس شخص کے بدلے اس بزرگ کو"

اور سورۂ یونس میں زیر آیۃ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ
يَتَوَفّٰكُمْ ارقام فرماتے ہیں کہ :-

"اللہ ہی کی طرف سب آخر کو کھینچے جائیں گے
تو بس اللہ ایک ہے اس کے سوائے کی طرف
رجوع کرنا حماقت سے "شرک کرنا ہے"

اور سورۂ نحل میں زیر آیۃ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ،
فرماتے ہیں کہ :

"مشرک کہتے ہیں کہ مالک اللہ ہی ہے یہ لوگ اس
کی سرکار میں مختار ہیں"

اور سورۂ حج میں زیر آیۃ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا
مرقوم ہے :-

"یعنی مواشی ذبح کرنے نیاز اللہ کی ہر دین میں
عبادت رکھا ہے اس کے سوائے اور کی نیاز
ذبح کرنا اس کی عبادت ہو گئی تو شرک ہوا"

شاہ صاحب موصوف نے شرک کے متعلق متفرق
مقامات پر مختصر الفاظ میں جو کچھ فرمایا ہے ان کے
بھتیجے مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے
"تقویۃ الایمان" میں اسی کو تفصیل کے ساتھ بیان
کیا ہے، فرماتے ہیں :-

"سمجھنا چاہیے کہ شرک اسی پر موقوف نہیں کہ
کسی کو اللہ کے برابر سمجھے اور اس کے مقابل
جانے بلکہ شرک کے معنی یہ ہیں کہ جو چیزیں
اللہ نے اپنے واسطے خاص کی ہیں اپنے بندوں
کے ذمہ نشان بندگی کے ٹھہرائے ہیں، وہ
چیزیں کسی اور کے واسطے کرنی اب یہ بات
تحقیق کی چاہیے کہ اللہ صاحب نے کون
کونسی چیزیں اپنے واسطے خاص کر رکھی ہیں کہ
کہ اس میں کسی کو شریک نہ کیا چاہیے سو وہ
باتیں بہت ساری ہیں مگر کئی باتوں کا ذکر
کر دینا ضروری ہے تا اور باقی باتیں ان سے
لوگ سمجھ لیں۔

سو اول بات یہ کہ ہر جگہ حاضر و ناظر رہنا اور ہر چیز کی خبر ہر وقت رکھنی، دور ہو یا نزدیک چھپی ہو کھلی، اندھیرے میں ہو یا اجالے میں آسمانوں میں ہو یا زمینوں میں، پہاڑوں کی چوٹی پر ہو یا سمندر کی تہ میں، یہ اللہ ہی کی شان ہے اور کسی کی یہ شان نہیں، سو جو کوئی کسی کا نام اٹھتے بیٹھتے لیا کرے اور دور و نزدیک سے پکارا کرے اور بلا کے مقابلہ میں اس کی دہائی دیوے اور دشمن پر اس کا نام لے کر حملہ کرے اور اس کے نام کا ختم پڑھے یا شغل کرے یا اس کی صورت کا خیال باندھے اور یوں سمجھے کہ جب میں اس کا نام لیتا ہوں زبان سے یا دل سے یا اس کی صورت کا یا اس کی قبر کا خیال باندھتا ہوں تو وہیں اس کو خبر ہو جاتی ہے اور اس سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی اور جو مجھ پر احوال گزرتے ہیں جیسے بیماری، تندرستی، کشائش و تنگی، مرنا جینا، غم و خوشی سب کی ہر وقت اسے خبر ہے اور جو بات میرے منہ سے نکلتی ہے وہ سب سن لیتا ہے اور جو خیال و وہم میرے دل میں گزرتا ہے وہ سب سے واقف ہے سو ان باتوں سے مشرک ہو جاتا ہے اور اس قسم کی باتیں شرک ہیں، اس کو "اشراک فی العلم" کہتے ہیں یعنی اللہ کا سا علم اور کو ثابت کرنا سو اس عقیدہ سے آدمی البتہ مشرک ہو جاتا ہے، خواہ یہ عقیدہ انبیاء اولیاء سے رکھے، خواہ پیر شہید سے رکھے، خواہ امام و امام زادہ سے، خواہ بھوت و پری سے، پھر خواہ یوں سمجھے کہ یہ بات ان کو اپنی ذات سے، خواہ اللہ کے دینے سے، غرض اس عقیدہ سے ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عالم میں ارادہ سے تصرف کرنا اور اپنا حکم جاری کرنا اور اپنی خواہش سے مارنا اور جلانا اور روزی کی کشائش اور تنگی کرنی اور تندرست اور بیمار کرنا، فتح و شکست دینی، اقبال و ادبار دینا، مرادیں پوری کرنی، حاجتیں برلانی، بلائیں ٹالنی، مشکل میں دست گیری کرنی، برے وقت میں پہنچنا، یہ سب اللہ ہی کی شان ہے اور کسی نبی ولی کی، پیر و شہید کی، بھوت و پری کی یہ شان نہیں، جو کوئی کسی کو ایسا تصرف ثابت کرے اور اس سے مرادیں مانگے اور اس توقع پر نذر و نیاز کرے اور اس کی منتیں مانے اور اس کو مصیبت کے وقت پکارے، وہ مشرک

ہو جاتا ہے اور اس کو "اشراک فی التصرف" کہتے ہیں یعنی اللہ کا سا تصرف ثابت کرنا، سو یہ محض شرک ہے پھر خواہ یوں سمجھے کہ ان کاموں کی طاقت ان کو خود بخود ہے، خواہ یوں سمجھے کہ اللہ نے ان کو ایسی قدرت بخشی ہے، ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ بعضے تعظیم کے کام اللہ نے اپنے لئے خاص کئے ہیں کہ ان کو عبادت کہتے ہیں جیسے سجدہ اور رکوع اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا اور اس کے نام پر مال خرچ کرنا اور اس کے نام کا روزہ رکھنا اور اس کے گھر کی طرف دور دور سے قصد کر کے سفر کرنا اور ایسی صورت بنا کر چلنا کہ ہر کوئی جان لیوے کہ یہ لوگ اس گھر کی زیارت کو جاتے ہیں اور راستے میں اس مالک کا نام پکارنا اور نامعقول باتیں کرنے سے اور شکار سے بچنا اور اسی قید سے جا کر طواف کرنا اور اس کی طرف سجدہ کرنا اور اس کی طرف جانور لیجانے اور وہاں منتیں ماننی اس پر غلاف ڈالنا اور اس کی چوکھٹ کے آگے کھڑے ہو کر دعا مانگنی اور التجا کرنی اور دین و دنیا کی مرادیں مانگنی اور ایک پتھر کو بوسہ دینا اور اس کی دیوار سے اپنا منہ اور چھاتی ملنی اور اس کا غلاف پکڑ کر دعا کرنی اور اس کے گرد روشنی کرنی اور اس کا مجاور بن کر اس کی خدمت میں مشغول رہنا جیسے جھاڑو دینی روشنی کرنی فرش بچھانا، پانی پلانا۔ وضو غسل کا لوگوں کے لئے سامان درست کرنا اور اس کے کنوئیں کے پانی کو تبرک سمجھ کر پینا، بدن پر ڈالنا، آپس میں بانٹنا، غائبوں کے واسطے لیجانا، رخصت ہوتے وقت الٹے پاؤں چلنا اور اس کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرنا، یعنی وہاں شکار نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا، گھاس نہ اکھاڑنا، مویشی نہ چگانا، یہ سب کام اللہ نے اپنی عبادت کے لئے اپنے بندوں کو بتائے ہیں پھر جو کوئی کسی پیر و پیغمبر کو یا بھوت و پری کو یا کسی سچی قبر کو یا جھوٹی قبر کو یا کسی کے تھان کو یا کسی چلّے کو یا کسی کے مکان کو یا کسی کے تبرک کو یا نشان کو یا تابوت کو سجدہ کرے یا رکوع کرے یا اس کے نام کا روزہ رکھے یا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہووے یا جانور چڑھاوے یا ایسے مکانوں میں دور دور سے قصد کر کے جاوے یا وہاں روشنی کرے، غلاف ڈالے، چادر چڑھاوے، ان کے نام

کی چھڑی کھڑے رخصت ہوتے وقت الٹے پاؤں چلے، ان کی قبر کو بوسہ دے، مورچھل جھلے، اس پر شامیانہ کھڑا کرے، چوکھٹ کو بوسہ دیوے ہاتھ باندھ کر التجا کرے، مراد مانگے، مجاور بن کر بیٹھ رہے، وہاں کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرے اور اسی قسم کی باتیں کرے تو اس پر شرک ثابت ہوتا ہے، اس کو "اشراک فی العبادت" کہتے ہیں، یعنی اللہ کی سی تعظیم کسی کی کرنی، پھر خواہ یوں سمجھے کہ یہ آپ ہی اس تعظیم کے لائق ہیں یا یوں سمجھے کہ ان کی اس طرح کی تعظیم کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے اور اس کی تعظیم کی برکت سے اللہ مشکلیں کھول دیتا ہے، ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔

چوتھی بات یہ کہ اللہ صاحب نے اپنے بندوں کو سکھلایا ہے کہ اپنے دنیا کے کاموں میں اللہ کو یاد رکھیں اور اس کی تعظیم کرتے رہیں تاکہ ایمان بھی درست رہے اور ان کاموں میں بھی برکت ہووے جیسے اڑے کام پر اللہ کی نذر ماننی اور مشکل کے وقت اس کو پکارنا اور ہر کام کا شروع اس کے نام سے کرنا اور جب اولاد ہو تو اس کے شکر میں اس کے نام کا جانور ذبح کرنا اور اس کا نام عبداللہ، عبدالرحمٰن، خدا بخش، اللہ دیا، امۃ اللہ، اللہ دی رکھنا اور کھیت اور باغ میں تھوڑا بہت اس کے نام کا رکھنا اور دھن اور ریوڑ میں سے کچھ اس کی نیاز کا رکھنا اور جو جانور اس کے نام کے اس کے گھر کی طرف لیجائے ان کا ادب کرنا یعنی نہ ان پر سوار ہونا نہ لادنا، اور کھانے پینے پہننے میں اس کے حکم پر چلنا یعنی جس چیز کے برتنے کو اس نے فرمایا برتنا اور جو منع کیا اس سے دور رہنا اور برائی بھلائی جو دنیا میں پیش آتی ہے جیسے قحط اور ارزانی، صحت و بیماری، فتح و شکست، اقبال و ادبار، غمی و خوشی، یہ سب اس کے اختیار میں سمجھنا اور اپنا ارادہ جس کام کا بیان کرنا تو پہلے اس کے ارادہ کا ذکر کر دینا جیسا یوں کہنا کہ اگر اللہ چاہے تو ہم فلانا کام کریں گے اور اس کے نام کو ایسی تعظیم سے لینا کہ جس میں اس کی مالکیت نکلے اور اپنی بندگی جیسے یوں کہنا کہ ہمارا رب، ہمارا مالک، ہمارا خالق اور کلام میں جب کھانے کی حاجت ہو تو اسی

کے نام کی قسم کھائی، سواس قسم کی چیزیں اللہ نے
اپنی تعظیم کے واسطے بتائی ہیں، پھر جو کوئی کسی
انبیاء و اولیاء کی، اماموں اور شہیدوں کی، بھوت
و پری کی اس قسم کی تعظیم کرے جیسے اٹکے کام پر
ان کی نذر ماننے، مشکل کے وقت ان کو پکارے
بسم اللہ کی جگہ ان کا نام لیوے، جب اولاد ہو
ان کی نذر و نیاز کرے، اپنی اولاد کا نام عبدالنبی،
امام بخش، پیر بخش رکھے، کھیت اور باغ
میں ان کا حصہ لگا دے، جو کھیتی باڑی سے
آوے پہلے ان کی نیاز کر دے جب اپنے کام
میں لاوے اور دھن اور ریوڑ میں سے ان کے
نام کے جانور ٹھہرا دے اور پھر ان جانوروں
کا ادب کرے، پانی دانے پر سے نہ ہانکے، لکڑی
پتھر سے نہ مارے اور کھانے پینے میں رسموں
کی سند پکڑے کہ فلانے لوگوں کو چاہئے کہ
فلانا کھانا نہ کھاویں، فلانا کپڑا نہ پہنیں، حضرت
بی بی صحنک مرد نہ کھاویں، لونڈی نہ کھاوے،
جس عورت نے دوسرا خصم کیا ہو وہ نہ کھاوے
شاہ عبدالحق کا توشہ حقہ پینے والا نہ کھاوے
اور برائی بھلائی جو دنیا میں پیش آتی ہے اس کو
ان کی طرف نسبت کرے کہ فلانا ان کی پھٹکار
میں آکر سڑی دیوانہ ہو گیا اور فلانے کو انہوں
نے لیا راندا کہ محتاج ہو گیا اور فلانے کو
نواز دیا تو فتح و اقبال مل گیا اور قحط فلانے
ستارے کے سبب سے پڑا، فلانا کام جو فلانے
دن شروع کیا تھا یا فلانی ساعت میں سو پورا
نہ ہوا یا یوں کہے کہ اللہ و رسول چاہے گا تو میں
آؤں گا یا پیر چاہے گا تو یہ بات ہو جائے گی، یا اس
کے تئیں بولنے میں یا معبود، داتا، بے پروا
خداوند خدائیگاں، مالک الملک، شہنشاہ
بولے یا جب حاجت قسم کھانے کی پڑے
تو پیغمبر کی یا علی کی یا امام کی یا پیر کی یا ان کی
قبروں کی قسم کھاوے سو ان سب باتوں سے
شرک ثابت ہوتا ہے اور اس کو "اشراک فی
العادۃ" کہتے ہیں یعنی اپنی عادت کے کاموں
میں جو اللہ کی تعظیم کرنی چاہئے سو غیر کی کرے
سو ان چاروں طرح کے شرک کا صراحتہً قرآن و
حدیث میں ذکر ہے۔"

شرک کی تفصیل و توضیح کے لئے مولانا اسمٰعیل شہید
کی "تقویۃ الایمان" اور مولانا خرم علی بلہوری کی "نصیحۃ المسلمین"
سے بہتر اور مفید کتابیں اردو میں موجود نہیں
شرک کی حقیقت کے سمجھنے اور اچھی طرح ذہن نشین

کرنے کے لئے عام لوگوں کیواسطے ان کا مطالعہ

از بس ضروری ہے (ملاحظہ ہو اَشْرَكَ

شَارِكْهُمْ) ۲۱/۱۱، ۲۲/۹، ۱۲/۷، ۲۶/۱

شُرَكَآءُ: شریک ساجھی، شَرِيْكٌ کی جمع، تمام

قرآن مجید میں یہ لفظ دو مقام پر اس طرح مرسوم ہے

شُرَكٰٓؤُا، کاف کے بعد واو ہے اور واو کے بعد ہمزہ

اور الف ایک تو سورۂ انعام میں اور دوسرے سورۂ شوریٰ

میں لیکن واو تلفظ میں نہیں آتا ہے۔

۱۳/۴، ۱۷/۷، ۱۸/۱۷، ۳/۳، ۱۴/۹، ۱۲/۱۱، ۱۳/۱۲، ۱۱/۱۳، ۱۸/۱۰، ۱/۲۰، ۱۷/۲۲، ۹/۲۳

۱۲/۲۳، ۴/۲۵، ۴/۲۹

شُرَكَآؤُكُمْ: تمہارے شریک، شُرَكَآءُ مضاف

كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۹/۳، ۱۱/۳

شُرَكَآئِكُمْ ۹/۱۱، ۷/۲۱

شُرَكَآؤُنَا: ہمارے شریک، شُرَكَآءُ مضاف

نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۱۸/۱۴

شُرَكَآؤُنَا ۲/۳

شُرَكَآؤُهُمْ: ان کے شریک، شُرَكَآءُ مضاف

هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۳/۳، ۸/۱۱

شُرَكَآئِهِمْ ۲/۳، ۵/۲۱، ۴/۲۹

شُرَكَآئِيَ: میرے شریک، شُرَكَآءُ مضاف،

ی ضمیر واحد متکلم، مضاف الیہ، ۱۰/۱۰، ۱۵/۱۹، ۲۰/۱۰، ۲۵/۱

شِرْكِكُمْ: تمہارا شرک، شِرْكِ مضاف کُمْ ضمیر

جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۲۲/۱۴

شَرَوْا: انہوں نے بیچا (ضَرَبَ) شِرَاءٌ سے

جس کے معنی خرید و فروخت کرنے کے ہیں، ماضی کا

صیغہ جمع مذکر غائب، واضح رہے کہ گو شِرَاءٌ کے

معنی خریدنے اور بیچنے دونوں کے ہیں لیکن بلشتر اس کا

استعمال بیچنے ہی کے لئے ہوتا ہے۔ ۱/۱۲

شَرَوْهُ: انہوں نے اس کو بیچ ڈالا، اس میں

هُ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، ۱۲/۱۲

شَرُّهٗ: اس کی شر، اس کی برائی، شَرُّ مضاف

هُ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، ۲۹/۱۹

شِرْعَةً: رستہ، شریعت، الٰہی طریقہ، شَرْعٌ

سے اسم ہے، راغب لکھتے ہیں:۔

"بعض علماء کا بیان ہے کہ شریعت کا شریعت نام

پڑا شرا الماء (پانی کا گھاٹ) سے تشبیہ کی بناء

پر اس حیثیت سے کہ جو اس کی سچی حقیقت پر مطلع

ہوا سیراب ہوگیا اور پاک ہوا اور میری مراد

سیرابی سے وہ ہے جس کو کسی حکیم نے بیان کیا

ہے کہ کنت اشرب فلا اروی فلما عرفت

اللہ تعالیٰ رویت بلا شرب (میں پیتا رہا

اور سیراب نہ ہوا پھر جب اللہ تعالیٰ کی معرفت

لہ مفاتیح الغیب معروف بہ تفسیر کبیر ج ۲۰ ص ۱۵ (طبع مصر)

ہوئی تو بلا پیئے سیراب ہو گیا) اور پاک ہونے سے مراد وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (اللہ یہی چاہتا ہے کہ دور کرے تم سے گندی باتیں اے نبی کے گھر والو اور ستھرا کر دے تم کو ایک ستھرائی سے) ۲۵/۸

شَرِيكٌ: شریک ساجھی، شِرْكَةٌ سے بروزن فَعِيلٌ بمعنی فَاعِلٌ ہے شُرَكَاءُ جمع، ۱۵/۱۲ ۱۵/۱۶

فصل الطاء المہملۃ

شَطْأَهُ: اس کی سوئی، اس کا پٹھا، اس کا پتہ، شَطْءٌ مضاف ہ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، شَطْءٌ کے معنی پودے کی سوئی کے ہیں جو اس کی دونوں جانب پھوٹ نکلتی ہے اس کی جمع شُطُوءٌ اور اَشْطَاءٌ ہے، ۲۶/۱۲

شَطْرٌ: طرف، سمت، جہت، اسم ہے جب یہ اس معنی میں آتا ہے تو اس سے فعل کا استعمال نہیں ہوتا، امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں کہ "اہل لغت کا بیان ہے کہ شطر اسم مشترک ہے جو دو معانی کیلئے آتا ہے، ایک بمعنی نصف کے اور دوسرے بمعنی طرف سامنے اور طرف کے۔" ۲/۱

شَطْرَهُ: اس کی سمت، اس کی جانب اس کی طرف، شَطْرَ مضاف ہ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۲/۲

شَطَطًا: جو بات حق سے دور، شَطَّ يَشُطُّ اور شَطَّ يَشِطُّ کا مصدر ہے جس کے معنی اصل میں افراطِ بُعد یعنی حد سے زیادہ دور ہونے کے ہیں اور چونکہ حد سے بڑھنا جور و ستم ہے اس لئے ان معنوں میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اور اسی لئے اس بات کو جو حق سے دور ہو شَطَط کہتے ہیں، ۱۵/۱۴ ۱۹/۱۱

فصل العین المہملۃ

شَعَآئِرَ اللّٰهِ: اللہ کی نشانیاں، اللہ کے نام کی چیزیں، یعنی وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ذمہ نشان بندگی ٹھہرائے ہیں، امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں:-

"معلوم رہے کہ شعائر جمع ہے اکثر علماء اس پر ہیں کہ شَعِيرَةٌ کی جمع ہے اور ابنِ فارس نے اس کا واحد شِعَارَةٌ بتایا ہے شَعِيرَةٌ بروزن فَعِيلَةٌ بمعنی مُفْعَلَةٌ (یعنی مَشْعَرَةٌ) ہے

اور مَشْعَرَۃ کے معنی نشانی کے اور اِشْعَار کے معنی علم میں لانے کے ہیں جس شے کے متعلق اشعر آئیگا اَعْلَمَ (وہ علم میں لایا، اس نے اطلاع دی) کے معنی ہوں گے اور ہر وہ شے کہ جو کسی چیز کا نشان مقرر ہو یا جو کسی علامت کو بتائے اسے شعیرۃ سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔" [1]

اور امام ابوبکر احمد بن علی جصاص رازی حنفی رقمطراز ہیں :۔

"اہلِ لغت کا بیان ہے کہ شَعَائِر، شَعِیْرَۃ کی جمع ہے شَعِیْرَۃ وہ نشانی ہے جو اس چیز کو بتاتی ہے جس کے لئے وہ مقرر کی گئی ہے، اشعار بدن کے یہ معنی ہیں کہ تم اس پر ایسی نشانی مقرر کرو جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ ھدی (قربانی کا جانور) ہے اور اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ شعائر تمام مناسکِ حج کی تمام علامات کا نام ہے جن میں رمی جمار اور سعی بین الصفا والمروہ داخل ہیں اور حبیب معلم عطاء سے راوی ہیں کہ ان سے شعائر اللہ کے متعلق سوال ہوا تو کہنے لگے "حرمات اللہ" (اللہ کا ادب) اس کی طاعت کا اتباع اور معصیت سے اجتناب یہ "شعائر اللہ" ہیں اور شریک نے بروایت جابر عطاء سے آیت وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ کی تفسیر میں قربانی کا فربہ اور بڑے ڈیل ڈول کا کرنا بیان کیا ہے اور ابن ابی نجیح نے بھی بروایتِ مجاہد حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے آیۃ مذکورہ کی تفسیر میں یہی نقل کیا ہے کہ تعظیم کا مطلب قربانی عمدہ، فربہ اور بلند بالا کرنا ہے، عکرمہ سے بھی یہی مروی ہے اور یہی مجاہد کا قول ہے اور حسن (البصری) نے کہا ہے کہ شعائر اللہ سے مراد اللہ کا دین ہے، ابوبکر کہتے ہیں کہ آیۃ مذکورہ میں یہ سب وجوہ مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ آیت میں سب کا احتمال موجود ہے۔" [2]

اور سورۂ مائدہ میں آیہ لَا تُحِلُّوْا شَعَائِرَ اللّٰهِ (اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ :۔

"شعائر اللہ، اللہ کے دین کے تمام نشانات پر حاوی ہے یعنی دین کے وہ فرائض اور نشانات کہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتلا دیا ہے کہ ان کے حدود سے تجاوز نہ کریں اور ان کے

[1] تفسیر کبیر، ج ۶، ص ۲۵۳ (طبع مصر سنیہ)

[2] احکام القرآن، ج ۳، ص ۲۹۸ (طبع مصر ۱۳۴۷ھ)

حقوق میں کوتاہی نہ ہو اور انہیں ضائع نہ ہونے دیں۔
یہ معنی ان تمام معانی کو جامع ہیں کہ جو سلف سے
اس کی تشریح میں مروی ہیں۔ [۱]

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی ارقام
فرماتے ہیں :-

"شعائر در اصل جمع شعیرۃ است یا جمع
شعارۃ است بمعنی علامت و شعائر اللہ در
عرف دین مکانات و ازمنہ و علامات و اوقات
عبادت را گویند، اما مکانات عبادت پس
مثل کعبہ و عرفہ و مزدلفہ و جمارِ ثلثہ و صفا و مروہ
و منا و جمیع مساجد اند و اما ازمنہ پس مثل رمضان
و اشہر حرم و عید الفطر و عید النحر و جمعہ
و ایام تشریق اند، اما علامات پس مثل اذان و
اقامت و ختنہ و نماز جماعت و نمازِ جمعہ و
نمازِ عیدین اند و در ہمہ ایں چیز ہا معنی علامت
بودن متحقق ست زیرا کہ مکان و زمان عبادت
نیز از عبادت بلکہ از معبود یاد میدہد۔" [۲]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے
اپنی بے نظیر کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" میں ایک مستقل
باب باندھا ہے بابُ تعظیم شعائر اللہ "شعائر اللہ"
کی مزید تشریح و تفصیل کے سمجھنے کے لئے اہل
علم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

$\frac{۲}{۳}$ $\frac{۶}{۵}$ $\frac{۱۷}{۱۱ ، ۱۲}$

شُعَبٍ : پھانکیں، شاخیں، حصے شُعْبَۃٌ کی
جمع جس کے معنی شاخ اور حصہ کے ہیں۔ $\frac{۲۹}{۲۱}$

شِعْرَ : شعر، شعر کہنا، شَعَرَ یَشْعُرُ کا مصدر ہے
جس کے معنی شعر کہنے کے ہیں نیز ادب کی اصطلاح
میں شعر نام ہے اس کلام کا جو موزون ہو اور متکلم
نے بہ ارادہ موزون کیا ہو۔

راغب اصفہانی لکھتے ہیں :-
"شَعْرٌ کے معنی معروف ہیں (بال کو کہتے ہیں)
جمع ہے ارشاد ہے وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا
وَاَشْعَارِهَا (اور بھیڑوں کی اون سے اور
اونٹوں کی ہیریوں سے اور بکریوں کے بالوں
سے) اور شَعَرْتُ کے معنی ہیں میں نے بالوں
کو حاصل کر لیا (یعنی گھنے بال کر لئے) اور اسی
سے استعارہ کیا گیا ہے شَعَرْتُ کذا یعنی
میں نے علم حاصل کیا جو باریکی میں ایسا ہے جیسے
بال کا پتہ چلانا، اور شاعر کو شاعر اس کی
فطانت اور دقت معرفت ہی کی بنا پر

[۱] احکام القرآن، ج ۲، ص ۳۶۶
[۲] تفسیر فتح العزیز، ص ۳۶۹ (المطبع مجتبائی دہلی)

کہا گیا ہے پس شعر اصل میں علم دقیق کا نام ہے عرب کا محاورہ ہے لیت شعری (کاش مجھے اس کا گہرا پتہ ہوتا) اور عرف میں جو کلام موزون اور مقفیٰ ہو اس کا نام شعر ہے اور جو صنعت شعر گوئی سے مخصوص ہو اس کا نام شاعر ہو گیا ہے۔

قرآنِ مجید میں کفار کی زبانی مذکور ہے بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ (نہیں جھوٹ باندھ لیا ہے نہیں شعر کہتا ہے) اور لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (ایک شاعر دیوانہ کے لئے) اور شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (یہ شاعر ہے ہم منتظر ہیں اس پر گردش زمانہ کے) بہت سے مفسرین نے تو اسے اس پر محمول کیا ہے کہ کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگایا تھا کہ آپ (نعوذ باللہ) منظوم و مقفیٰ شعر پیش کرتے ہیں حتیٰ کہ انہوں نے قرآن میں جہاں کہیں بھی ایسے الفاظ آئے ہیں جن میں وزن کا شبہ ہوتا ہے جیسے کہ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ اور تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ ہیں، ان سب کی تاویل کی ہے۔

اور بعض حقیقت شناسوں نے کہا ہے کہ اس الزام سے کافروں کا یہ مقصد تھا ہی نہیں کیونکہ کلام اللہ سے ظاہر ہے کہ وہ اسالیب شعر پر نہیں ہے اور یہ بات ایسی ہے کہ عجم کے غیر فصیح لوگوں پر بھی مخفی نہیں، فضلاءِ عرب کا تو ذکر ہی کیا، بلکہ انہوں نے (نعوذ باللہ) آپ کو کذب سے منسوب کیا تھا کیونکہ شعر کی تعبیر کذب سے کی جاتی ہے اور شاعر بمعنی کاذب ہے حتیٰ کہ ایک قوم نے تو ادلۂ کاذبہ کا نام ہی ادلۂ شعریہ رکھا ہے اور اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے عام شعراء کا یہ وصف بیان فرمایا ہے وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ (اور شاعروں کی بات پر چلیں وہی جو بے راہ ہیں، تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے اور اسی باعث کہ شعر جھوٹ کا ٹھکانہ ہے کہا گیا ہے احسن الشعر اکذبہ (احسن اوست اکذب او) اور بعض حکماء کا بیان ہے کہ کوئی متدین صادق اللہجہ شاعری میں نادرہ کار نہیں دیکھا گیا۔

بہرحال یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم ترجمانِ حقیقت تھے، شاعر نہ تھے، نہ شاعری آپ کے لئے زیبا تھی۔ پیغمبرانہ صداقت اور شاعرانہ تخیلات میں زمین آسمان کا فرق ہے البتہ کسی موقع پر کسی شاعر کا شعر پڑھ دینا یا رجز کے وقت بے ساختہ مقفی عبارت زبان مبارک سے نکل جانا، یہ ایک الگ بات ہے اسے شاعری نہیں کہتے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ:-

"اس امر میں اختلاف کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کسی شعر کا بطورِ مثال بیان کرنا یا کسی دوسرے کا شعر بطورِ حکایت نقل کرنا روا تھا تو صحیح یہ ہے کہ ایسا کرنا آپ کے لئے جائز تھا۔" [1]

علامہ احمد قسطلانی مواہبِ لدنیہ میں لکھتے ہیں کہ:-

"آیا شعر کی ممانعت صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص تھی یا نوعِ انبیاء کے لئے تھی بعض علماء کا بیان ہے کہ یہ ممانعت عام تھی کیونکہ ارشاد ہے وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (اور ہم نے نہیں سکھایا اس کو شعر کہنا اور یہ اس کے لائق نہیں) اور اس میں خصوصیت کی کوئی وجہ ظاہر نہیں ہے۔" [2] ۲۳/۴

شُعَرَآءُ: شاعر لوگ، شَاعِرٌ کی جمع ہے خلافِ قیاس، علامہ احمد فیومی ابن خالویہ سے ناقل ہیں کہ:-

"شاعر کی جمع شَعَرَاء اس لئے آئی کہ بعض عرب شُعَرَاء بالضم بولتے ہیں اس لئے قیاس یہ ہے کہ اس سے صفت کا صیغہ فَعِیْل کے وزن پر آئے جیسے شُرَفَاء کہ شَرِیْف کی جمع ہے پر اس طرح کہا جاتا تو شَعِیْر سے التباس ہوتا جس کے معنی جَو کے ہیں لہٰذا انہوں نے شاعر کہا اور اس کے اصلی وزن کو ملحوظ رکھا ہاں عُلَمَاء اور حُلَمَاء وغیرہ جو ہیں سو علیم اور حلیم کی جمع ہیں۔" [3] ۱۹/۱۵

شِعْرٰی: شِعْرٰی ایک مشہور ستارہ کا نام ہے، خاص طور پر اس کا ذکر اس لئے کیا کہ عرب کی ایک قوم کا یہ معبود تھا، شیخ سلیمان جمل لکھتے ہیں:-

"عربی زبان میں شِعْرٰی نام کے دو ستارے ہیں ان میں سے ایک الشعری العبور کہلاتا ہے اور وہی آیہ کریمہ میں مراد ہے کیونکہ قبیلہ خزاعہ

[1] فتح الباری، ج ۱۰، ص ۴۴۵ (طبع مصر ۱۳۰۰ھ)
[2] مواہب اللدنیہ مع شرح زرقانی، ج ۵، ص ۲۵۵ (طبع مصر)
[3] تاج العروس

اس کی پرستش کیا کرتا تھا، قبیلہ کے سرداروں میں ایک شخص ابوکبشہ نامی تھا، اس نے اس کی پوجا کا طریق قائم کیا، کہنے لگا کہ سارے ستارے تو آسمان کو عرض میں قطع کرتے ہیں اور شعریٰ طول میں قطع کرتا ہے اس لئے یہ ان سے جدا ہے چنانچہ اس نے اس کی پوجا شروع کر دی اور خزاعہ و حمیر بھی اسے پوجنے لگے، ابوکبشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناناؤں میں سے کوئی ہوا ہے، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مشرکین قریش کو اللہ کی طرف دعوت دی اور ان کے مذاہب کی مخالفت کی تو وہ آپ کو اس شخص سے مشابہت دے کر کہ اس نے ان کے دین کے سوا نیا دین نکالا تھا ابن ابی کبشہ کہنے تھے۔

یہ ستارہ جوزا کے بعد سخت گرما کے زمانہ میں طلوع ہوتا ہے اور شعریٰ یمانیہ سے موسوم ہے اور دوسرا ستارہ الشعریٰ لغمیصا (بغین معجمہ مضموم و میم مفتوح و صاد مہملہ) غمیصٰی ہے بہ تصغیر ہے بمعنی چشم جس کے معنی آنسوؤں کے جاری ہونے کے ہیں۔" [1]

رسالہ زینتِ آسمان میں مرقوم ہے :۔

"شعرای یمانی" تمام آسمان میں اس کے برابر کوئی روشن ستارہ نہیں، نیلگوں سفید رنگ ہے اور جب ٹمٹماتا ہے، رنگ بدلتا نظر آتا ہے اس کی روشنی "الدبران" سے بارہ گنی ہے، اس کی ضیاء حقیقی ہمارے آفتاب سے بیس گنی ہے، یہ ہمارے آفتاب سے بہت زیادہ گرم ہے، اس کا فاصلہ ۸½ سال نوری [2] ہے، یعنی ان ستاروں میں سے ہے جو ہم سے قریب ہیں، یہ ہماری طرف ۳۰۰ میل فی منٹ بڑھ رہا ہے، چونکہ کلب اکبر کا مشہور ستارہ شعریٰ ہی ہے اس لئے اسے "کلب الجبار" بھی کہتے ہیں، ۲۵ جولائی سے ۵ ستمبر تک آفتاب اور کلب الجبار کا طلوع تقریباً ایک ہی وقت پر ہوتا ہے ان دنوں کو ایام الکلب کہتے ہیں۔" [3] ۲۷

---

[1] حاشیۃ الجمل علی الجلالین، ج ۴، ص ۲۳۸ (طبع مصر ۱۳۵۲ھ) [2] نور یعنی روشنی کی رفتار فی سکنڈ ۱۸۶۰۰۰ میل ہے، ایک سال نوری کا مطلب یہ ہے کہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے کسی ستارے کی روشنی ایک سال کی مدت میں ہم تک پہنچتی ہے۔

[3] زینتِ آسمان، از برکت علی و منہاج الدین پروفیسران اسلامیہ کالج پشاور، ص ۲۹ (طبع اول)۔

شُعُوبًا: ذاتیں، شاخیں، شَعْبٌ کی جمع، جس کے معنی قبائل کے اس جدِ اعلیٰ کے ہیں جہاں سب قبیلے جا کر مل جاتے ہوں یا شعب وہ ایک برادری ہے جو شاخ در شاخ پھیل گئی ہو، عرب میں قبیلہ کی تدریجی تقسیم کثرت سے قلت کی طرف حسب ترتیب ذیل ہے:۔

پہلے شَعْب پھر قبیلہ پھر عمارہ پھر بطن پھر فخذ پھر فصیلہ۔ ابو اسامہ نے تصریح کی ہے کہ یہ طبقے انسانی خلقت کی ترتیب پر ہیں، شعب سب سے عظیم تر ہے، شعب الرأس (جہاں دماغ کے چاروں حصے جڑتے ہیں) سے مشتق ہے پھر قبیلہ اپنے اجتماع کی بنا پر قبیلۃ الرأس (کھوپڑی کا وہ حصہ جو شاخ در شاخ ہوتا ہے) سے ہے، پھر عمارہ ہے جس کے معنی سینہ کے ہیں، پھر بطن (پیٹ) ہے، پھر فخذ (ران) ہے، پھر فصیلہ ہے جس کے معنی پنڈلی کے ہیں [1] ۲۶/۱۴

شُعَیْبٌ: شعیب علیہ السلام مشہور پیغمبر ہیں۔ ابن عساکر بطریق اسحٰق بن بشر، شرقی بن القطامی سے جو علمِ انساب کے بڑے ماہر تھے، ناقل ہیں کہ آپ عبرانی کے ثیروب ہیں اور عربی کے شعیب [2]، صغانی نے کہا ہے کہ عربی نام ہے، ممکن ہے کہ شَعَب کی تصغیر ہو یا اَشْعَب (بہت چوڑے سینہ والا) کی جس طرح کہ اہلِ عرب اَسْوَد کی تصغیر میں سُوَید کہتے ہیں، یہ تصغیر ترخیم [3] ہے، راغب لکھتے ہیں کہ شعیب یا تو شَعْبٌ مصدر کی تصغیر ہے (جس کے معنی فراہم کرنے اور پراگندہ کرنے کے ہیں) اور یا شَعْبٌ اسم کی (جس کے معنی بڑے قبیلہ کے آتے ہیں) اور یا شِعْبٌ کی (جس کے معنی پہاڑ کی گھاٹی کے ہیں) بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اسے مصغر بتانا غلط ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے ناموں کی تصغیر جائز نہیں ہے، لیکن یہ امر قابلِ بحث ہے کیونکہ یہ حکم نام کے وضع ہو جانے کے بعد ہے نہ کہ نام رکھتے وقت علاوہ ازیں مختار یہ ہے کہ یہ اسم مرتجل [4] ہے اور اسی طرح اس کی وضع عمل میں آئی ہے [5]

صحیح ابنِ حبان میں حضرتِ ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مرفوعاً وارد ہے کہ چار پیغمبر عرب سے ہیں، ہود، صالح، شعیب اور تمہارے نبی اے ابو ذر! [6]

[1] تاج العروس، فصل الشین من باب الباء [2] الدر المنثور، ج ۳، ص ۱۰۲ [3] تاج العروس فصل الشین من باب الباء۔
[4] ملاحظہ ہو، روح المعانی، ج ۸، ص ۱۵۳ [6] پوری حدیث لفظِ انبیاء کے ضمن میں گزر چکی ہے۔
[5] مرتجل وہ اسم ہے جس کو وضع کرتے وقت پہلے معنی کی مناسبت ملحوظ نہ ہو۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی رو سے حضرتِ شعیب علیہ السلام عرب عاربہ سے ہیں[1]۔ بعض کا خیال ہے کہ آپ عرب کے قبیلہ بنو عنزہ بن اسد سے ہیں کیونکہ طبرانی اور ابن قانع نے حضرت سلمہ بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب وہ اپنے قبیلہ بنو عنزہ کا وفد لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قبیلہ عنزہ کی طرف اپنا انتساب ظاہر کیا تو آپ کی زبانِ مبارک سے ارشاد ہوا مرحبا بقوم شعیب واختان موسٰی[2] (شعیب کی قوم اور موسٰی کے سسرال والوں کو مرحبا) لیکن حافظ ابنِ حجر نے فتح الباری میں کہا ہے کہ اس کی اسناد میں مجہول راوی ہیں[3]، اور حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کا پتہ دیتی ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام حضرتِ موسٰی علیہ السلام کے اقربا میں سے ہیں اور عرب عاربہ کے اس قبیلہ سے ہیں جس کو عنزہ کہا جاتا ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ عنزہ بن اسد بن ربیعہ بن نزار بن معد بن عدنان سے ہیں کیونکہ یہ لوگ حضرتِ شعیب علیہ السلام کے زمانۂ دراز کے بعد ہوئے ہیں[4]۔

آپ نے جس حُسنِ اسلوب کے ساتھ قوم کے سامنے دعوتِ حق رکھی تھی اور پھر اس سلسلہ میں جو کچھ باہمی سوال وجواب ہوئے اس کے لفظ لفظ سے آپ کی فصاحت وبلاغت اور حسن خطابت کے جوہر ٹپکتے ہیں، اسی لئے علمائے سلف آپ کو خطیب الانبیاء کہتے تھے۔

ایک مرسل حدیث میں جس کو طبری، حاکم اور ابن ابی حاتم نے یعقوب بن ابی سلمہ سے بروایت ابن اسحٰق نقل کیا ہے وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرتِ شعیب علیہ السلام کا ذکر کرتے تو فرماتے ذاک خطیب الانبیاء (وہ خطیب الانبیاء ہیں)[5] اسحٰق بن بشر نے اس روایت کو بایں سند عن جویر ومقاتل عن الضحاک عن ابن عباس مرفوعاً بھی روایت کیا ہے[6] لیکن سلسلہ سند سخت ضعیف ہے۔

مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عباس

---

[1] فتح الباری، ج۶، ص ۳۴۹ [2] یہ حدیث مجمع الزوائد، ج۱۰، ص ۵۱ (طبع مصر ۱۳۵۳ھ) میں منقول ہے اور ابن قانع کا حوالہ کنز العمال ج۶، ص ۲۰۹ (طبع دائرۃ المعارف) میں ہے [3] فتح الباری ج۶، ص ۳۴۹ [4] البدایہ والنہایہ، ج۱، ص ۱۸۵ (طبع مصر ۱۳۵۱ھ) [5] ملاحظہ ہو تاریخ الامم والملوک ج۱، ص ۱۶۷ (طبع حسینیہ مصر) اور الدر المنثور ج۳ ص ۱۰۳ (طبع مصر) [6] البدایہ والنہایہ، ج۱، ص ۱۸۵ (طبع مصر ۱۳۵۱ھ)

رضی اللہ عنہا سے آیۂ کریمہ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا کی تفسیر میں مروی ہے کہ حضرتِ شعیب علیہ السلام نابینا تھے، حاکم نے اس کو مسلم کی شرط پر صحیح بتایا ہے اور ذہبی نے تلخیص میں حاکم کی تصحیح کو برقرار رکھا ہے[1]۔ ابوالشیخ اور ابن عساکر نے سعید بن جبیر سے جو مشہور جلیل القدر تابعی ہیں روایت کیا ہے کہ اللہ کی محبت میں روتے روتے آپ کا یہ حال ہو گیا تھا، یہ مضمون ایک مرفوع روایت میں بھی آیا ہے[2]، چنانچہ خطیب اور ابن عساکر نے حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام محبتِ الٰہی میں اتنے روئے کہ نابینا ہو گئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپکو دوبارہ بینائی عطا فرمائی اور وحی کی کہ اے شعیب یہ گریہ کیسا ہے، جنت کے شوق میں ہے یا دوزخ کے ڈر سے۔ عرض کیا اے میرے معبود، میرے مولیٰ، تو جانتا ہے کہ نہ تیری جنت کے شوق میں روتا ہوں، دوزخ کے ڈر سے لیکن تیری محبت کو اپنے دل میں جما رکھا ہے جب تیری طرف نظر پڑتی ہے تو پھر مجھے پروا نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کی جانب وحی فرمائی کہ شعیب اگر یہ حق ہے تو تمہیں میری لقا مبارک ہو اور اسی لئے تو میں نے اپنے کلیم موسیٰ بن عمران کو تمہاری خدمت کے لئے کھڑا کر دیا ہے، خطیب نے تاریخ بغداد میں اس حدیث کو منکر کہا ہے[3] اور ذہبی نے میزان میں تصریح کی ہے کہ "یہ حدیث باطل ہے بے اصل ہے[4]" اور ابن کثیر سخت غریب[5] بتلاتے ہیں، آپ کی پیغمبرانہ سیرت اور دعوتِ حق کا تذکرہ قرآن مجید میں جا بجا مذکور ہے (ملاحظہ ہو اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ اور مَدْيَنَ) پ ۹، پ ۱۲، پ ۱۹

شُعَيْبًا پ ۸، پ ۹، پ ۱۲، پ ۲۰

فصل الغین المعجمہ

شَغَفَهَا: اس نے اس کو فریفتہ کر لیا، وہ اس کے دل میں اتر گیا، اس نے اس کے دل میں جگہ پکڑ لی (فتح) شَغَفَ شَغْفًا سے جس کے معنی محبت کے دل کے پردوں میں اتر جانے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ھا ضمیر واحد مؤنث غائب، شَغَافٌ کے معنی پردہ دل کے ہیں اس لئے پردہ دل میں اتر جانے کیلئے

[1] مستدرک حاکم مع تلخیص ذہبی ج ۲ ص ۵۶۸ (طبع دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن) [2] الدر المنثور ج ۳ ص ۳۴۸ [3] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۱۵ (طبع مصر ۱۳۴۹ھ) [4] کنز العمال ج ۶ ص ۱۲۵ [5] البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص ۱۸۸

شغف آتا ہے، ۱۴/۱۲

شُغُلٍ: دھندا، مشغلہ، شغل اَشغَال اور شُغُول کی جمع، ۲۳/۳

شَغَلَتْنَا: ہمیں مشغول کر دیا، ہمیں دھندے میں لگالیا، (فتح) شَغَلَتْ شَغْلٌ سے جس کے معنی مشغول کر لے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، نا ضمیر جمع متکلم، ۲۶/۱

فصل الفاء

شَفَا: کنارہ، یہ لفظ ہلاکت سے قریب ہونے کے لئے ضرب المثل ہے اَشْفَاہ جمع ہے، ۳/۱۱، ۹/۲

شِفَآءٌ: بیماری سے اچھا ہونا، اصل میں شَفَی یَشْفِی کا مصدر ہے اور مرض سے صحت پا جانے کے لئے بطور اسم مستعمل ہے اَشْفِیَۃٌ جمع ہے جیسے کہ سِقَآءٌ کی جمع اَسْقِیَۃٌ ہے، ۱۱/۱۱، ۱۵/۱۴، ۱۹/۱۵، ۱۹/۲۴

شَفَاعَۃٌ: سفارش کرنا، شفاعت کرنا، شَفَعَ یَشْفَعُ کا مصدر ہے، مولانا شاہ اسمٰعیل شہید نے تقویۃ الایمان میں شفاعت پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے فرماتے ہیں:-

"کان رکھ کر سن لینا چاہئے کہ اکثر لوگ انبیاء اولیاء کی شفاعت پر بہت بھول رہے ہیں اور اس کے معنی غلط سمجھ کر اللہ کو بھول گئے ہیں، سو شفاعت کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے، سو سننا چاہیے کہ شفاعت کہتے ہیں سفارش کو اور دنیا میں سفارش کئی طرح کی ہوتی ہے جیسے ظاہر کے بادشاہ کے ہاں کسی کی چوری ثابت ہو جائے اور کوئی امیر وزیر اس کو اپنی سفارش سے بچالیوے تو ایک صورت تو یہ ہے کہ بادشاہ کا جی تو اس چور کے پکڑنے ہی کو چاہتا ہے اور اس کے آئین کے موافق اس کو سزا پہنچتی ہے مگر اس امیر سے دب کر اس کی سفارش مان لیتا ہے اور اس چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ امیر اس کی سلطنت کا بڑا رکن ہے اور اس کی بادشاہت کو بڑی رونق دے رہا ہے سو بادشاہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ایک جگہ اپنے غصہ کو تھام لینا اور ایک چور سے درگزر کر جانا بہتر ہے اس سے کہ اتنے بڑے امیر کو ناخوش کر دیجئے کہ بڑے بڑے کام خراب ہو جاویں اور سلطنت کی رونق گھٹ جائے اس کو "شفاعت وجاہت" کہتے ہیں یعنی اس امیر کی وجاہت کے سبب سے اس کی سفارش قبول کی، سو اس قسم کی سفارش

اللہ کی جناب میں ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی اور جو کوئی نبی و ولی کو یا امام اور شہید کو یا کسی فرشتہ یا کسی پیر کو اللہ کی جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھے سو وہ اصلی مشرک ہے اور بڑا جاہل کہ اس نے خدا کے کچھ معنی ہی نہیں سمجھے اور اس مالک الملک کی قدر کچھ بھی نہ پہچانی، اس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کُن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی اور جن اور فرشتے جبرئیل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے اور ایک دم میں سارا عالم عرش سے فرش تک الٹ پلٹ کر ڈالے اور ایک اور ہی عالم اس جگہ قائم کرے کہ اس کے تو محض ارادے ہی سے ہر چیز ہو جاتی ہے کسی کام کے واسطے کچھ اسباب اور سامان جمع کرنے کی کچھ حاجت نہیں اور سب لوگ پہلے اور پچھلے اور آدمی اور جن بھی سب مل کر جبرئیل اور پیغمبر ہی سے ہو جاویں تو اس مالک الملک کی سلطنت میں ان کے سبب کچھ رونق نہ بڑھ جاویگی اور جو سب شیطان اور دجال ہی سے ہو جاویں تو اس کی کچھ رونق گھٹنے کی نہیں، وہ ہر صورت سے

بڑوں کا بڑا ہے اور بادشاہوں کا بادشاہ اس کا نہ کوئی کچھ بگاڑ سکے اور نہ کچھ سنوار سکے،

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی بادشاہزادوں میں سے یا بیگماتوں میں سے یا کوئی بادشاہ کا معشوق اس چور کا سفارشی ہو کر کھڑا ہو جاوے اور چوری کی سزا نہ دینے دیوے اور بادشاہ اس کی محبت سے لاچار ہو کر اس چور کی تقصیر معاف کر دے تو اس کو شفاعتِ محبت کہتے ہیں یعنی بادشاہ نے محبت کے سبب سے سفارش قبول کر لی اور یہ بات سمجھی کہ ایک بار غصہ پی جانا اور ایک چور کو معاف کر دینا بہتر ہے، اس رنج سے کہ جو اس محبوب کے روٹھ جانے سے مجھ کو ہوگا اس قسم کی شفاعت بھی اس دربار میں کسی طرح ممکن نہیں اور جو کوئی کسی کو اس جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھے وہ بھی ویسا ہی مشرک ہے اور جاہل جیسا کہ اول مذکور ہو چکا، وہ مالک الملک اپنے بندوں کو بہتیرا ہی نوازے اور کسی کو حبیب کا اور کسی کو خلیل کا اور کسی کو کلیم کا اور کسی کو روح اللہ وجیہ کا خطاب بخشے اور کسی کو رسولِ کریم اور

امین اور روح القدس اور روح الامین فرماوے
مگر پھر مالک مالک ہے اور غلام غلام، کوئی
بندگی کے رتبہ سے قدم باہر نہیں رکھ سکتا اور
غلامی کی حد سے زیادہ نہیں بڑھ سکتا، جیسا
اس کی رحمت سے ہر دم خوشی سے جھکتا ہے
ویسا ہی اس کی ہیبت سے رات دن زہرہ
پھٹتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ چور پر چوری ثابت
ہوگئی مگر وہ ہمیشہ کا چور نہیں اور چوری کو کچھ
اس نے اپنا پیشہ نہیں ٹھہرایا مگر نفس کی شامت
سے قصور ہوگیا سو اس پر شرمندہ ہے اور
رات دن ڈرتا ہے اور بادشاہ کے آئین کو
سر آنکھوں پر رکھ کر اپنے تئیں قصوروار سمجھتا ہے
اور لائق سزا کے جانتا ہے اور بادشاہ سے بھاگ
کر کسی امیر وزیر کی پناہ نہیں ڈھونڈتا اور
اس کے مقابلہ میں کسی کی حمایت نہیں جتاتا
اور رات دن اسی کا منہ دیکھ رہا ہے کہ دیکھئے
میرے حق میں کیا حکم فرماوے، سو اس کا یہ حال
دیکھ کر بادشاہ کے دل میں اس پر ترس آتا ہے
مگر آئین بادشاہت کا خیال کر کے بے سبب
درگزر نہیں کرتا کہ کہیں لوگوں کے دلوں میں
اس آئین کی قدر گھٹ نہ جاوے، سو کوئی امیر
وزیر اس کی مرضی پاکر اس تقصیروار کی سفارش
کرتا ہے اور بادشاہ اس امیر کی عزت بڑھانے
کو ظاہر میں اس کی سفارش کا نام کرکے اس
چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے سو اس امیر نے
اس چور کی سفارش اس لئے نہیں کی کہ اس کا
قرابتی ہے یا آشنا یا اس کی حمایت اس نے
اٹھائی بلکہ محض بادشاہ کی مرضی سمجھ کر کیونکہ
وہ تو بادشاہ کا امیر ہے چوروں کا تھانگی جو
چور کا حمایتی بن کر اس کی سفارش کرتا ہے تو
آپ بھی چور ہو جاتا ہے، اس کو شفاعت بالاذن
کہتے ہیں یعنی یہ سفارش خود مالک کی پروانگی
سے ہوتی ہے سو اللہ کی جناب میں اسی قسم
کی شفاعت ہو سکتی ہے اور جس نبی و ولی کی
شفاعت کا قرآن و حدیث میں مذکور ہے
سو اس کے معنی یہی ہیں۔" [1]

پ ۱ / ۱۵،۶ — پ ۳ / ۲ — پ ۵ / ۸ — پ ۱۶ / ۱۵،۹ — پ ۲۴ / ۹ — پ ۲۴ / ۲ — پ ۲۵ / ۱۳ — پ ۲۹ / ۱۶

شَفَاعَتُهُمْ: ان کی شفاعت ان کی سفارش شَفَاعَةُ مضاف، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱۳ / ۶

[1] ماخوذ از تقویۃ الایمان، فصل ثالث

شَفَتَيْنِ: دو ہونٹ، شَفَةٌ کا تثنیہ بحالتِ نصب و جر، شَفَةٌ کے معنی ہونٹ کے ہیں بعض کے نزدیک اس کا لام کلمہ ہا ہے اور اصل شَفَهَةٌ ہے پھر ہا اصلیہ حذف کردی گئی اور دوسری ہا جو تانیث کی علامت تھی باقی رکھی گئی اور بعض کے نزدیک اس کی اصل شَفَوَةٌ ہے، واؤ کو حذف کر کے اس کا فتحہ ماقبل کو دے دیا گیا ہے، شِفَاهٌ اور شَفَوَاتٌ جمع ہے، ۳۰/۱۵

شَفْعِ: جفت (جو طاق کی ضد ہے) جوڑا ایک چیز کا اپنی ہی جیسی چیز کے ضم ہونا، واضح رہے کہ لغت میں تو "شفع" کے یہی معنی ہیں لیکن یہاں اس سے کیا کوئی متعین شے مراد ہے تو اس بارے میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں صنعانی نے کہا ہے کہ شفع و وتر کے بارے میں بیس قول ہیں[1]، تفسیر کبیر کے تکملہ میں یہ سب اقوال درج ہیں[2]، حافظ ابو حیان اندلسی البحر المحیط میں لکھتے ہیں کہ "شفع و وتر" کے بارے میں کتاب التحریر والتحبیر میں چھتیس قول ذکر کیے جن کے پڑھنے ہی سے ہم تنگ آگئے اپنی کتاب میں درج کرنا تو بڑی بات ہے[3]

امام محمد بن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں خوب فیصلہ کیا ہے کہ:-

"اس بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے شفع و وتر کی قسم کھائی ہے اور روایت سے یا عقل سے شفع و وتر کی کسی نوع کی تخصیص نہیں ہوتی کہ یہی نوع ہے اور نوع نہیں اور ہر شفع و وتر کی اللہ نے قسم کھائی ہے تو جس شے کے متعلق بھی اہلِ تفسیر کا بیان ہے کہ اللہ کے اس عموم کی قسم میں داخل ہے تو اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے"[4]

(ملاحظہ ہو وتر) ۳۰/۱۴

شُفَعَاءُ: سفارشی، سفارش کرنے والے، شفاعت کنندہ، شَفِيْعٌ کی جمع، واضح رہے کہ تمام قرآن مجید میں اس کی املا اسی طرح عین الف کے ساتھ ہے مگر سورۂ روم میں یہ عین واؤ کے ساتھ اس طرح مرقوم شُفَعٰٓؤُا، پہلے عین ہے پھر واؤ پھر ہمزہ اور پھر الف اور واؤ اور الف کا تلفظ نہیں ہوتا ہے، ش ۸/۱۳، ۲۱/۵، ۲۴/۲

---

[1] تاج العروس، فصل الشین، باب العین
[2] ملاحظہ ہو تفسیر کبیر، ج ۸، ص ۳۹۳، ۳۹۴ (طبع مصر ۱۳۲۴ھ)
[3] البحر المحیط، ج ۸، ص ۴۶۸ (طبع مصر ۱۳۲۸ھ)
[4] تفسیر جامع البیان معروف بہ تفسیر ابن جریر، ج ۳۰، ص ۱۹۴ (طبع مصر)

شُفَعَآءُكُمْ: تمہارے سفارشی، شُفَعَآءُ مضاف، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، پ۹ ع۱۷

شُفَعَآؤُنَا: ہمارے سفارشی، شُفَعَآؤُ مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، پ۱۱ ع۶

شَفَقَ: شفق، واضح رہے کہ شفق کے معنی میں اختلاف ہے، بعض شام کے وقت افق کی سرخی کو شفق کہتے ہیں اور بعض اس کی سپیدی کو، راغب نے جو شفق کے معنی بیان کئے ہیں وہ ان کی امامتِ فن کے شایانِ شان ہے، فرماتے ہیں "سورج کے ڈوب جانے پر دن کی روشنی اور راستہ کی سیاہی کی باہمی آمیزش "شفق" ہے" یہ معنی کنارہ آسمان کی سرخی اور سپیدی دونوں پر مشتمل ہیں، علامہ ابوسعادات ابن الاثیر جزری لکھتے ہیں :-

"شفق اضداد میں سے ہے، اس سرخی کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے کہ جو مغرب میں آفتاب غروب ہونے پر نظر آتی ہے اور امام شافعی نے اسی کو لیا ہے اور اس سپیدی کے لئے بھی آتی ہے جو سرخی کے بعد مغربی افق پر باقی رہتی ہے اور امام ابوحنیفہ نے اسی کو اختیار کیا ہے" ؎۱

شوکانی نے تفسیر فتح القدیر میں ابوحنیفہ کے قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ :-

ولا وجہ لھٰذا القول اس قول کی کوئی وجہ نہیں ولا متمسک لہ لامن اور نہ اس کے لئے زبان لغۃ العرب ولا من عرب سے کوئی سند ہے الشرع (ج۵ ص۳۹۶) اور نہ شرع سے۔

لیکن یہ شوکانی کی خیرہ چشمی ہے، امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں :-

"شفق کے بارے میں ائمہ مختلف ہیں، ابوحنیفہ سپیدی کو شفق بتاتے ہیں اور ابویوسف، محمد، ابن ابی لیلیٰ، مالک، ثوری، حسن بن صالح اور شافعی کہتے ہیں کہ شفق سرخی ہے۔

اور سلف نے بھی شفق کے متعلق اختلاف کیا ہے کہ بعض نے سپیدی کو بتلایا ہے اور بعض نے سرخی کو جو لوگ سرخی بتاتے ہیں ان میں حضرت ابن عباس، ابنِ عمر، عبادہ بن الصامت اور شداد بن اوس (رضی اللہ عنہم) ہیں، اور جن سے یہ مروی ہے کہ شفق سپیدی ہے ان میں حضرت عمر بن الخطاب، معاذ بن جبل

؎۱ النہایہ فی غریب الحدیث والاثر، باب الشین مع الفاء

اور عمر بن عبد العزیز ہیں[1] (رضی اللہ عنہم)
آگے چل کر لکھتے ہیں:۔
"جب لوگوں نے شفق میں اختلاف کیا اور بعض
کہنے والوں نے سرخی کہا اور دوسروں نے
سپیدی، تو ہمیں معلوم ہوا کہ یہ نام دونوں معنی
کو شامل ہے اور لغت ہیں دونوں کے لئے آتا
ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ لوگ شفق کی تفسیر ان دونوں
معنی سے نہ کرتے کیونکہ وہ لوگ اسمار لغویہ اور شرعیہ
کے معانی کے عالم تھے دیکھتے نہیں جب علمار نے
قُرر کے معنی میں اختلاف کیا اور بعض نے حیض
کے معنے بتائے اور بعض نے طہر کے تو اس سے
یہ ثابت ہوا کہ یہ لفظ دونوں معنی کے لئے آتا ہے
ہاں اس کے بعد یہ ضرورت پڑتی ہے کہ آیت
میں ان میں سے جو مراد ہے اس کی دلیل معلوم
کریں اور ہم سے ابوعمر و غلام ثعلب نے بیان
کیا کہ ثعلب سے شفق کے بارے میں سوال کیا
گیا کہ کیا ہے انہوں نے کہا سپیدی، سائل نے
کہا کہ شواہد سرخی کے زیادہ ہیں، ثعلب نے جواب
دیا کہ جو غیر حاضر ہو اس کے لئے شاہد کی ضرورت
پیش آتی ہے، بیاض (سپیدی) تو لغت میں
اس سے زیادہ مشہور ہے کہ اس کے لئے
کسی شاہد کی ضرورت ہو۔
ابوبکر کہتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ شفق کی
اصل رقت ہے اور اسی سے ثوب شفق
(رقیق کپڑا) بولا جاتا ہے، نیز اسی سے شفقة
ہے جس کے معنی رقتِ قلب کے ہیں اور جب
اس کی اصل یہ ٹھہری تو سپیدی کو شفق سے
زیادہ خصوصیت ہونی چاہئے کیونکہ شفق سے
مراد آفتاب کی روشنی کے باقیماندہ اجزاء رقیقہ
ہیں اور یہ اجزاء سرخی کی بہ نسبت سپیدی ہیں
زیادہ رقیق ہوتے ہیں"۔[2]
اخیر بحث میں ایک اور دلیل پیش کی ہے فرماتے ہیں:
"ایک اور چیز جس سے اس پر استدلال ہوتا
ہے کہ شفق سے مراد بیاض ہے یہ ہے کہ ہم آفتاب
کے طلوع ہونے سے پہلے سرخی اور اس سے قبل
سپیدی کو پاتے ہیں اور سب ایک ہی نماز کا
وقت ہے کیونکہ دونوں کی دونوں بغیر قرص
آفتاب کے ظاہر ہوئے اسی کی روشنی سے
ہوتی ہیں اسی طرح یہ ضروری ہے کہ غروب
آفتاب کے بعد بھی سرخی و سپیدی ایک ہی

---
[1] احکام القرآن، ج ۲، ص ۳۳۴ (طبع مصر ۱۳۴۷ھ)
[2] ایضاً، ج ۲، ص ۳۳۶

نماز کا وقت ہوں، اسی علت کی بنا پر جسے ہم نے بیان کیا ہے تو۔[1] ۳۰/۹

شَفِيْعٌ: شفاعت کنندہ، سفارشی، سفارش کرنے والا، شَفَاعَةٌ سے بروزن فَعِيْلٌ بمعنی فَاعِلٌ ہے پ ۷/۱۲،۱۴، پ ۱۱/۶، پ ۲۱/۱۴، پ ۲۴/۷

فصل القاف

شِقٌّ: مشقت، جانکاہی، راغب لکھتے ہیں کہ شِقٌّ وہ مشقت اور تکان ہے جو انسان کے نفس اور بدن کو لاحق ہوتی ہے، بعض نے اس کو شَقَّ يَشُقُّ کا مصدر بتایا ہے بمعنی دشواری میں پڑنے اور دشواری میں ڈالنے کے؛ اور بعض نے اسم قرار دیا ہے، پ ۱۴/۶

شَقًّا: چیرنا، پھاڑنا، شَقَّ يَشُقُّ کا مصدر ہے، پ ۳۰/۵

شِقَاقٌ: ضد، مخالفت، مقابلہ، اپنے دوست کی شق کو چھوڑ کر دوسری شق میں ہونا، باب مفاعلت کا مصدر ہے، علامہ ابوحیان اندلسی البحر المحیط میں لکھتے ہیں:-

"شِقَاقٌ مصدر ہے شَاقَّةٌ کا جس طرح کا ضَارَبَ ضِرَابًا اور خَالَفَ خِلَافًا ہوتے ہیں اور اس کے معنی عداوت رکھنے اور مخالفت کرنے کے ہیں، اس کی اصل شَقٌّ سے ہے یعنی یہ ایک شق میں ہوا اور وہ ایک شق میں، شَقٌّ طرف کو کہتے ہیں، چنانچہ شاعر کہتا ہے ؎

اذا ما بکی من خلفها انحرفت لہ
بشق وشق عندنا لم یحول

(جب بچہ اس کی پشت پر سے روتا ہے تو وہ ایک جانب سے اس کی طرف مڑ جاتی ہے اور اس کی ایک طرف ہماری جانب رہتی ہے جو نہیں بدلتی)

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مَشَقَّةٌ سے ماخوذ ہے کیونکہ دونوں میں سے ہر ایک اس چیز کا خواہشمند ہوتا ہے کہ جو دوسرے کو شاق ہو۔"[2]

پ ۱/۱۶، پ ۷/۵، پ ۵/۳، پ ۱۷/۱۴، پ ۲۳/۱، پ ۲۵/۱

شِقَاقِيْ: میری مخالفت، میری عداوت، شِقَاق مضاف، ی ضمیر واحد متکلم، مضاف الیہ، پ ۱۲/۸

شَقَقْنَا: ہم نے چیرا، ہم نے پھاڑا، شَقٌّ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، پ ۳۰/۵

شَقُوْا: وہ بدبخت ہوئے، شَقَاوَةٌ سے ماضی کا

[1] احکام القرآن، ج ۲، ص ۳۳۹
[2] البحر المحیط، ج ۱، ص ۳۹۸

صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَشْقٰی)، ۱۲/۹

شِقْوَتُنَا: ہماری کمبختی، شِقْوَةُ مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، شِقْوَةٌ، شَقِیَ یَشْقٰی کا مصدر ہے جس کے معنی بدبخت ہونے کے ہیں، ۱۸/۶

شُقَّةٌ: مسافت، راغب نے شُقَّۃ کے معنی اس سمت کے لکھے ہیں جہاں پہنچنے تک مشقت لاحق ہو جائے، یہاں غزوۂ تبوک کی مسافت مراد ہے، ۱۰/۱۲

شَقِیٌّ: بدبخت، محروم، شَقَاوَۃٌ سے بروزن فَعِیْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے، اَشْقِیَاءُ جمع، ۱۲/۹

شَقِیًّا ۱۶/۳، ۶/۵

فصل الکاف

شَكٌّ: شک، شَكَّ یَشُكُّ کا مصدر ہے جس کے معنے شک کرنے کے ہیں، نیز بطورِ اسم بھی مستعمل ہوتا ہے اور شُكُوْكٌ جمع آتی ہے، راغب اصفہانی لکھتے ہیں:۔

"انسان کے نزدیک دو نقیضوں کے برابر اور مساوی ہونے کا نام شک ہے، یہ یا تو اس بنا پر ہوتا ہے کہ دونوں نقیضوں کی علامتیں متساوی طور پر پائی جاتی ہیں اور یا اس بنا پر کہ دونوں میں علامت نہیں ہوتی۔

شک کبھی تو اس شے ہی میں ہوتا ہے کہ موجود بھی ہے یا نہیں اور کبھی اس کی جنس میں کہ کس جنس سے ہے اور کبھی اس کی کسی صفت میں اور کبھی اس کی غرض کے بارے میں کہ جس کے لئے وہ شے وجود میں لائی گئی۔

شک جہل ہی کی ایک قسم ہے لیکن جہل سے اخص ہے کیونکہ جہل میں کبھی سرے سے نقیضین کا علم ہوتا ہی نہیں، پس ہر شک جہل ہے لیکن ہر جہل شک نہیں، ارشاد ہے فِیْ شَكٍّ مُرِیْبٍ (ایسے تردد میں جو چین نہ لینے دے) بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ یَّلْعَبُوْنَ (کوئی نہیں وہ دھوکے میں ہیں کھیلتے) فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ (سو اگر تو ہے شک میں)۔

شَكٌّ کا اشتقاق یا تو شَكَكْتُ الشَّیْءَ سے ہے جس کے معنی ہیں میں نے اس کو چاک کر ڈالا[1] شاعر کہتا ہے ؎

وشککت بالرمح الاصم ثیابہ
لیس الکریم علی القنا بمحرم

(اور میں نے ٹھوس نیزے سے اس کے کپڑے

[1] ملاحظہ ہو راغب۔

درزہ وغیرہ جنگ کا لباس کا مراد ہے) چاک کر ڈالے
نیزے پر باعزت آدمی حرام نہیں ہے)۔

گویا شک "کسی شے کا چاک ہونا اور
اس طرح ہو جاتا ہے کہ راستہ اس میں جمنے کے
لئے اپنا کوئی ٹھکانہ نہ پا سکے اور یہ بھی صحیح ہو سکتا
ہے کہ اس شک سے مستعار ہو جس کے معنی
بازو کے پہلو سے چپکنے کے ہیں، یہ اس طرح کہ
(شک میں) دونوں نقیضیں باہم اس طرح مل جاتی
ہیں کہ سمجھ اور رائے کو ان کے درمیان گھسنے کا
موقع نہیں ملتا، اہلِ عرب جو التبس الامر
(معاملہ مشتبہ ہو گیا) اختلط الامر (معاملہ گڈمڈ
ہو گیا) اشکل الامر (معاملہ مشکل ہو گیا) وغیرہ
استعارات استعمال کرتے ہیں وہ بھی اسی معنی
کے شاہد ہیں"۔

پ۶/۲، پ۱۱/۱۵،۱۶، پ۱۳/۶،۱۰، پ۱۳/۱۴، پ۲۰/۱، پ۲۴/۸،۱۲، پ۲۳/۱۰، پ۲۴/۹،۲۰
پ۲۵/۲،۱۴

شَكَرَ : اس نے شکر کیا، اس نے قدر جانی،
اس نے حق مانا، شکرٌ سے ماضی کا صیغہ واحد
مذکر غائب، پ۱۹/۸ پ۲۷/۹

شُكْرًا : شکر کرنا، احسان ماننا، قدر پہچاننا
شکر یشکر کا مصدر ہے امام راغب لکھتے ہیں:-

"شکر نعمت کے تصور اور اس کے اظہار کو کہتے
ہیں، بعض نے کہا ہے کہ یہ کَشْرٌ سے مقلوب ہے
جس کے معنی کھولنے کے ہیں اور کُفْرٌ اس
کی ضد ہے جس کے معنی نعمت کے بھلانے
اور اس کے چھپانے کے ہیں، دابۃ شکور وہ
جانور ہے جو اپنی فربہی سے اپنے مالک کی
رکھوالی کا پتہ دے رہا ہو۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل عین
شکری ہے یعنی وہ چشمہ جو کہ پُر ہو اس اعتبار
سے اپنے منعم کے ذکر سے (اوقات کے) پُر
ہو جانے کا نام شکر ہے"۔

علامہ لغوی مجدالدین فیروزآبادی بصائر ذوی التمیز
فی لطائف کتاب اللہ العزیز میں رقمطراز
ہیں کہ :-

"شکر پانچ قاعدوں پر مبنی ہے اول شاکر کی
مشکور کے لئے فروتنی دوسرے اس سے محبت
کرنا، تیسرے اس کی نعمت کا معترف ہونا،
چوتھے اس نعمت کی بنا پر اس کی ثنا کرنا،
پانچویں اس نعمت کو ایسی جگہ استعمال میں نہ
لانا جہاں وہ ناپسند کرے۔ یہ پانچ باتیں شکر
کی اساس ہیں اور ان ہی پر اس کی بنیاد ہے

اگر ان میں سے ایک بھی معدوم ہوئی تو شکر کے قواعد میں سے ایک قاعدہ مختل ہو گیا۔ شکر کے بارے میں جس نے بھی کلام کیا ہے اس کا کلام ان ہی امور کی طرف راجع اور ان ہی میں دائر ہے۔[۱]

آیہ کریمہ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا (کام کرو اے داؤد کے گھر والو احسان مان کر) کے متعلق امام راغب نے لکھا ہے کہ "بعض نے کہا ہے کہ شُکْرًا بربنائے تمییز منصوب ہے یعنی جو کچھ بھی تم عمل کرتے ہو اس کو اللہ تعالیٰ کے شکر کے لئے کرو اور بعض نے کہا ہے کہ شُکْرًا، اِعْمَلُوْا کا مفعول ہے اور اِعْمَلُوْا فرمایا گیا اُشْکُرُوْا نہیں فرمایا گیا، یہ اس لئے کہ شکر کے انواع سہ گانہ (شکر قلبی، شکر لسانی اور شکر جمیع اعضا جوارح) کے التزام پر متنبہ کر دیا جائے۔ (ملاحظہ ہو اُشْکُرْ اور حَمْد) ۲۲/۸

شَکَرْتُمْ: تم نے شکر کیا، تم نے حق مانا، تم نے احسان مانا۔ شُکْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر۔ ۵/۱۸، ۱۳/۱۴

شَکْلِہٖ: اس کی شکل، شَکْلِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، شَکْل کے معنی مثل اور مانند کے ہیں، اَشْکَال جمع، واضح رہے کہ شکل کا استعمال ہیئت و صورت کے بارے میں ہوتا ہے اور ضِدٌّ کا جنسیت میں اور شِبْہٌ کا کیفیت میں۔ ۲۳/۱۳

شَکُوْرٌ: بڑا شکر گزار، بڑا احسان ماننے والا، بڑا قدر دان، شُکْرٌ سے بروزن فَعُوْلٌ صفت کا صیغہ ہے، مبالغہ کے اوزان میں سے ہے، مذکر و مؤنث دونوں کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے، شُکُرٌ جمع ہے، شکور وہ بندہ ہے کہ جو اطاعتِ الٰہی اور اس عبادت کی بجا آوری کے ذریعہ کہ جو اس پر مقرر کی گئی ہے، حق تعالیٰ کی شکر گزاری میں خوب کوشاں ہو، یہ بھی واضح رہے کہ شَکُوْرٌ اسماءِ حسنیٰ میں سے ہے جب اللہ سبحانہ کی صفات میں اس کا استعمال ہوگا تو اس کے معنی بڑے قدر دان یعنی تھوڑے سے کام پر بہت ثواب دینے والے کے ہوں گے۔ ۱۳/۱۲، ۲۱/۱۲، ۲۲/۱۶،۸، ۲۵/۵،۴، ۲۵/۱۶

شَکُوْرًا ۱۵/۱

شُکُوْرًا: شکر گزاری، شکر کرنا۔ شَکَرَ یَشْکُرُ کا مصدر ہے۔ ۱۹/۴، ۲۹/۱۹

---

[۱] تاج العروس، فصل الشین باب الراء

فصل المیم

شِمَال: جانبِ شمال، بائیں طرف، یمِین کا مقابل ہے، اسم ہے اَشْمُلٌ اور شُمُلٌ جمع، ۱۵/۱۴،۱۵ ۲۲/۸ ۲۶/۱۶ ۲۷/۱۵ ۲۹/۹

شِمَالِهٖ: اس کی بائیں طرف، شِمَالِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، ۲۹/۵

شَمَآئِلِ: بائیں طرف، بائیں جانب شِمَالٌ کی جمع خلافِ قیاس. ۱۴/۱۳

شَمَآئِلِهِمْ: ان کے بائیں سے، شَمَآئِلِ مضاف هِمْ ضمیر مذکر غائب مضاف الیہ ۸/۹

شَمْس: سورج کو بھی کہتے ہیں اور دھوپ کو بھی، شُمُوْسٌ جمع، ۳/۳ ۷/۱۵،۱۸ ۸/۱۴ ۱۱/۶ ۱۲/۱۱ ۱۳/۷،۱۷ ۱۴/۸ ۱۵/۹،۱۴ ۱۶/۲،۱۷ ۱۷/۳،۹ ۱۹/۳،۱۷ ۲۱/۲،۱۲ ۲۲/۱۴ ۲۳/۲،۱۵ ۲۴/۱۹ ۲۶/۱۷ ۲۷/۱۱ ۲۹/۹،۱۷ ۳۰/۲،۱۶

شَمْسًا ۲۹/۱۹

فصل النون

شَنَاٰنُ: دشمنی کرنا، بغض رکھنا. یہ مصدر سماعی ہے خلافِ قیاس، اس کا فعل فَتَحَ اور سَمِعَ دونوں سے آتا ہے. ۶/۵،۲

فصل الواو

شُوَاظٌ: شعلے، آنچ جس میں دھواں نہ ہو، اسم ہے، ۲۷/۱۲

شَوْبًا: ملونی، ملاوٹ. آمیزش. شَابَ یَشُوْبُ کا مصدر ہے، ۲۳/۶

شُوْرٰی: مشورہ کرنا. قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ:-

"شوریٰ، شاورتہ (بابِ مفاعلت) کا مصدر ہے جیسے کہ بُشْرٰی ذُکْرٰی ہے۔"[1] ۲۵/۵

شَوْكَةِ: کانٹا، شوکت، شوکت کے معنی اصل میں تو کانٹے کے ہیں اور مجازاً ہتھیار اور سختی کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، ۹/۱۵

شَوٰی: کلیجہ، منہ کی کھال، سر کی کھوپڑی لغت میں اس کا استعمال تینوں معانی میں ہوتا ہے راغب لکھتے ہیں کہ شَوٰی کے معنی اطراف (بدن) کے ہیں جیسے کہ ہاتھ اور پیر، یہ شَوَاۃٌ کی جمع ہے جیسے کہ نوی نَوَاۃٌ کی ہے علامہ ابوحیان اندلسی نے اس کے حسبِ ذیل معانی نقل کئے ہیں: سر کی کھال، الیسان

---

[1] فتح القدیر، ج ۴، ص ۵۲۶ (طبع مصر ۱۳۵۰ھ)

کی کھال، حیوان کے ہاتھ پاؤں، ہر عضو کہ جہاں سے قتل نہ کیا جاتا ہو[1]، اور سر کی کھوپڑی وغیرہ کے معنی کتب لغت میں مذکور ہیں، ۲۹/۲

فصل الهاء

شِهَابٌ: انگارا، فضا میں جو تارا ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے، ابن السکیت اور ابو الہیثم سے انگارے ہی کے معنی منقول ہیں اور راغب نے شہاب کے معنی اس چمکدار شعلے کے بتائے ہیں جو بھڑکتی ہوئی آگ میں یا فضا میں ابر کے اندر ہوتا ہے، شُهُبٌ، شُهْبَانٌ، شِهْبَانٌ، اَشْهُبٌ جمع، ۲/۷ ۱۹/۱۶ ۲۶/۵

شِهَابًا ۲۹/۱۱

شَهٰدٰتٍ: گواہیاں، شَهَادَةٌ کی جمع ہے، (ملاحظہ ہو شَهَادَةٌ) ۲/۴

شَهٰدٰتِهِمْ: ان کی گواہیاں شَهَادَاتِ مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۲۹/۷

شَهَادَتُنَا: ہماری گواہی، شَهَادَةٌ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، ۵/۴

شَهَادَتُهُمْ: ان کی گواہی، شَهَادَةٌ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ۔ ۲۵/۸

شَهَادَتِهِمَا: ان دونوں کی گواہی، شَهَادَةٌ مضاف هِمَا ضمیر تثنیہ مذکر غائب، مضاف الیہ، ۵/۴

شَهَادَةٌ: گواہی، قطعی خبر، ظاہر، کھلا، اصل میں تو یہ شَهِدَ یَشْهَدُ کا مصدر ہے لیکن اسم ہو کر بھی استعمال ہوتا ہے، شَهَادَاتٌ جمع، امام راغب لکھتے ہیں:

"شُهُوْدٌ اور شَهَادَةٌ کے معنی اس کے حضور (موجود رہنا، سامنے ہونا) کے ہیں جو مشاہدہ کے ساتھ ہو، خواہ مشاہدہ بصر کے ساتھ ہو یا بصیرت کے ذریعہ اور کبھی صرف حضور کو بھی کہتے ہیں جیسے عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (دانائے غیب وظہور ہے) لیکن شُهُوْدٌ کا استعمال حضور مجرد کے ساتھ اولیٰ ہے اور شَهَادَةٌ کا اس حضور کے لئے کہ جو مشاہدہ کے ساتھ ہو، نیز شہادۃ وہ بیان ہے جو اس علم کی بنا پر سرزد ہو کہ جو مشاہدہ بصیرت یا مشاہدہ بصر کے ذریعہ حاصل ہوا ہو۔"

۱/۱۶ ۳/۴ ۸/۴، ۸/۱۵ ۵/۷ ۵/۵ ۶/۷ ۱۳/۸ ۲/۱۱ ۲۱/۱۴ ۲۴/۲ ۲۸/۶، ۱۱، ۱۶، ۱۷

[1] دیکھو البحر المحیط ج ۸ ص ۳۳۰

شُھُبًا: انگارے، شِھَابٌ کی جمع جس طرح کہ کُتُبٌ کِتَابٌ کی جمع ہے، ۲۹/۱۱

شَھِدَ: اس نے پایا، اس نے گواہی دی، پہلے معنی کے اعتبار سے شُھُوْدٌ سے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے شَھَادَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب راغب لکھتے ہیں :-

"شَھِدَ کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے، ایک تو عِلْم کی جگہ آتا ہے اور اسی لفظ سے شہادت قائم ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے اشہد بکذا (میں گواہی دیتا ہوں) اور گواہ کا اَعْلَمُ کہنا قبول نہیں بلکہ اشہد کہنے کی ضرورت ہے، اور دوسرے قسم کے مقام پر چنانچہ اشھد باللہ ان زیدا منطلق (میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ زید چل رہا ہے) کہے گا تو قسم ہو جائیگی، اور بعض نے کہا ہے کہ اگر اَشْھَدُ ہی کہا بِاللّٰہِ نہ کہا تب بھی قسم ہو جائے گی"۔

۲/۷ ۳/۱۰ ۱۲/۱۳ ۲۴/۱۷ ۲۵/۱۳ ۲۶/۱

شُھَدَآءُ: موجودین، حاضرین، شاہد، نگران، گواہ بتانے والے، شہادت پانے والے، شَھِیْدٌ علامہ ابو حیان اندلسی لکھتے ہیں :-

"شُھَدَآءُ، شَھِیْدٌ کی جمع ہے جو مبالغہ کے لیے ہے جیسے کہ علیم اور علماء، یہ بھی بعید نہیں کہ شاہد کی جمع ہو جیسے کہ شاعر اور شعراء، پر فُعَلَاءُ فَاعِل کا باب نہیں ہے[1]"

اور آگے چل کر لکھا ہے کہ :-

"اس کا شہید کی جمع ہونا شاھد کی جمع ہونے سے زیادہ بہتر ہے کہ فعیل کی جمع کے قاعدہ پر جاری ہے[2]"

۱/۱۶ ۲/۱ ۳/۷ ۴/۱،۵ ۵/۱۷،۶ ۶/۱۱،۶ ۸/۴ ۱۲/۱۲ ۱۸/۸،۷ ۲۲/۴ ۲۴/۱۸

شُھَدَآءَکُمْ: تمہارے مددگار، تمہارے گواہ، شُھَدَآءَ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، آیۂ کریمہ وَادْعُوْا شُھَدَآءَکُمْ کی تفسیر بر اس شے سے کی گئی ہے کہ شہادت کے معنی جس کے مقتضی ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مددگار کے معنی لئے ہیں، مجاہد نے کہا ہے کہ جو لوگ تمہاری گواہی دیں، بعض کا قول ہے کہ جن کے موجود ہونے کا اعتبار ہو، ۲/۳ ۵/۴

شَھِدْتُمْ: تم نے بلایا، تم نے گواہی دی، شَھَادَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۲۳/۱۷

[1] البحر المحیط، ج ۱ ص ۱۰۲

[2] ایضاً، ص ۱۰۶

شَہِدْنَا: ہم نے اقرار کرلیا، ہم نے بیان کیا، ہم موجود تھے، ہم نے دیکھا، شُہُوْدٌ اور شَہَادَۃ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، راغب نے لکھا ہے کبھی شہادت سے اقرار کرنا بھی مراد ہوتا ہے، پ ۳، پ ۹/۱۲، پ ۱۳/۴، پ ۱۹/۱۹

شَہِدُوْا: انہوں نے گواہی دی، انہوں نے اقرار کیا، وہ موجود تھے، انہوں نے دیکھا، شُہُوْدٌ اور شَہَادَۃ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب،

پ ۳/۱۲، پ ۱۴/۱۴، ۱۳ر۵ر۱۱/۸، پ ۲۵/۸

شَہْرٌ: مہینہ، اَشْہُرٌ اور شُہُوْرٌ جمع، مہینہ کی دو قسمیں ہیں، قمری، جس کا شمار چاند کے دیکھنے سے ہوتا ہے اور شمسی، جس کا شمار آفتاب کے ایک برج سے دوسرے برج میں داخل ہونے سے ہوتا ہے۔ احکامِ شرعی میں قمری ماہ کا اعتبار ہے، مہینہ کا نام شہر اس لئے ہوا کہ لوگوں میں اس کے شروع ہونے اور گزر جانے کی شہرت ہوتی ہے، پ ۲ ۱۱ر۸ر۷، پ ۵/۶

پ ۲، پ ۲۲/۸، پ ۳۰/۲۲، شَہْرًا پ ۱۱، پ ۲۶/۲

شَہْرَیْنِ: دو مہینے، شَہْرٌ کا تثنیہ بحالت نصب وجر، پ ۵، پ ۲۸

شَہَوَاتِ: مرغوب چیزیں، مزے، شَہْوَۃ کی جمع، پ ۳، پ ۵، پ ۱۱

شُہُوْدٌ: اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے، حاضرین، موجودین، شاہد، شَاہِدٌ کی جمع ہے جیسے کہ سُجُوْدٌ سَاجِدٌ کی، پ ۳

شُہُوْدًا پ ۱۱/۱۲، پ ۲۹/۱۵

شُہُوْرِ: مہینے، شَہْرٌ کی جمع ہے، پ ۱۱

شَہْوَۃً: شہوت، للچانا، خواہش کرنا، آرزو کرنا، مصدر ہے، اس کا فعل باب نَصَرَ اور سَمِعَ دونوں سے آتا ہے، مصباح میں ہے کہ شَہْوَۃ کسی شے کی طرف نفس کے اشتیاق کا نام ہے، اس کی جمع شَہَوَاتٌ آتی ہے، امام راغب لکھتے ہیں:۔

" شَہْوَۃ، اصل میں جس چیز کی تمہیں خواہش ہو اس کی طرف جی کے للچانے کو کہتے ہیں، دنیا میں اس کی دو قسمیں ہیں، ایک سچی، دوسرے جھوٹی، شہوتِ صادقہ تو وہ ہے جس کے بغیر بدن مختل ہو جائے جیسے بھوک کے وقت کھانے کی اشتہا ہوتی ہے اور شہوتِ کاذبہ وہ ہے جس کے بغیر بدن میں اختلال نہ ہو اور کبھی مُشْتَہٰی (جس چیز کی چاہت ہو) اس کو بھی شہوت سے موسوم کرتے ہیں نیز اس قوت کو بھی جو کسی شے کی اشتہا کرتی ہے شہوت کہا جاتا ہے، آیۂ شریفہ زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّہَوَاتِ (سجاوٹ رکھ دی گئی ہے

لوگوں کے لئے مزوں کی چاہت ہیں) دونوں شہوتوں کی محتمل ہے اور ارشاد اِتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (پیچھے ہو لئے مزوں کے) یہ جھوٹی شہوتیں اور ایسی مشتہیات ہیں کہ جن سے استغنار ہونا چاہئے۔

شَهِيْدٌ: گواہ، شاہد، نگران احوال کہنے والا، اقرار کرنے والا، امام راغب نے لکھا ہے کہ شہید شاہد کو بھی کہا جاتا ہے اور کسی چیز کے مشاہدہ کرنے والے کو بھی، علامہ ابوالسعادات مبارک ابن الاثیر جزری؛ النہایہ فی غریب الحدیث والآیہ میں رقمطراز ہیں:۔

"حق تعالیٰ کے اسمار میں شہید وہ ذات ہے جس کے علم سے کوئی چیز غائب نہ ہو اور شاہد کے معنی حاضر کے ہیں، فعیل فاعل کے معنی میں مبالغہ کے اوزان سے ہے، جب مطلق علم کا اعتبار ہو تو اللہ علیم ہے اور امور باطنہ کا خیال کیا جائے تو خبیر ہے اور امور ظاہرہ کیطرف نسبت ہو تو شہید ہے اور کبھی اس معنی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ ہوتا ہے کہ وہ قیامت میں خلق پر گواہ ہوگا۔" [۲]

اور شرع میں شہید وہ شخص ہے جو اللہ کی راہ میں قتل کیا گیا ہو، شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی موضح القرآن سورہ النسار میں زیر آیۃ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ الآیۃ فرماتے ہیں:۔

"نبی وہ لوگ جن کو اللہ کی طرف سے وحی آوے یعنی فرشتہ ظاہر میں پیغام کہہ جاوے اور صدیق وہ کہ جو وحی میں آوے ان کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے اور شہید وہ جن کو پیغمبر کے حکم پر ایسا صدق آیا کہ اس پر جان دیتے ہیں اور نیک بخت (صالح) وہ جن کی طبیعت نیکی ہی پر پیدا ہوئی ہے۔"

اس معنی میں شہید کا اشتقاق آیا شَهَادَةٌ سے ہے یا مُشَاهَدَةٌ سے یا شُهُوْدٌ سے نیز فَعِيْلٌ بمعنی فَاعِلٌ ہے یا مَفْعُوْلٌ ہے؛ اس پر علامہ ابوالقاسم عبدالرحمٰن سہیلی نے الروض الانف میں نفیس بحث لکھی ہے جس کا اقتباس ہدیۂ ناظرین ہے؛ فرماتے ہیں:۔

"یہ اسم شَهَادَةٌ سے ماخوذ ہے یا مُشَاهَدَةٌ سے اگر شَهَادَةٌ سے ہے تو شَهِيْدٌ بمعنی مَشْهُوْدٌ ہے یعنی اس کے حق میں جنت کی

---

[۱] ابن سیدہ کہتے ہیں یعنی وہ جاننے والا کہ جو جانے بیان کردے۔ (تاج العروس)

[۲] النہایہ باب الشین مع الیاء

شہادت دی گئی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شَھَادَۃٌ ہی سے ماخوذ ہو اور فَعِیْلٌ بمعنے فَاعِلٌ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ یعنی تم لوگوں پر گواہی دو گے اور یہ چیز گو ساری امتِ محمد یہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے بارے میں عام ہے پر شہداء کے لئے یہ نام اولیٰ ہے کیونکہ وہ صدیقین و انبیاء کے پیچھے ہی ہیں، اللہ سبحانہ فرماتا ہے فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ سو شہید کے معنی میں یہ دو وجہیں تو جب ہیں کہ اس کو شَھَادَۃ سے مشتق قرار دو۔"

اور اگر مُشَاھَدَۃٌ سے ماخوذ ہو تب بھی فَعِیْلٌ بمعنی فَاعِلٌ ہے کہ شہید ملکوتِ الٰہی کا مشاہدہ کرتا اور اللہ کے ان فرشتوں کا معائنہ کرتا ہے جنہیں اور کوئی نہیں دیکھتا اور مُشَاھَدَۃٌ سے بمعنی مَفْعُوْلٌ بھی ہو سکتا ہے یعنی بایں معنی کہ فرشتے اس کے فیض اور اس کی روح کے عروج کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

ان سب وجہوں میں صحت کے اعتبار سے اولیٰ یہی ہے کہ فَعِیْلٌ بمعنی مَفْعُوْلٌ ہو اور معنی یہ ہوں گے کہ اس کے لئے جنت کی شہادت دی گئی ہے یا نبی علیہ السلام کی اس کے لئے شہادت ہوگی چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ ھٰٓؤُلَآءِ الذین اشھد علیھم (یہ وہ لوگ ہیں جن پر میں گواہی دوں گا) پس یہ وجہ بحیثیت حدیث کے بھی قوی ہے اور بلحاظ عربیت ایک اور وجہ سے بھی، وہ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شہداء کا ذکر کیا تو فرمایا والمرأۃ تموت بجمع شھید (اور عورت کی زچگی سے مرے شہید ہے) اور شَھِیْدَۃٌ نہیں فرمایا، اور دوسری روایت میں ہے کہ والنفساء شھید یجرھا جنینھا بسررہ الی الجنۃ (نفاس والی عورت شہید ہے اسے اس کا بچہ اپنے نال سے جنت کی طرف کھینچے گا) پر شَھِیْدَۃٌ نہیں فرمایا اور فَعِیْلٌ جب مؤنث کی صفت ہو تو تاء اسی وقت میں نہ ہوگی جب کہ وہ بمعنے مَفْعُوْلٌ ہو جیسے اِمْرَأۃٌ قتیل اور جریح ہیں اور اگر بمعنے فَاعِلٌ ہو تو مؤنث تاء کے ساتھ آئے گی جیسے امرأۃ علیمۃ اور رحیمۃ وغیرہ ہیں اس سے پتہ چلا کہ شہید بمعنی مشہود (جس کے لئے گواہی دی گئی ہو) اور مشہود علیہ (جس پر گواہی دی گئی ہو) ہے اور یہ لغت سے تو

استقرار صحیح اور حدیث سے استنباط بدیع ہے سو علم میں ہے۔" [۱]

شُهَدَآءَ: جمع، ۳/۷، ۴/۱، ۵/۳، ۶/۶،۸، ۱۱/۱۰، ۱۴/۹، ۲۳/۱۲، ۲۵/۱، ۲۶/۱۶،۱۷، ۲۹/۱، ۳۰/۱۰،۲۵

شَهِيْدًا: ۲/۱، ۵/۲،۳،۷،۸، ۶/۲،۳، ۷/۶، ۱۱/۸، ۱۳/۱۲، ۱۴/۱۸، ۱۵/۱۱، ۱۷/۱۷، ۳۰/۱۰، ۲۱/۲، ۲۲/۴، ۲۶/۱،۱۲

شَهِيْدَيْنِ: دو گواہ، دو شاہد، شَهِيْد کا تثنیہ بحالت نصب و جر، ۳/۷

شَهِيْقٌ: دھاڑنا، چلانا، سائیں سائیں کرنا، گدھے کا آواز کرنا، مصدر ہے، اس کا فعل باب ضَرَبَ، سَمِعَ اور فَتَحَ تینوں سے استعمال ہوتا ہے۔ ۱۲/۹، شَهِيْقًا ۲۹/۱

فصل الیاء المثناۃ

شَیْءٌ: چیز، کچھ، علامہ ابو المسعود بن محمد العمادی اپنی مشہور تفسیر ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم میں رقمطراز ہیں:۔

"لفظِ شَیْءٌ اپنے مفہومِ لغوی کے اعتبار سے ہر اس چیز کے لئے آتا ہے کہ جس کو معلوم کیا جا سکے اور اس کے متعلق خبر دی جا سکے، خواہ کچھ ہی ہو، یہ اصل میں شَآءَ کا مصدر ہے جو ایک مفہوم کے لئے بولا جاتا ہے اور اس مفہوم میں صرف اس پر اکتفاء کی گئی ہے کہ اس سے مشیئۃ کے تعلق کا اعتبار ہو، خواہ علم کی حیثیت سے خواہ خبر دینے کی حیثیت سے"۔

علامہ حسن بن محمد نظام نیشاپوری تفسیر غرائب القرآن و رغائب الفرقان میں لکھتے ہیں:۔

"لفظِ شَیْءٌ اعم العام ہے جس طرح کہ اللہ اخص الخاص ہے، یہ جوہر و عرض، قدیم و حادث بلکہ محال و معدوم تک کے لئے آتا ہے۔" [۱]

۱/۲،۳،۱۳،۱۴، ۲/۲،۳،۶،۱۳، ۳/۲،۳،۴،۷،۱۰،۹،۱۱، ۴/۱،۴،۷،۸،۱۰،۱۲، ۵/۲،۵،۸،۱۴،۱۵، ۶/۶،۷،۱۰،۱۴، ۷/۳،۶،۸،۱۰،۱۱،۱۲،۱۴،۱۵،۱۸،۱۹، ۸/۱،۵،۶،۷، ۹/۱،۷،۹،۱۳، ۱۰/۱،۴،۶،۱۲، ۱۱/۳،۱۷، ۱۲/۲،۵،۷،۹،۱۵، ۱۳/۲،۶،۸،۱۵،۱۸، ۱۴/۲،۱۱،۱۲،۱۶،۱۷،۱۸، ۱۵/۲،۵،۱۶،۱۸،۲۰،۲۱، ۱۶/۱،۲،۱۱،۱۴، ۱۷/۳،۶،۸،۹، ۱۸/۵،۱۱،۱۲،۱۵،۱۶، ۱۹/۶،۷، ۲۰/۳،۹،۱۲،۱۳،۱۴،۱۶، ۲۱/۲،۷،۸،۱۴،۱۹، ۲۲/۲،۳،۴،۸،۱۱،۱۲،۱۳،۱۵،۱۷،۱۸،۱۹، ۲۳/۴،۱۰، ۲۴/۳،۶،۷،۱۲،۱۷،۱۹، ۲۵/۱،۲،۳،۵، ۲۶/۳،۴،۱۱

[۱] الردحن الانف، ج ۲، ص ۱۵۱ (طبع جمالیہ مصر ۱۳۳۲ھ)

۲۶/۱۴، ۱۵ ۲۷/۱، ۲، ۳، ۴، ۸، ۱۰، ۱۷، ۲۰ ۲۸/۱، ۲، ۳، ۴،
۷، ۸، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۰ ۲۹/۱، ۲، ۱۲ ۳۰/۱، ۵، ۱۰

شَیْئًا پ ۱/۵، ۶ ۲/۵، ۱۰، ۱۳ ۳/۷، ۱۰، ۱۵ ۴/۶، ۹، ۱۴
۵/۷، ۱۰ ۶/۴، ۱۱ ۷/۶ ۹/۱۴، ۱۶ ۱۰/۷، ۱۰، ۱۲ ۱۱/۹، ۱۰
۱۲/۵ ۱۳/۸، ۱۵، ۱۶، ۱۷ ۱۵/۸، ۱۷، ۲۲ ۱۶/۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹
۱۷/۴، ۸، ۱۱، ۱۷ ۱۸/۱، ۱۱، ۱۳، ۱۶ ۲۱/۱۳ ۲۲/۴ ۲۳/۱، ۳، ۴
۲۴/۲، ۱۳ ۲۵/۵، ۱۷، ۱۸ ۲۶/۱، ۸، ۱۰، ۱۴ ۲۷/۴، ۹ ۲۸/۲، ۳،
۲۸/۱۰، ۲۰ ۲۹/۱۹ ۳۰/۷

شَیَاطِیْنُ: شیاطین، شَیْطَانٌ کی جمع مکسر ہے، (ملاحظہ ہو شَیْطَانٌ) پ ۱/۱۲ ۷/۱۵ ۸/۱، ۱۰ ۱۵/۳ ۱۶/۸، ۹
۱۷/۶ ۱۸/۶ ۱۹/۱۵ ۲۳/۶، ۱۲ ۲۹/۱۱

شَیَاطِیْنِہِمْ: ان کے شیطان، شَیَاطِیْنِ مضاف ہِمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، پ ۱/۲

شَیْبًا: بڑھاپا، سر کے سپید ہونے کو شَیْب کہتے ہیں، شَابَ یَشِیْبُ کا مصدر ہے، پ ۱۶/۴

شِیْبًا: بوڑھے، اَشْیَبُ کی جمع جیسے بِیْضٌ اَبْیَضُ کی جمع ہے۔ پ ۲۹/۱۳

شَیْبَۃً: بڑھاپا، بالوں کا سپید ہونا، یہ بھی شَابَ یَشِیْبُ کا مصدر ہے، پ ۲۱/۵

شِئْتَ: تو نے چاہا، مَشِیْئَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو شَاءَ) پ ۹/۹ ۱۶/۱ ۱۸/۱۵

شِئْتُمْ: تم نے چاہا، مَشِیْئَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ ۲/۶ ۲/۱۲ ۹/۱۰ ۲۳/۱۶ ۲۴/۱۹

شِئْتُمَا: تم دونوں نے چاہا، مَشِیْئَۃٌ سے ماضی کا صیغہ تثنیہ مذکر حاضر، پ ۱/۴ ۸/۹

شَیْخٌ: بوڑھا، ابن سیدہ نے المخصص میں اور قزاز نے جامع میں لکھا ہے کہ پچاس سے لے کر اسی برس کے بوڑھے کو شیخ کہتے ہیں[1]، شُیُوْخٌ اور اَشْیَاخٌ جمع ہے آیہ شریفہ وَاَبُوْنَا شَیْخٌ کَبِیْرٌ (اور ہمارا باپ بوڑھا ہے بڑی عمر کا) میں شیخ کبیر سے کون مراد ہیں، اس کے متعلق حافظ عماد الدین بن کثیر لکھتے ہیں کہ:

"اس بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے کہ یہ شیخ کون ہیں؟ چنانچہ بیان کیا گیا ہے حضرت شعیب علیہ السلام ہیں، اکثر کے نزدیک یہی مشہور ہے اور حضرت حسن بصری اور امام مالک بن انس نے اسی کی تصریح کی ہے اور ایک حدیث میں بھی یہ مصرح آیا ہے لیکن اس کی اسناد میں نظر ہے"[2]

اس سلسلہ میں حضرت سعد بن سلمہ عنزی رضی اللہ عنہ کی روایت کا ذکر حضرت شعیب علیہ السلام کے تذکرہ

---

[1] تاج العروس، فصل الشین من باب الخاء

[2] البدایہ والنہایہ، ۱/۱، ص ۲۲۴ (طبع مصر ۱۳۴۸ھ)

گزرچکا ہے اور ابن ماجہ، بزار، ابن المنذر، ابن ابی حاتم طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرتِ عتبہ بن الندر سلمی سے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ایک طویل روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی نقل کیا ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ یا دس برس تک تو اپنے کو اجرت پر رکھا پھر جب مدت پوری کر چکے تو حضرتِ شعیب سے جدا ہونے کا ارادہ کیا تو اپنی اہلیہ کو حکم دیا کہ اپنے والد بزرگوار سے کچھ بکریاں مانگ لیں کہ جن سے گزران کریں [۱]۔ اس روایت میں بھی حضرتِ شعیب علیہ السلام کے نام کی تصریح کی ہے لیکن حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس حدیث کا دار و مدار عبداللہ بن لہیعہ مصری پر ہے اور اس کے حافظہ میں خرابی ہے، مجھے یہ ڈر ہے کہ اس کا مرفوع ہونا غلط ہے [۲]

شَيْخًا، ب۲ پ۱۲

شَيْطَان: شیطان، سرکش، شریر، امام محمد بن جریر طبری فرماتے ہیں:۔

"عربی زبان میں ہر سرکش شیطان ہے جن میں سے ہو انسانوں میں سے ہو جو چوپایوں میں سے ہو غرض ہر شے سے ہو اور اسی طرح ارشاد ہے پروردگار جل شانہ کا وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (اور اسی طرح کر دیا ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن شریر آدمیوں کو اور جنوں کو) تم کو انسانوں میں سے بھی اسی طرح شیاطین قرار دئے ہیں جس طرح کہ جنوں میں سے قرار دئے ہیں اور حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ جب آپ ایک ترکی گھوڑے پر سوار ہوئے، وہ لگا اٹکھیلیاں کرنے، آپ نے اسے مارنا شروع کیا پر اس کی اٹکھیلیاں اور بڑھتی ہی گئیں، تب آپ اس پر سے اتر آئے اور فرمانے لگے کہ تم نے تو مجھے شیطان ہی پر سوار کر دیا، میں اس سے اس وقت تک نہیں اترا جب تک میں نے اپنے آپ میں تبدیلی محسوس نہ کی" [۳]

سیبویہ نے جو لغتِ عربیت کے امام ہیں الکتاب میں کبھی اس کے نون کو زائد لکھا ہے اور کبھی اصلی [۴]، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اشتقاق

---

[۱] الدر المنثور، ج ۵، ص ۱۲۶ (طبع مصر)
[۲] تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۳۸۶ (طبع مصر)
[۳] تفسیر ابن جریر، ج ۱، ص ۳۶، ۳۷ (طبع مصر)
[۴] تاج العروس فصل الشین من باب الطاء

میں اختلاف ہے بصریوں کے نزدیک اس کا وزن فَیْعَالٌ ہے لہٰذا اس کا نون اصلی ہے اور شَطَنَ سے مشتق ہے جس کے معنی دور ہونے کے ہیں اور اسم فاعل شَاطِنٌ ہے اور کوفیوں کے نزدیک اس کا وزن فَعْلَانٌ ہے اور نون زائد ہے اور شَاطَ یَشِیْطُ سے مشتق ہے جس کے معنی ہلاک ہونے کے آتے ہیں اس کی مؤنث شَیْطَانَۃٌ ہے اور شَیْطَانٌ کی جمع شَیَاطِیْنُ ہے جس طرح کہ غَرْثَانٌ کی جمع غَرَاثِیْنُ۔ فرّاء نے یہی مثال بیان کی ہے، علامہ ابوحیان نے کہا ہے کہ غَرْثَانٌ کی طرح ہے یہ اسی صورت میں ہوگا جب کہ اس کا نون زائد ہو[1]، امام ابوجعفر طبری فرماتے ہیں کہ:-

"ہر شے کو جو سرکش ہو، شیطان سے اس لئے موسوم کیا گیا کہ اس کے اخلاق اور افعال اپنے تمام ہم جنسوں کے اخلاق اور افعال سے جدا ہوتے ہیں اور وہ خیر سے بعید ہوتا ہے اس معنی کے اعتبار سے شَیْطَانٌ شَیْطَنَ سے بروزن فَیْعَالٌ ہے[2]"

اور جن لوگوں کے نزدیک کہ شیطان بروزن فعلان ہے اور اس کا اشتقاق شاط سے ہے چونکہ شیط کا استعمال جلنے، ہلاک ہونے، جانے، باطل ہونے، غرض کئی معنوں میں ہوتا ہے اور سرکش و متمرد میں یہ ساری صفتیں یکجائی موجود ہیں، وہ دنیا میں غصہ اور حسد سے جیا مرتا ہے اور آخرت میں دوزخ میں جلے گا اور ہلاک ہوگا، خود غلط راہ پر جاتا اور اوروں کو لیجاتا ہے، باطل پر ہے یعنی غلط کار ہوتا ہے اس لئے کسی نے کسی معنی کے اعتبار سے اس کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے اور کسی نے کسی معنی کے لحاظ سے بہرحال اتنا یاد رہے کہ جلنے کے معنی تو حقیقی ہیں اور اور معنی مجازی۔[3]

عرف میں شیطان سے مراد ابلیس علیہ اللعنۃ ہے اور جب الشیطان الف لام کے ساتھ کہا جائیگا یہی مراد ہوگا جس طرح کہ ابلیس اس کا نام اس لئے ہوا کہ اِبْلَاسٌ کے معنی ناامید ہونے کے ہیں، اور وہ رحمتِ حق سے ناامید ہے اسی طرح شَطَنٌ کے معنی دور ہونے کے ہیں اور شیطان نیکی سے دور ہے[4] اور شَاطَ یَشِیْطُ کا استعمال غصہ میں جلنے بھننے کے لئے ہوتا ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے

[1] پوری بحث کے لئے ملاحظہ ہو البحر المحیط، ج۱، ص ۶۲ (طبع مصر) [2] تفسیر ابن جریر ج۱، ص ۳۷ [3] ملاحظہ ہو تاج العروس فصل الشین من باب الطاء، [4] ابن خالویہ لغوی نے یہی وجہ لکھی ہے ملاحظہ ہو: اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم، ص ۲۷

چنانچہ آیہ شریفہ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (اور بنایا جن کو آگ کی لپٹ سے) اس پر دلالت کرتی ہے اور اسی بنا پر وہ فرطِ قوتِ غضبیہ اور حمیتِ مذمومہ سے مخصوص ہوا اور حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے باز رہا (ملاحظہ ہو اِبْلِیْس)

۱/۳۴ ۲/۵،۹ ۳/۵،۶،۱۲ ۴/۷،۹ ۵/۳،۶،۷،۸،۱۵
۷/۲،۱۱،۱۴ ۸/۴،۹،۱۰ ۹/۱۲،۱۴،۱۶ ۱۰/۱۰ ۱۲/۱۱،۱۴ ۱۳/۱۵،۱۶
۱۴/۲،۱۴،۱۹ ۱۵/۳،۶،۷،۲۱ ۱۶/۶ ۱۷/۹،۱۴ ۱۸/۹
۱۹/۱،۱۷ ۲۰/۱۵،۱۶ ۲۱/۱۲ ۲۲/۱۳ ۲۳/۳،۵،۱۳ ۲۴/۱۹
۲۵/۱۲ ۲۶/۷ ۲۸/۲،۳،۵ ۳۰/۶

شَیْطَانًا، ۵/۱۵ ۲۵/۱۰

شِیَعِ : فرقے، گروہ، شِیْعَۃٌ کی جمع، ۱۴/۱

شِیَعًا ۷/۱۴ ۸/۷ ۲۰/۴ ۲۱/۷

شِیْعَتِہٖ : اس کے رفیق، اس کا گروہ، شِیْعَۃٌ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۲۰/۵ ۲۳/۷

شِیْعَۃٍ : فرقہ، گروہ، اصل میں شِیَاعٌ کے معنی انتشار اور تقویت کے ہیں جن سے انسان کو تقویت ہو اور جو اس سے نکلا اور پھیلے ہوں وہ اس انسان کے "شیعہ" یعنی اس کا فرقہ اور پارٹی ہیں، شیعہ کا اطلاق واحد، تثنیہ، جمع، مذکر، مؤنث، سب پر ہوتا ہے، شِیَعٌ اور اَشْیَاعٌ جمع، ۱۶/۸

شِئْنَا : ہم نے چاہا، مَشِیْئَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم (ملاحظہ ہو شَآءَ) ۹/۱۲ ۱۵/۱۰ ۱۹/۳ ۲۱/۱۵ ۲۹/۲۲

شُیُوْخًا : بوڑھے، شَیْخٌ کی جمع (ملاحظہ ہو شَیْخٌ) ۲۴/۱۲

شِیَۃَ : داغ، جانور جس رنگ کا ہو اس کے علاوہ دوسرے رنگ کا دھبہ، شِیَۃٌ اصل میں وشیۃٌ تھا، وَشَیٰ یَشِیْ کا مصدر ہے عِدَۃٌ اور زِنَۃٌ کی طرح، اس کی ہاء، واو محذوف کے عوض میں ہے، شِیَاتٌ جمع ہے، ۱/۸

لہ راغب کا یہی بیان ہے۔